Dastaan-E-DiL Online Digest

مبارک ہو

داستان دل ڈائجسٹ اپریل سے کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے

داستان دل تمام فری شائع کی جاتی ہیں کسی بھی شخص سے داستان دل کے حوالے سے لین دین مت کریں

داستان دل اپریل سے کتابی شکل میں آرہا ہے جس کے لیے آپ اپنے افسانے ناول کہانیاں ،شاعری اوردیگر تحریریں اس پتہ پر ارسال کردیں

ایڈریس:ندیم عباس ڈھکو چک نمبر 79/5-ایل ساہیوال

ای میل : abbasnadeem283@gmail.com

واٹس اپ:03225494228

فروری 2017 شمارہ نمبر 11

ماہنامہ داستان دل ڈائجسٹ فروری کے شمارے کی جھلکیاں

چلو آؤ دنیا کی سیر کریں

سلسلے وار ناول

افسانے

مختصر افسانوں کے رائٹر

مبارک ہو مبارک ہو مبارک ہو

داستان دل اپریل سے کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے

اب آپ داستان دل اپنے گھر، ہوسٹل، آفس، کالج کے ساتھ ساتھ دنیا کے کسی بھی کونے میں حاصل کر سکتے ہیں، تو ابھی اپنا نام ممبر شپ میں فائنل کروائیں

معلومات ممبر شپ:

سالانہ بمعہ ڈاک خرچ	:	1200/-
چھ ماہ بمعہ ڈاک خرچ	:	600/-
تین ماہ	:	300/-

(ممبر شپ 03225494228 اس نمبر پر موبی کیش اکاونٹ میں جمع کروا کہ اپنا ایڈریس اسی نمبر پر واٹس اپ یا مسیج میں سینڈ کریں)

مزید معلومات کے لیے: 03225494228 واٹس اپ / موبائل نمبر

چلو دنیا کی سیر کریں

آبروِ نبیلہ اقبال

اس بار آپ تمام قارئین کے لیے شہر پشاور کی سیر کو منتخب کیا گیا ہے اُمید ہے آپ پشاور کے تاریخی و خوبصورت مقامات کے بارے میں جان کر دلی خوشی محسوس کریں گے ، اور اس سیر سے لطف ہوں گے ۔

Khyber Pass
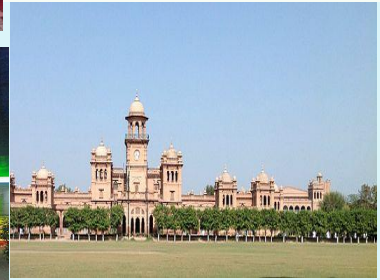
خیبر پختونخوا :

خیبر پختونخوا پاکستان کا ایک صوبہ ہے جو ملک کے شمالی حصے میں واقع ہے۔پاکستان کے دیگر شمالی علاقہ جات کی طرح قدرت نے خیبر پختونخوا کے شمالی اور مشرقی حصے میں خوبصورت نظارے پیدا کئے ہیں۔خیبر پختونخوا کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے یعنی شمالی پختونخوا اور جنوبی پختونخوا۔ خیبر پختونخوا کا شمالی حصہ خوبصورت سرسبز وادیوں اور قدرتی خطوں پر مشتمل ہے جہاں لوگ سیر و تفریح کیلئے بڑی تعداد میں آتے ہیں، خیبر پختونخوا کے شمالی حصے میں مالاکنڈ ڈویژن اور ہزارہ ڈویژن کے اضلاع شمال ہیں۔خیبر پختونخوا کا جنوبی حصہ زیادہ تر شہروں پر مشتمل ہے جہاں تاریخی عمارتیں بھی پائی جاتی ہیں جنوبی خیبر پختونخوا میں پشاور ڈویژن،ڈیرہ اسماعیل خان ڈویژن،کوہاٹ ڈویژن،وغیرہ شامل ہیں۔

خیبر پختونخوا میں بے شمار خوبصورت صحت افزا مقامات موجود ہیں جو نہ صرف ملک کے اندر سے بلکہ بیرونی ملک سیاحوں کے توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔پختونخوا میں بہت سے تاریخی عمارتیں،آثار قدیمہ،پہاڑ،کھیلوں کے میدانیں،جھیلیں،ندیاں،تعلیمی مراکز،عجائب گھر،سرسبز و شاداب وادیاں،وغیرہ موجود ہیں اور سیاحت کے لئے مقامی حکومتوں کے مختلف مراکز بھی موجود ہیں۔

ماضی میں پشاور کے گرد دیوار بنی ہوئی تھی جس کے اب آثار ہی باقی بچ گئے ہیں۔ زیادہ تر گھر کچی اینٹوں سے بنے ہیں اور اس میں لکڑی استعمال ہوئی ہے تاکہ زلزلے کے اثرات کو کم کیا جا سکے۔ شہر کی پرانی عمارات سیٹھی محلہ، مسجد مہابت خان، کوٹلہ محسن خان، چوک یادگار اور قصہ خوانی بازار وغیرہ میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ مسلسل تعمیر و ترقی کی وجہ سے پرانی عمارات کے تحفظ کی فوری ضرورت ہے۔ پشاور کے گرد دیوار میں آٹھ دروازے تھے جہاں سے مختلف علاقوں کو راستے جاتے تھے مثلاً ہشتنگری دروازہ، یہاں سے ہشتنگر (چارسدہ) کو سڑک جاتی تھی، لاھوری دروازہ ، یہاں سے لاہور کو سڑک جاتی تھی۔ ان دروازوں کے آثار زمانے کی بے رحمی سے مٹ گئے تھے لیکن صوبائی حکومت نے ان کو از سر نو علامتی طور پر بنا دیا ہے۔

صدر مقام :

(پشتو: پیښور)پاکستان کا ایک قدیم شہر اور صوبہ خیبر پختونخواہ کا صدر مقام ہے۔ وفاق کے زیرِ انتظام قبائلی علاقوں کا انتظامی مرکز بھی یہیں ہے۔ بڑی وادی میں بنا یہ شہر درہ خیبر کے مشرقی سرے پر واقع ہے۔ پاکستان اور افغانستان کی سرحد اس کے پاس ہی ہے۔ وسط ایشیاء اور جنوبی ایشیاء کی اہم گذرگاہوں پر واقع یہ شہر علاقے کے بڑے شہروں میں سے ایک اور ثقافتی لحاظ سے متنوع ہے۔ پشاور میں آب پاشی کے لئے دریائے کابل اور دریائے کنہار سے نکلنے والی نہریں گذرتی ہیں۔

ثقافتی مرکز :

پشاور کو صوبہ خیبر پختونخوا کے ثقافتی مرکز کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کی ثقافت طویل عرصے تک گندھارا ثقافت، پختون ثقافت اور ہندکو ثقافت سے متاثر ہوتی آئی ہے۔ پشاور جس صوبے میں

ہے، اس کی اکثریت آبادی پختون ہے جبکہ پشاور میں 1980 کی دہائی کے اوائل تک آبادی کی اکثریت ہندکو تھی جو یہاں کے مقامی ہیں۔ پختون اور ہندکو ثقافتوں میں کافی چیزیں مماثل ہیں اور جغرافیائی اعتبار سے کچھ اختلافات بھی ہیں۔ ہندکو افراد زیادہ تر شہری جبکہ پختون افراد کی اکثریت دیہاتی پس منظر رکھتی ہے۔ اسی طرح شادی بیاہ اور رہن سہن میں بھی واضح فرق دیکھا جا سکتا ہے۔

افغان جنگ کی وجہ سے افغان مہاجرین پاکستان پہنچے اور پشاور میں افغان موسیقار اور فنکار بھی آن بسے۔ اس کے علاوہ پشتو موسیقی اور سینما، دری موسیقی جو تاجک افراد کی پسند ہے اور فارسی میں کتب کی اشاعت بھی پشاور میں اب جڑ پکڑ چکی ہیں۔

دارلحکومت :

پشاور پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخواہ کا دارالحکومت ہے اور یہ پختون قبائل کا دنیا کا دوسرا سب سے زیادہ آبادی والا شہر ہے جو پاکستان میں فنون اور ثقافت کا مرکز بن چکی ہے- پشاور ایک قدیم شہر ہے جس کی تاریخ مغلیہ دور اور بعض مقامات اسے بھی زیادہ پرانی ہے۔ اگر آپ کبھی پشاور جا ئیں تو یہاں آپ کو قدیم دور کی متعدد سڑکیں، عمارات اور بازار دکھائی دیں گے جن میں کئی سال گزرنے کے باوجود بہت معمولی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ پشاور کی سیر کو جانے والوں کو یہاں کے چند مقامات کی سیر ضرور کرنی چاہیے تب ہی ان کا یہ سفر
یادگار بنے گا۔

جن میں قصہ خوانی بازار ، پشاور میوزیم ، محبت خان مسجد ، بالا حصار فورٹ ، سیٹھی ہاوسز ، ہائیکنگ اور پہاڑی سلسلے ، آرمی سٹیڈیم سرِ فہرست ہیں۔

لفظ پشاور ذہن میں آتے ہی لبوں پہ بے ساختہ اس گیت کے بول محوِ رقص ہوجاتے ہیں ۔

پشاور سے میرے لیے دنداسہ لانا

او میری گُل جاناں

پشاور سے میرے لیے دنداسہ لانا

او میری گُل جاناں

جب میں بار بار یہ لائن گنگنا رہی تھی (کیونکہ اس سے آگے مجھے خود بھی نہیں آتا ۔۔۔ ہاہاہا)

تو بھائی نے کہا کہ

صرف دنداسہ کیوں آپ نسوار بھی منگوانا

او میری بہن جاناں ... ھاھاھا

تم نسوار کو خود بھی چکھنا اور ہمارے لیے بھی لانا

او میری بہن جانا...

سب نے بھائی کے بنُے ہوئے الفاظ سُن کہ اور میری چہرے کے بگڑتے زاویے دیکھ کہ ہنسنا شروع کر دیا۔

قارئین یہاں میں ایک اہم بات بتاتی چلوں کہ اسلام آباد سے پشاور جاتے ہوئے بہت خوبصورت و تاریخی مقامات سے گزر ہوتا ہے جن میں ترنول ، ٹیکسلا ، حسن ابدال ، اٹک ، نوشہرہ ، اور چارسدہ سرِ فہرست ہیں۔ ان مقامات کے بارے میں دانستہ طور پہ میں نے تذکرہ نہیں کیا کیونکہ ان مقامات کو بیان کرتے کرتے ہوئے یقیناً میں مکمل طور پہ کھو جاؤں گی کچھ ایسے واقعات بھی ہیں جو عقیدت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور لکھتے لکھتے مہینوں لگ جائیں گے ۔

ایک اور بات بتاتی چلوں کہ پشاور دو بار جانے کا اتفاق ہوا ، ایک بار یونیورسٹی کی جانب سے مقابلے کے سلسلے میں اور دوسری بار ایک ہمسائے کی خاتون سے ملنے جو کہ بہت عرصہ راولپنڈی میں ہی مقیم رہی پھر اپنے آبائی گاؤں واپس چلیں گئیں۔ لہذا دونوں بار کے دلچسپ سیر کو یکجا کر کے یہاں بیان کر رہی ہوں۔

چلیں اب باقاعدہ طور پہ سفر شروع کرتے ہیں۔ **پشاور کی سیر**

بالا حصار فورٹ :

چند مخصوص مقام کی جانب سے پشاور پہنچنے پر جو سب سے پہلی اہم اور تاریخی چیز آپ کو دکھائی دیا وہ ہے بالاحصار فورٹ۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اس دیوقامت اور وسیع و عریض قلعے کے

سائے کے نیچے سے گزرتے ہوئے اس سے متاثر ہوئے
بغیر رہ سکیں یہ ایک انتہائی خوبصورت اور دلکش
تاریخی قلعہ ہے۔
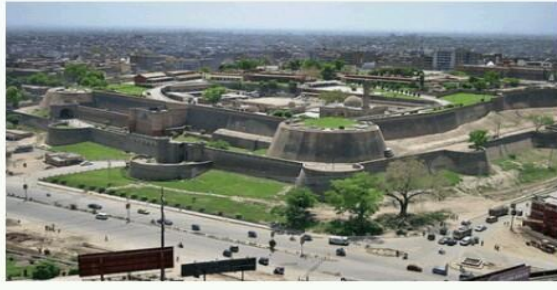
Bala Hisar Fort

اسلام آباد سے پشاور کا سفر ڈھائی سے تین گھنٹے کا ہے۔ شہر میں داخل ہوتے ہی قلعہ بالا حصار نظر آیا ، میں نے جلدی سے اپنے بیگ سے موبائل نکالا تاکہ اس مقام کی تصویر بنا سکوں لیکن مجھے بتایا گیا کہ یہاں گاڑی روکنا سکیورٹی اہلکاروں کو ناپسند ہوسکتا ہے۔ لہذا تصویر بنانے کی خواہش آگے بہت سے مقامات پہ پوری کی جا سکتی ہے ۔

قلعہ عام شہریوں کے لیے علاقہء ممنوع ہے اور دوسری تمام اہم عمارتوں کی طرح اس کی سکیورٹی بھی انتہائی سخت تھی۔ ایک دفعہ جب چیک پوائنٹ پار کر جائیں، تو کینٹونمنٹ کے علاقے میں داخل ہوتے ہیں، اور کینٹونمنٹ علاقوں کی خوبصورتی ملک بھر میں ایک جیسی ہی ہوتی ہے۔

جب پہلی بار پشاور جانے کا اتفاق ہوا تو اُس وقت میں پشاور اور پشاور کی تاریخ و ثقافت کے بارے میں زیادہ علم نہیں رکھتی تھی ۔ یونیورسٹی ہی کے دور میں مجھے ایک بزنس پلان اور بزنس کوئز مقابلے کے سلسلے میں پشاور جانا پڑا۔

سفر بلاشبہ بہت شاندار گزرا ۔ راستے میں ہم سب طلباء و طالبات اپنے مقابلے سے متعلق اپنے محترم استاد سر ہمائیوں شجاع سے رہنمائی بھی حاصل کرتے رہے۔ اور سر کی پشاور سے متعلق معلومات اور باتوں سے لطف اندوز بھی ہوتے رہے۔ اور موسیقی سے بھی لطف اندوز ہوتے رہے جو کہ علاقے کی مناسبت سے منتخب کی گئی تھی ۔

میں اپنے پچھلے سفر ناموں میں بھی یہ بات بتا چکی ہوں کہ مجھے موسیقی سے کوئی خاص شغف نہیں ، لیکن کچھ گانوں کے بول (lyrics) اتنے خوبصورت اور پُر اثر ہوتے ہیں کہ بے ساختہ پسندیدگی کی سَند دے دی جاتی ہے اور شاید اسی لیے علاقائی موسیقی کے حسن و کشش کا تو جواب ہی نہیں۔ اور یہ گانا تو تقریباً سب کا ہی شاید مَن پسند ہے۔

دا ستَرکِي جادوگَرِي دی, دا مینا لِوانیِ دا

دا ستَرکِيِ جادوګَرِيِ دی, دا مینا لِوانيِ دا

جانان جانان

جانان چیی پاکیی اوسئِ څومره ښکُلی دنیا کِيئ دا

جانان چیی پاکیی اوسئِ څومره ښکُلی دنیا کِيئ دا

جانان جانان جانان جانان

جانان جانان جانان جانان

شام ڈھلے ہم سب FAST یونیورسٹی پشاور پہنچے ، یونیورسٹی میں مقابلہ کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں۔تقریباً رات ۲ بجے تک ہم سب لڑکیاں اپنے گروپ کے حساب سے پریزینٹیشن ، پراجیکٹ کی وڈیو تیار کرنے میں مصروف رہیں۔ لڑکوں کا حال بھی ہم سے کچھ مختلف نہیں تھا وہ بھی اپنے ہاسٹل میں ۲:۳۰ بجے تک مقابلے کی تیاری میں مصروف رہے ۔

یونیورسٹی FAST میں ان دنوں ثقافتی پروگرامز بھی مرتب کیے گئے تھے ۔ جس میں وہاں کے طلباء نے علاقائی گیتوں کے علاوہ علاقائی رقص بھی کیا۔

ایک بار پھر ''جانان'' یہاں بھی سننے کو ملا ۔ پھر ایک اور گانا سننے کو ملا

بی بی شیریں نی جان میری کروں نظرانہ

تیرے سر کی قسم ہے دل یہ میرا تیرا دیوانہ

تھوڑی دیر ہم نے واپس اپنا کام شروع کر دیا ۔ سر نے کال کر کے گروپ لیڈر سےتیاری کی تفصیلات جاننا چاہیں تو ساتھ ہی پوچھا کہ اگر کھانے پینے کے لیے کچھ بھی چاہیے ہو تو بِلا تردد بتائیں اور یہ کہ سر اور لڑکے یونیورسٹی ایریا کا فنکشن اٹینڈ کر رہے ہیں اور قلفا فالودہ کھا رہے ہیں۔ اور ہم سب نے بھی فرمائش کر ڈالی ۔ رات کے ایک بجے ہمارے کمرے میں دو ایوینٹ آرگنائزر قلفا فالودہ لے کر آئیں جس سے ہم سب لطف اندوز ہوئے۔ پھر کام کو جلد سمیٹ کر سب سونے کی تیاری کرنے لگیں ۔

اگلے دن پشاور کی خوبصورت صبح دیکھی۔ میں نمازِ فجر پڑھنے کے بعد یونیورسٹی کے سرسبز و شاداب خوبصورت پھولوں سے مزین لان کا نظارہ کرنے لگی ۔ کیفیٹریا کے لوگ اپنے کام کاج میں لگ گئے۔

اس شاندار اور سرسبز کیمپس میں چہل قدمی کرنا ایک خوشگوار تجربہ تھا؛ ہاسٹلوں سے لے کر آڈیٹرویم تک، اور باغیچوں سے لے کر عالیشان محرابوں تک۔ ہر چیز صاف ستھری اور فرحت بخش معلوم ہو رہی تھی۔

آرگنائزر طلباء و طالبات یک رنگ و ڈیزائن شرٹس پہنے کام میں مصروف ادھر ادھر تیز تیز کام کرتے نظر آ رہے تھے۔

Fast یونیورسٹی کا شمار بھی میری پسندیدہ یونیورسٹیوں میں ہے ۔

یہاں میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ

اگلی بار جب پشاور جانا ہوا تو آنٹی کی بیٹی مجھے

اسلامیہ کالج لے گئی اور سچ پوچھیں تو میں تعریف

کرنے سے قاصر ہوں ۔ انتہائی خوبصورت

کالج کے احاطے میں ایک سفید رنگ کی مسجد ہے؛ اتنی خوبصورت اور پرسکون، کہ بیان سے باہر ہے۔ میرا جی چاہا کہ میں یہی رُک جاؤں میں نے نمازِ ظہر ادا کی جہاں لڑکیوں کی نماز کے لیے جگہ مختص کی گئی تھی ۔ مرکزی باغ میں بھی گئے اور مجھے بتایا گیا کہ جو عمارت میں دیکھ رہی ہوں، یہ وہی ہے جو پاکستان کے ایک ہزار روپے کے نوٹ پر ہے۔ اس کا شاندار طرزِ تعمیر توجہ سے دیکھے جانے کا تقاضہ کرتا ہے۔
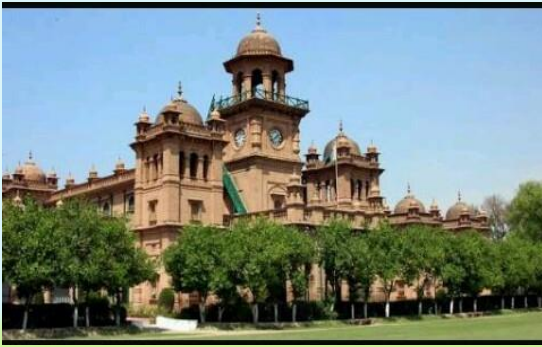
اسلامیہ کالج کی تصویر ایک ہزار روپے کے نوٹ پر بھی موجود ہے۔ کالج کی خوبصورتی کو چار چاند لگانے کےلیے کیمپس میں کئی چھوٹی نہریں موجود ہیں جہاں لوگ بیٹھتے ہیں ۔

چلیں باقی احوال سناتی ہوں

کچھ دیر بعد ساتھی طالبات بھی جاگ گئیں اور تیاری

میں مصروف ہو گئیں ناشتے کا مجھ سمیت کسی کو ہوش نہیں تھا ، اپنے اپنے گروپ کے حساب سے ایک دوسرے کو پرزینٹیشن دے کر دکھا رہے تھے کہ ناشتہ آگیا ۔ واہ واہ لذیز پراٹھے ، آملیٹ --- اوہ--- لیکن یہ کیا چائے شاپر میں--- وہ بھی گرم گرم --- اب ان کو پیالیوں میں کیسے اُنڈیلا جائے ---

چائے پیالیوں میں ڈالنا مقابلے سے زیادہ مشکل مرحلہ لگا ۔ ایک دم مجھے خیال آیا کہ کیوں نا چائے کو پانی کی بوتل میں ڈالا جائے پھر آسانی ہو جائے گی ۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ بوتل میں چائے ڈالی کیسے جائے پھر میرے ذہن میں آیا کہ دہی کے پیکٹ کا طریقہ اپنایا جائے اور ہم کافی حد تک کامیاب بھی رہے۔

مقابلہ شروع ہوا اور ساتھ ہی ایک نیا محاذ بھی--- کہ باقی ٹیم کی پرزینٹیشن کے وقت میں تو وقفہ تھا میرے دونوں مقابلوں کا وقت ایک ہی تھا ۔ اُف پہلے بزنس کوئز مقابلہ ہوا ہر راؤنڈ میں میں یا ساتھی بھاگ کے آڈیٹوریم کا چکر لگا آتے کہ کہیں اناؤنسمنٹ گُزر نہ جائے ۔ خیر اللہ کر کے کوئز مقابلہ شروع ہوا چار مختلف سیگمنٹ تھے ، میری ٹیم اور میری بہترین سہیلی انعم جاوید کی ٹیم نے بہترین کارکردگی دکھائی تقریباً ہر سوال درست ، خوشی استادِ محترم ہمایوں شجاع کے چہرے سے عیاں تھی جس کا اُنہوں نے اظہار بھی کیا ۔ جیسے ہی آڈیٹوریم پہنچے ٹھیک اُسی لمحے میرے نام کی اناؤنسمنٹ ہوئی ۔ نا دَم لیا نا دو گھونٹ پانی پیا فوراً سٹیج پہ اپنی ٹیم کے ہمراہ پہنچ کہ کارکردگی دکھائی۔ پھر جب تک رزلٹ کا اعلان ہونا تھا ہم نے تصاویر بنانا شروع کی اکیلے میں ، اپنی ٹیم کے ساتھ ، پھر سب یونیورسٹی اسٹوڈنٹس کے ساتھ ۔ پھر میں نے لنچ کھایا کیونکہ صرف میں ہی رہ گئی تھی اور دورانِ پڑھائی یا کسی بھی کام کے اردگرد سے بیگانہ ہو جاتی ہوں لہذا یونیورسٹی کے خوبصورت لان میں بیٹھ کہ کھانا کھایا۔ نتائج کا اعلان شروع ہوا گو کہ ہماری یونیورسٹی کی دونوں ٹیمز یعنی میری اور انعم کی ٹیم نے شاندار کارکردگی دکھائی اور اُمید واثق بھی تھی کہ کامیابی ہمارا مقدر ہو گی لیکن ججز کے فیصلہ کا انتظار بھی لازم تھا اور عنقریب ہال تالیوں سے گونج اُٹھا کیونکہ نا صرف بزنس پلان میری میں ہماری پہلی پوزیشن آئی تھی بلکہ کوئز مقابلے میں بھی ہماری پہلی، دوسری دو پوزیشنز آئیں ۔ سرٹیفیکیٹس ، ٹرافی ، نقد رقم بھی انعام کے طور پہ ملی۔ سب بہت زیادہ خوش تھے۔

میں یہ بھی بتاتی چلوں کہ کوئز مقابلے میں ہم نے نام سب سے آخر میں کروایا تھا اور بغیر تیاری کے حصہ لیا تھا لیکن اللہ پاک کا احسان، ماں باپ کی دعائیں ، اساتذہ کا دیا اعتماد اور ہماری محنت سب کی بدولت کامیابی و خوشی ہمارا مقدر بنی۔

یہ بھی بتاتی چلوں میری بہترین تعلیمی کارکردگی اور پشاور کے کوئز مقابلے میں پہلی پوزیشن لینے پہ سر ہمایوں شجاع نے بعد میں مجھے فیصل آباد ''پاکستان کوئز ''بھی بھیجا تھا اور سیمی فائنل تک میں نے اور ٹیم ممبر نے اچھی پرفامنس بھی دکھائی لیکن فائنل راؤنڈ میں مجھ سے تمام سوالات فلم سے متعلق پوچھے گئے اور اس مرحلے میں ٹیم ممبر سے مشاورت کی اجازت بھی نہیں تھی اس لیے فائنل میں ہم رہ گئے۔ کیونکہ فلمی دنیا کے بارے میں میری معلومات خاصی کمزور ہیں۔

چلیں قارئین آپ کو پشاور کی مزید تھوڑی سیر کروائی جائے۔

قصہ خوانی بازار اور قہوہ :

قصہ خوانی بازار کو ‘‘ قصہ گو کی اسٹریٹ ‘‘ بھی کہا جاتا ہے اور یہ ایک قدیم بازار ہے جس کی تاریخ 1 ہزار سال پرانی ہے۔ اس بازار میں ایسے قصہ گو افراد پائے جاتے تھے جو بازار میں آنے والے فوجیوں اور سیاحوں کو محبت اور جنگ دلچسپ کہانیاں سنایا کرتے تھے۔ اس بازار کی دوسری مشہور چیز سبز چائے ہے جس سے آپ یہاں موجود ہوٹلوں پر بیٹھ کر لطف اندوز ہوسکتے ہیں اور اسے قہوہ کہا جاتا ہے۔
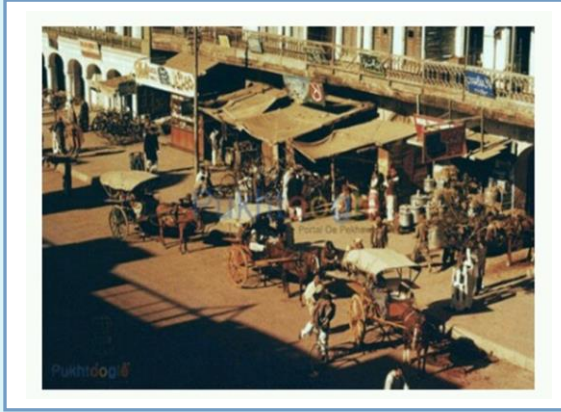
قصہ خوانی بازار(پشتو: کيسه خوانۍ بازار)پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخوا میں پشاور کا ایک مشہور تاریخی بازار ہے۔ قصہ خوانی بازار تاریخی لحاظ سے ادبی اور سیاسی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس بازار کا نام دراصل یہاں کے روایتی قہوہ خانوں، تکہ کباب، چپلی کباب، اور خشک میوہ جات کی دکانوں کے ساتھ جڑی اس تجارت سے منسوب ہے جہاں پہلے پہل دور دراز سے آئے تاجر یہاں کے مہمان خانوں میں قیام کرتے اور اپنے اپنے ملکوں کے حالات قصہ کی شکل میں بیان کرتے۔ یہاں کے قصہ گو پورے علاقہ میں مشہور تھے۔ یہاں تاجروں کے علاوہ قافلوں کا بھی پڑاؤ ہوتا اور فوجی مہمات کا آغاز اور پھر اختتام جو تفصیلاً ہر مہم کے احوال کے ساتھ یہیں ہوا کرتا تھا۔یہاں کے پیشہ ور قصہ گو بہت مشہور تھے اور یہ تاجروں، مسافروں اور فوجیوں سے سنے قصوں کو نہایت خوبی سے بیاں کیا کرتے تھے۔ ایک وقت میں اس بازار کو غیر تحریر شدہ تاریخ کا مرکز کہا جاتا تھا۔ خیبر پختونخوا کے گزٹیر کے سیاح لوئل تھامساور پشاور کے برطانوی کمشنر ہربرٹ ایڈورڈز نے اپنی تصانیف میں اس بازار کو وسط ایشیا کا پکاڈلی قرار دیا ہے۔

گو اب قصہ گوئی کا رواج دم توڑ چکا ہے مگر اس بازار کا روایتی ماحول پہلے جیسا ہی ہے۔ یہاں قبائلی تاجر قہوہ پیتے ہوئے مقامی تاجروں سے گھنٹوں لین دین پر بحث کرتے دکھائی دیتے ہیں اور یہاں اب بھی صوبہ کے دور دراز حصوں سے تاجر اور عام لوگ اس بازار میں سیاحت اور خریداری کے لیے آتے ہیں۔ مختلف قبائلی اپنے روایتی لباس میں یہاں چہل قدمی کرتے ہوئے ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں جو اس بازار کے قدیم دور کی یاد دلاتے ہیں۔

یہاں پر بانس، مٹھائیوں، فالودہ اور کانسیکے برتنوں کا بڑے پیمانے پر کاروبار کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں اردو، پشتو اورفارسی کتب کی چھپائی کا کام بھی کیا جاتا ہے۔

قصہ خوانی بازار کو دیکھ کر اس کے بارے میں جان کر بہت اچھا لگا گزرتے ہوئے ایک پٹھان بھائی پہ نظر پڑی جو کہ دنداسہ بیچ رہا تھا اور میرے ذہن میں فوراً سے پھر وہی گانا آ گیا اور ساتھ میں بھائی کے بول بھی --- ھاھاھا

پشاور سے میرے لیے دنداسہ لانا

او میرے گُل جانا ---

پشاور میوزیم :

پشاور میوزیم برطانوی سامراج کے دور میں 1905 میں تعمیر کیا گیا تھا اور اسے وکٹوریہ میموریل ہال بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دو منزلہ عمارت بیک وقت برطانوی ، ہندو، جنوبی ایشیائی، بدھ مت اور اسلامی طرزِ تعمیر کا نمونہ ہے۔ یہ میوزیم گندھارا آرٹ کے مجموعے کے لیے مشہور ہے۔ اس وقت یہاں 14 ہزار تاریخی اشیاء رکھی گئی

ہیں جن کا تعلق متعدد تہذیبوں سے ہے۔ ان اشیاء میں سکے، گھریلو اشیاء، مجسمے، دستکاری اور کئی اور اشیاء شامل ہیں۔

محبت خان مسجد :

پشاور کی محبت خان مسجد کی تاریخ شاہجہان اور اورنگزیب کے مغلیہ دور سے جا ملتی ہے۔ یہ مسجد اس وقت کے گورنر محبت خان نے تعمیر کروائی تھی۔ یہ مسجد مغلیہ طرز تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے اور صحیح معنوں میں لوگوں کو متاثر کرتی ہے۔
اس مسجد کی چھت سے ایک کھلے اور وسیع و عریض صحن کا خوبصورت نظارہ کیا جاسکتا ہے۔

Mahabat Khan Mosque

سیٹھی ہاؤسز :

سیٹھی گھر پشاور کے پرانی دیواروں والے شہر کے سیٹھی
محلہ میں واقع ہیں۔ کوئی بھی شخص جو ان گھروں کا بغور
جائزہ لے گا وہ ان گھروں کی تعمیر کے دوران استعمال
ہونے والے تاریخی آرٹ کی خوبصورتی سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اور مجھ جیسے لوگ جو ادب ، خطاطی و مصوری کی شیدائی ہوں وہ ضرور متاثر بھی ہوتے ہیں اور متجسس بھی ، تاریخ میں گزرے تمام حالات و واقعات کے بارے میں ۔ آپ تمام قارئین کو بتاتی چلوں کہ یہ گھر سیٹھی خاندان نے تعمیر کروائے تھے جن کے کاروبار ایران، افغانستان، چین اور وسطی ایشیاء میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان خوبصورت گھروں کی خاصیت ان کے لکڑی کے دروازوں کی تراش خراش، کمروں کی رنگین دیواریں، مختلف حصے، بالکونیاں اور آئینے ہیں۔

ہائیکنگ اور پہاڑی سلسلے:

یہاں متعدد ہائیکنگ روٹ تلاش کیے جا سکتے ہیں جو کہ پشاور کے آغاز سے ہی شروع ہوجاتے ہیں اور آپ کی زندگی ایک ایڈونچر ثابت ہوسکتے ہیں۔ یہ راستے ایڈونچر سے بھرپور ہیں لیکن ان پر پیدل چلنے والوں کے لیے بہادر ہونا ضروری ہے۔ تاہم یہ انتہائی خوبصورت راستے ہیں۔ مکمل حجاب و عبایا کے ساتھ بھی مجھے ہائکنگ کبھی مشکل نہیں لگی ۔ بلکہ میرے ہمیشہ ہر سفر پہلے سے زیادہ دلچسپ ثابت ہوتا ہے ۔ کیونکہ متغیرات زندگی کا حصہ ہیں اور صرف جمود سے گزارا ممکن نہیں ۔

سفاری سے ہندو کش :

اگر آپ زبردست ایڈونچر، سڑکوں کی سیر اور خوبصورت نظاروں کا شوق رکھتے ہیں تو پھر آپ کو پشاور سے مردان وہاں سے دیر ٹاؤن اور پھر لواری ٹنل سے گزرتے ہوئے براستہ شندور پاس گلگت بلتستان تک کا سفر کرنا چاہیے۔ اس طرح آپ دنیا کے ایک بلند ترین مقام پر جا پہنچیں گے جہاں سے آپ دنیا کے بلند ترین پہاڑوں کا خوبصورت نظارہ کرسکتے ہیں۔ عنقریب اللہ نے چاہا تو اپنی ایک شاگردہ کی بہن جو کہ اب میری سہیلی بھی ہیں اُن کی شادی کے سلسلے میں گلگت جانا ہو گا ۔

پشاور سے واپسی کا سفر :

کسی مقام سے واپسی کا سفر یقیناً ایک حد تک اداس بھی کر دیتا ہے کیونکہ شاید ہم اتنا جلد واپس نہیں آنا چاہتے خوبصورت و دلآویز مناظر کو ۔ اس بار جیت کی خوشی بہت تھی اور سیر سے مزہ بھی دوبالا ہو گیا ۔ واپسی پہ ہم نے پشاور کے ہی ایک ہوٹل میں رات کا کھانا کھایا جس میں قابلِ ذکر پشاوری چرسی تکہ / کباب ہیں ۔ جب تک آرڈر کیا تب تک میں نمازِ مغرب پڑھ کر ہم باہر لان میں لگے جُھولوں پہ بیٹھ کہ جُھولا جھولنے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد جب کھانا کھانے کے لیے ہوٹل گئے تو وہاں مرد حضرات اور خواتین کے لیے علیحدہ علیحدہ جگہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ ہم سب خوبصورت موسیقی سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے ۔ اور ہمیں لگا جیسے یہ گانا ہمارے ہی لیے لگا ہے کیونکہ ہم نے پشاور سے واپس اسلام آباد جانا تھا ۔

تجھ کو قسم ہے میری نہ آنا ہاتھ خالی

آنکھوں میں بسنے والے میرے چمن کے مالی

او لاڈشا کی خبر تا کی میستور مالا روڈو

تازہ تازہ گُلونا دے سَلور مولا روڈو

کہتا ہے پیار میرا کہتا ہے پیار میرا

تازہ گلاب لانا میرے واسطے صنم

تحفہ میری خاطر تُو لاجواب لانا

لانا سجا کے ڈالی میرے چمن کے مالی

تجھ کو قسم ہے میری نہ آنا ہاتھ خالی

آنکھوں میں بسنے والے میرے چمن کے مالی

میں نے سوچا نسوار لے کہ جانے سے بہتر ہے سب گھر والوں کے لیے چرسی کباب لے کے جاؤں۔ ہم سب نے اپنے اپنے گھر والوں کے لیے چرسی کباب کے پارسل تیار کروائے اور واپسی کے لیے گاڑی کی طرف چل پڑے۔

خدا پامان پشاور

قارئین اب آبروِ نبیلہ اقبال کو اجازت دیجیے زندگی رہی تو انشاء اللہ جلد ایک نئے سفر کے ساتھ پھر ملاقات ہو گی۔پشاور کی سیر آپ کو کیسی لگی اپنی قیمتی رائے سے ضرور آگاہ کیجیے گا۔ جزاک اللہ

مبارک ہو مبارک ہو مبارک ہو

داستان دل اپریل سے کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے

اب آپ داستان دل اپنے گھر، ہوسٹل، آفس، کالج کے ساتھ ساتھ دنیا کے کسی بھی کونے میں حاصل کر سکتے ہیں، تو ابھی اپنا نام ممبر شپ میں فائنل کروائیں

معلومات ممبر شپ:

سالانہ بمعہ ڈاک خرچ	:	1200/-
چھ ماہ بمعہ ڈاک خرچ	:	600/-
تین ماہ	:	300/-

(ممبر شپ 03225494228 اس نمبر پر موبی کیش اکاونٹ میں جمع کروا کہ اپنا ایڈریس اسی نمبر پر واٹس اپ یا مسیج میں سینڈ کریں)

مزید معلومات کے لیے: 03225494228 واٹس اپ / موبائل نمبر

وہ ایک طوفانی رات تھی۔ بارش ٹوٹ کر برس رہی تھی۔ وقفے وقفے سے کڑکتی ہوئی بجلی دلوں کو دہلا رہی تھی۔ قسمت نگر کے باسی جہاں اس بارش کو نعمت خیال کر رہے تھے وہاں کچھ ایسے غریب بھی تھے جنہیں اپنے گھروں کے بہہ جانے کا ڈر لگا ہوا تھا۔ جب بھی اندھیری رات میں بجلی چمکتی، قسمت نگر ذرا سی دیر کے لئے روشن ہو جاتا، پھر وہی تاریکی چھا جاتی، بالکل اسی طرح نسل در نسل چلتی ہوئی ان کے مقدر کی تاریکی تیسری نسل کے ہاتھ میں آچکی تھی۔

چوہدری کبیر اس طوفانی رات میں اپنی فور وہیل جیپ بھگائے چلا جا رہا تھا۔ گاؤں کی گلیوں میں بہتا پانی بھی اس کی جیپ کو نہیں روک پایا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی جیپ سلامے جٹ کے گھر کے باہر آرکی۔

سلاما جٹ اس وقت اپنی بیٹھک ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے پاس اس کا یار امین ارائیں بیٹھا بارش رُکنے کا انتظار کر رہا تھا۔ بارش کی وجہ سے وقت کچھ زیادہ ہی ہو گیا تھا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ بارش رُکے تو اپنے گھر جائے۔ تبھی اس کی بیٹھک کے سامنے چوہدریوں کی گاڑی رکی اور اس میں سے چوہدری سکندر کا منہ چڑھا اور اکلوتا نوجوان بیٹا چوہدری کبیر اُترا۔ وہ دولت اور طاقت کے نشے میں چُور تھا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی، اس نے برستی بارش کی پروا نہیں کی۔ چوہدری کبیر کے پیچھے اس کے ملازم تھے۔ انہوں نے جاتے ہی سلامے کو پکڑا اور باہر نکال کر چوہدری کبیر کے سامنے لا کھڑا کیا۔

اس نے سلامے جٹ کو سر سے پاؤں تک دیکھا، پھر انتہائی غصے میں بولا

”اوئے تجھے کہا نہیں تھا کہ تو نے زمین صرف ہمیں بیچنی ہے، کسی دوسرے کو نہیں، پھر تو نے وہ بیچی، اور وہ بھی ہمارے دشمن کو۔۔۔ کیوں؟“

”چوہدری صاحب وہ مجھے اچھے پیسے دے رہا تھا اور۔۔۔“ سلامے نے کہنا چاہا تو چوہدری کبیر اُسے ٹوکتے ہوئے بولا

”اور کیا ہم تمہیں کم دے رہے تھے۔ تجھے یہ سمجھ نہیں آئی کہ میں نے تم سے کیا کہا تھا۔ اب اس کی سزا تجھے ملے گی۔ ہمارے ہی علاقے میں کوئی ہمارے خلاف سر اٹھائے، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ تیری اس حرکت سے کوئی دوسرا بھی سر اٹھا سکتا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے بولٹ مارا تو امین ارائیں نے منت بھرے انداز میں کہا

”چوہدری جی۔! معاف کر دیں اِسے، اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ زمین یہ آپ۔۔۔“

”بکواس نہ کر اوئے، تو کون ہے میرے ساتھ بات کرنے کی ہمت کرنے والا۔۔۔ چل بھاگ یہاں سے“ چوہدری کبیر نیانتہائی غصے میں کہا، پھر سامنے کھڑے سلامے کے سینے میں کئی گولیاں اُتار دیں۔ فائرنگ کی آواز سے چند لمحوں کے لئے فضا تڑتڑا اٹھی تھی۔ انہی چند لمحوں میں سلاما خون سے لت پت زمین پر لوٹ رہا تھا۔ وہ اپنی آخری سانسوں پر تھا، جب چوہدری کبیر اپنی فور وہیل مہنگی جیپ میں بیٹھا اور یہ دیکھے بغیر کے سلاما کس قدر تڑپ رہا ہے۔ وہ وہاں سے چلا گیا۔ امین ارائیں جلدی سے آگے بڑھا۔ اس نے سلامے کو سنبھالتے ہوئے شور مچانا شروع کر دیا۔ فائرنگ کی آواز سے لوگ باہر نکل آئے تھے۔ لیکن کسی کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ سلاما اس دنیا کو چھوڑ کر جا چکا تھا۔

☆۔۔۔ژ۔۔۔ظ

قسمت نگر کا مقدر بھی کوئی نیا یا انوکھا نہیں تھا۔ وہی جاگیر دارانہ تسلط کے تحت مجبور، بے بس اور بے کس لوگ۔ جن کی زندگی خوف، ڈر اور محکومی میں بسر ہو رہی تھی۔ انسانی تذلیل کا وہی بے غیرتانہ نظام ان پر مسلط تھا۔ ایسے ماحول

میں سلامے کا قتل بھی کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ ایک طرف غریب کسانوں، مزدوروں اور مزارعوں کے کچے پکے گھروں پر مشتمل گاؤں قسمت نگر تھا۔ اس بستی سے ذراہٹ کر سفید رنگ کی پکی اور اونچی حویلی اپنے مکینوں کی طرح پر غرور دکھائی دیتی تھی۔ اس کے مکیں اِن قسمت نگر کے لوگوں کی قسمت بارے فیصلے کیا کرتے تھے۔ وہ حویلی چوہدری جلال سکندر کی پرکھوں کی حویلی تھی۔ یہ اس کے باپ نے بنائی تھی جو اب اس کے بیٹے کو منتقل ہونے والی تھی۔ پہلے اس کا باپ اِن قسمت نگر کے مکینوں کی قسمت بارے فیصلے دیتا تھا، اب وہ دے رہا تھا، کچھ عرصے بعد اس کا بیٹا چوہدری کبیر ان کے مقدر کا مالک بننے والا تھا۔ انسانی تذلیل کا یہ نظام اسی طرح چل رہا تھا کہ اس دن حویلی میں ہلچل مچ گئی۔

شاندار حویلی کے ڈرائینگ روم میں منشی فضل دین بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ وہ چوہدری جلال سکندر کی آمد کا منتظر تھا۔ اس کے چہرے پہ پریشانی تھی، جیسے کچھ انہونا ہو گیا ہو۔ تبھی چوہدری جلال سکندر اندرونی کمرے سے باہر آتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ لمبے قد کا اُدھیڑ عمر، دیہاتی انداز کا روایتی سیاست دان تھا جو کم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں، لیکن اپنے رعب و دبدبے کے باعث اپنی بات منوانا جانتے ہیں۔ بھاری سفید مونچھیں، بڑی بڑی آنکھیں، بڑے چہرے پر جلال، کورے لٹھے کے شلوار قمیص پر ویسٹ کوٹ پہنے، پاؤں میں تلّے دار کُھسہ، وہ بڑے بارعب اور درمیانی چال سے چلتا ہوا آرہا تھا۔ اس نے باہر کی طرف جاتے ہوئے رُک کر منشی کی طرف دیکھا، پھر بڑے کروفر کے ساتھ رُک کر اس سے پوچھا

"ہاں منشی، بول کیا بات ہے؟"

"وہ جی، قتل کیس کی تاریخ کل ہے۔ اور وہ گواہ امین آرائیں۔۔۔" یہ کہتے ہوئے وہ جھجکتے ہوئے خاموش ہو گیا۔

تبھی چوہدری جلال سکندر نے ماتھے پر تیوری لاتے ہوئے پوچھا

"کیا ہوا ہے اُسے؟"

”سارا مقدمہ اب اسی عینی شاہد پر ہے۔۔۔اُس نے اگر عدالت میں گواہی دے دی تو پھر نکے چوہدری کے لیے بہت مشکل ہو جائے گی۔“ منشی نے تیزی سے بتایا تو چوہدری جلال سکندر نے حیرت سے پوچھا

”اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ کیا تم لوگوں نے اس کا بندوبست نہیں کیا؟“

”گیا تھا جی میں اس کے پاس۔۔۔ مگر وہ مانتا ہی نہیں ہے، کہتا ہے گواہی ضرور دوں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ منشی فضل دین نے تشویش سے کہا تو چوہدری جلال چونک گیا۔ اسے یہ قطعاً اُمید نہیں تھی کہ کوئی اس کے معاملے میں چوں چرا اں بھی کر سکتا ہے۔ وہ بولا تو اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”اس کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا، اُسے نہیں معلوم کہ وہ کس کے خلاف گواہی دے رہا ہے؟“

”خراب ہی لگتا ہے جی اس کا دماغ۔۔ آپ اس علاقے کے حکمران ہیں۔ سدا بہار ایم این اے ہیں۔۔۔ ہر حکومت میں آپ شامل ہوتے ہیں۔۔۔ آپ کے حکم کے بغیر یہاں پتہ نہیں ہل سکتا۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی وہ نکے چوہدری کے خلاف گواہی دے گا۔ عقل خراب والی بات ہی ہے نا جی اس کی“

اس کے یوں کہنے پر چوہدری جلال سکندر نے سوچتے ہوئے ہنکارا بھرا پھر تشویش زدہ لہجے میں بولا

”ہوں۔۔۔بات یہ نہیں ہے منشی کہ وہ نکے چوہدری کے خلاف گواہی دے رہا ہے۔۔۔ بلکہ سمجھنے والا نکتہ یہ کہ اس کی جرات کیسے ہو گئی۔۔۔ ہمارے علاقے میں۔۔۔ ہمارے ہی خلاف، کسی کو کبھی بولنے کی ہمت نہیں ہوئی۔۔۔ اور اگر کسی نے یہ ہمت بھی کی تھی تب اس کی زبان ہی نہیں رہی۔ وہ کیسے؟“

”وہی تو میں سوچ رہا ہوں چوہدری صاحب۔۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چونکتے ہوئے کہا، ”کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ یہ کسی مخالف کی سازش ہو۔۔۔ الیکشن بھی تو سر پر آ گئے ہیں نا چوہدری صاحب؟“

”الیکشن۔ ! خیر کچھ بھی ہو منشی، وہ زمین پر رینگنے والا کیڑا۔۔۔ ہمارے خلاف گواہی تو ایک طرف، اگر وہ ہمارے حق

میں گواہی نہیں دیتا تو بھی وہ عدالت تک نہ پہنچ پائے۔ اسے یہ سمجھا دو،۔۔۔ اگر وہ سمجھتا ہے تو۔۔۔'' چوہدری جلال سکندر نے غصے میں کہا تو منشی عاجزی سے بولا

''میں نے ہر طرح سے کوشش کر کے دیکھ لی ہے چوہدری صاحب۔۔۔ میں اسی لیے حاضر ہوا تھا کہ آج ہی کا دن ہے ہمارے پاس۔۔۔'' یہ کہہ کر وہ ایک لمحے لئے رکا اور پھر بولا،'' ویسے اگر آپ حکم دیں تو کیا اسے نکے چوہدری کے حوالے نہ کر دوں؟ پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس کے اس طرح کہنے پر وہ اکتاتے ہوئے بولا

''اُوئے منشی۔۔۔ باتیں ہی بناتے رہو گے یا کچھ کرو گے بھی، اب یہ معاملہ ختم ہونا چاہیے۔ دو مہینے تو ہو گئے ہیں اس چخ چخ کو۔''

''اب آپ اس کی فکر نہ کریں۔ آپ بس معاملہ ختم ہی سمجھیں چوہدری صاحب۔۔۔ آپ بے فکر ہو جائیں اب ۔۔۔'' منشی خوش ہوتے ہوئے بولا تو چوہدری جلال سکندر نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا

''مزید اگر کوئی بات ہوئی تو مجھے بتانا۔'' یہ کہہ کر چوہدری باہر کی جانب چل دیا۔ اس پر منشی اس کے پیچھے لپکتا ہوا بڑھ گیا۔ چوہدری جلال سکندر تو شہر جانے کے گاڑی میں بیٹھ گیا جبکہ منشی کے دماغ میں کئی باتیں جو رات سے پک رہی تھیں، وہ لاوے کی طرح اُبلنے لگیں۔ وہ واپس ڈرائینگ روم میں آ گیا۔ اب اسے چوہدری کبیر کا انتظار تھا۔ تاکہ اسے نئی صورت حال کے بارے میں بتا کر کوئی نیا مشورہ دے سکے۔

نجانے کتنے برس ہو گئے تھے۔ منشی ان چوہدریوں کا ملازم تھا اور اس ملازمت کے دوران کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ اس کے ذمے کوئی کام لگایا جائے اور وہ ہوا نہ ہو۔ پہلی بار اسے امین آرئیں کی طرف سے ناکامی ہوئی تھی، جس نے منشی کی بات ہی نہیں سنی تھی۔ رات بھر سے وہ یہی سوچتا رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ چوہدری کبیر ابھی کچھ دیر میں بیدار ہو کر جاگنگ کرنے کے لئے ڈیرے پر جائے گا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی ان کے پالتو غنڈے

امین آرائیں کو اٹھا کر ڈیرے پر پہنچا دیں گے۔ یہی سوچتے ہوئے وہ خباثت سے مسکرا دیا۔

چوہدری کبیر ڈیرے سے ذرا دور فصلوں کے درمیان میں بنے کچے راستے پر سے جاگنگ کرتا ہوا آرہا تھا۔ اس کے پیچھے جیپ چلی آرہی تھی جس پر اس کے محافظ گنیں تانے ہوئے کھڑے تھے۔ وہ جاگنگ کرتا ہوا بڑے اطمینان سے ڈیرے میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا صحن کے درمیان میں سامنے ہی امین آرائیں کو اس کے ملازمین نے پکڑا ہوا تھا۔ تبھی اس کا خاص ملازم، ماکھے نے تولیہ اور پانی کی بوتل اس کی طرف بڑھائی۔ چوہدری کبیر نے امین ارائیں طرف دیکھتے ہوئے پانی کی بوتل پکڑی، چند گھونٹ لئے اور پوچھا

"اوئے ماکھے، کیا کہتا ہے یہ۔۔۔ امین آرائیں؟"

"اپنی ہی بات پر ڈٹا ہوا ہے۔ کہتا ہے ہمارے خلاف گواہی دے گا۔" ماکھے نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا تو چوہدری کبیر حقارت سے مسکراتا ہوا اس کے پاس گیا۔ پانی پیتے ہوئے اس کی جانب دیکھا پھر ایک دم سے باقی پانی اس کے چہرے پر پھینکتے ہوئے بولا

"کل تیری عدالت میں پیشی ہے نا۔ لیکن تو نہیں جائے گا، جا ہی نہیں سکے گا۔ کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تم جاؤ"

"چوہدری۔! تم لوگوں نے میرے یار کو قتل کیا ہے۔ میرا منہ بند کر لو گے تو خدا کو کیا جواب دو گے۔ میری آنکھوں کے سامنے تم نے قتل کیا ہے۔۔۔ میں گواہی۔۔۔" امین ارائیں نے چیختے ہوئے کہنا چاہا مگر لفظ اس کے منہ ہی میں رہ گئے۔ چوہدری کبیر نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر مارتے ہوئے کہا

"بکواس بند کرو۔ ورنہ تمہیں بھی تیرے یار کے ساتھ ہمیشہ کے لئے خاموش کر دوں گا، پھر تیری گواہی کون دے گا؟

"کوئی تو ہو گا جو تمہارے اور تیرے باپ کے ظلم روکے گا۔" اس نے زور سے کہا۔ تبھی وہ ہنستے ہوئے بولا

"دیکھا تھا نا تونے۔۔۔ کیسے مارا تھا میں نے اسے۔۔۔ اس طرح تم بھی۔۔۔ ہاں تم بھی اوپر پہنچ جاؤ گے۔۔۔ تونے بھی بڑی منتیں کی تھیں۔۔۔ کہ میں اس پر رحم کروں۔۔ انہیں چھوڑ دوں۔۔۔ پر۔۔۔ اسے سزا ملنی تھی وہ میں نے دی۔ میں چاہوں تو ابھی تیری زبان بند کر دوں۔۔۔ لیکن تجھے مارنے کا مجھے کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"چوہدری آنے والے وقت سے ڈر۔" امین ارائیں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا تو اس نے انتہائی حقارت سے کہا

"اور تو ڈر اپنی زبان درازی سے۔۔۔ اس کی تو سزا تمہیں ملے گی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے خاص ملازم کو آواز دی، "اوئے ماکھے"

"جی نکے چوہدری صاحب۔!" وہ تیزی سے اس کی جانب لپکتے ہوئے بولا تو چوہدری کبیر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا

"اسے ایک دو دن اپنے پاس رکھو۔ اسے ہی نہیں دوسروں کو بھی معلوم ہو کہ چوہدریوں کے خلاف سوچنا بھی کتنا بڑا جرم ہے۔ میں تو اپنے خلاف کسی کو سوچنے بھی نہیں دیتا"

"جی نکے چوہدری صاحب۔!" ماکھے نے سعادت مندی سے کہا تو چوہدری کبیر وہاں سے ہٹ کر اپنی جیپ کی جانب بڑھ گیا ہے۔

ماکھے نے امین کو بازو سے پکڑا اور دھکے دے کر اندر کی طرف لے جانے لگا۔ امین ارائیں کا جرم یہی تھا کہ وہ سچی گواہی دینا چاہتا تھا، لیکن طاقت نے اسے باندھ کر اندھے کمرے میں پھینک دیا تھا۔ ماحول میں قانون شکنی کی سڑاند پھیل چکی تھی۔

☆۔۔۔ ژ۔۔۔ ظ

وہ قسمت نگر گاؤں میں متوسط سا گھر تھا۔ بھلے وقتوں میں یہ گھر بنا تھا، ورنہ اس کی حالت دیکھ کر یہی لگتا تھا کہ برسوں سے اس کی دیکھ بھال ہی نہیں ہو سکی۔ ایک طرف چار کمروں کی قطار تھی، دوسری طرف کچن اور سٹور تھا۔ تیسری

طرف کبھی ڈھور ڈنگر بندھے ہوتے تھے لیکن اب وہ بر آمدہ خالی تھا۔ سامنے کی طرف لوہے کا بڑا سا پھاٹک تھا جو اب زنگ آلود ہو چکا تھا۔ کمروں کے آگے دالان میں چار پائی پر ماسٹر دین محمد لیٹا ہوا کتاب پڑھ رہا تھا۔ بھاری تکیہ اور پیروں کی طرف کھیس ڈالا ہوا تھا۔ ریٹائرڈ زندگی گذارنے والا بوڑھا ماسٹر دین محمد، جو اپنی وضع قطع سے اور رویے سے استاد ہی دکھائی دیتا تھا۔ جب وہ سکول میں پڑھاتا تھا، تب وہ بہت آسودہ تھا مگر اب وہ گاؤں میں انتہائی کسمپرسی میں وقت گزار رہا تھا۔ وہ چوہدری کے عتاب کا شکار تھا۔ اسے ریٹائر ہوئے کئی برس ہو گئے تھے لیکن اس کی پنشن کیس کا فیصلہ نہیں ہو پایا تھا۔ اسے ایک منی آرڈر ملتا، جس کے بارے وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے بھیجنے والا کون ہے۔ اسی سے وہ زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ بہت صابر اور شاکر قسم کا بندہ تھا۔ کبھی خود دوسروں کی مدد کیا کرتا تھا، مگر اب کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس وقت وہ کتاب پڑھنے میں محو تھا کہ سائیکل کی تیز گھنٹی نے اسے چونکا دیا۔ وہ اس مخصوص گھنٹی کو پہچانتا تھا۔ اس نے پھاٹک کی طرف منہ کر کے کہا

”اوئے رحمت کا کا، آجا اندر ہی آجا“

آواز کی باز گشت کے ساتھ ہی ایک نوجوان مگر مریل سا ڈاکیا اپنی سائیکل گھسیٹتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے اپنا تھیلا سنبھالا اور سیدھے ماسٹر دین محمد کو سلام کر کے پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ڈاکیے نے اپنا بیگ کھولتے ہوئے پوچھا۔

”اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“

اِس پر ماسٹر دین محمد نے اٹھ کر خوش کن انداز میں کہا

”اُو یار۔۔۔ بس ٹھیک ہی ہے۔۔۔ یہ بڑھاپا بھی تو ایک بیماری ہی ہوتی ہے نا۔ تو سنا تیرے بال بچے ٹھیک ہیں ناں۔“

”جی استاد جی۔۔۔ آپ کی دعائیں ہیں۔“ اس نے ممنونیت سے کہا پھر منی آرڈر اس کی جانب بڑھا کر بولا۔ ”یہ لیں یہ آپ کا منی آرڈر۔۔۔ دستخط کر دیں۔“

ماسٹر دین محمد نے وہ کاغذ پکڑا اور دستخط کر کے واپس کر دیا۔ اس دوران ڈاکیا رقم گن چکا تھا۔ اس نے وہ رقم ماسٹر کو دیتے ہوئے کہا

"یہ لیں استاد جی۔ گن لیں۔"

"اوئے ٹھیک ہی ہوں گے"

"نہیں استاد جی آپ ہمیشہ یہی کہتے ہیں اور میں بھی کہتا ہوں قم کا معاملہ ہے۔ گن لینے چاہئیں" ڈاکیے رحمت نے کہا تو ماسٹر دین محمد نے رقم لی اور اسے گنے بغیر اس میں سے ایک نوٹ نکال کر ڈاکیے کو دیتا ہوئے کہا

"جب میرا رب مجھے میرے عمل دیکھے بناء، گنے بغیر دے رہا ہے تو ان چند نوٹوں کو کیوں گنوں، لے یہ رکھ۔" ڈاکیے رحمت نے وہ نوٹ پکڑا اور اپنی جیب میں رکھتے ہوئے ہوئے بولا

"ویسے استاد جی، یہ جو بندہ بھی آپ کو منی آرڈر بھیجتا ہے نا، بڑا پکا بندہ ہے۔ ہر مہینے کی پہلی تاریخوں میں بھیجتا ہے۔۔۔ ویسے یہ کوئی آپ کا رشتے دار ہے کیا؟"

"تُو ہر مہینے یہ سوال کرتا ہے اور میرا یہی جواب ہوتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم، یہ کون ہے۔۔۔ کوئی اللہ کا بندہ ہو گا، جسے میرا احساس ہے۔ میں نہیں جانتا۔"

"اللہ رازق ہے نا استاد جی۔۔۔ اس نے کوئی نہ کوئی وسیلہ تو بنا دیا ہے نا۔" رحمت ڈاکیے نے جذب سے کہا تو ماسٹر دین محمد نے کہا

"بے شک رازق تو اللہ ہی ہے۔۔۔ سچی بات تو یہ ہے رحمت پتر۔۔۔ اسی منی آرڈر سے گھر چلتا ہے۔ جس دن یہ بند ہو گیا۔۔۔ گذارہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن مجھے یقین ہے یہ بند نہیں ہو گا۔۔۔ اور پھر ایک در بند ہوتا ہے نا تو سو در کھلتے ہیں۔ پینشن کیس کا فیصلہ تو ایک دن میں ہو جائے۔ بس یہ چوہدری جلال ہی نہیں ہونے دیتا۔ اس نے اگر سکول

بند کروادیا ہے تو کیا وہ کسی کی روزی بند کر سکتا ہے۔"

ماسٹر محمد دین کے اس طرح کہنے پر ڈاکیا یوں سہم گیا جیسے ڈر گیا ہو۔ اس نے محتاط انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر اپنے تھیلے میں سے ایک خط نکالتے ہوئے بولا

"اچھا استاد جی، یہ ایک چٹھی بھی سلمی بی بی کے نام کی ہے، یہ لے لیں۔ اب میں چلتا ہوں۔"

ماسٹر محمد دین نے خط پکڑ کر اُسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس دوران ڈاکیا اپنا تھیلا سنبھال کر اٹھ گیا۔ جس وقت وہ باہر والا گیٹ پار کر گیا، تب ماسٹر دین محمد نے وہ رقم اور خط ہاتھ میں لیے اور اندر کی طرف آواز لگائی

"سلمٰی۔۔۔ اُو پتر سلمٰی۔"

اندر ہی کسی کمرے سے آواز برآمد ہوئی

"جی آئی۔۔۔ ابا جی۔"

آواز کی بازگشت میں سلمی دالان میں آگئی۔ وہ سادہ سی، پرکشش، انتہائی نازک اور حسین لڑکی تھی۔ چوڑا ماتھا، شرمگیں بھنورا آنکھوں پر تیکھی چتون سے پہلی نگاہ ہی ان لوٹ لینے والے نینوں پر پڑتی تھی۔ ستواں ناک، پتلے پتلے لب کے اوپری دائیں کونے ذرا سیاہ تل۔ گول چہرہ، کانوں میں بندے لانبی گردن، جسے اس نے بڑے سارے آنچل میں چھپایا ہوا تھا۔ سرو قد اور متناسب جسم کو دیکھ کر پہلا یہی خیال آتا تھا کہ گدڑی میں لعل پڑا ہوا ہے۔ "جی ابا جی۔۔۔" دالان میں آکر لاشعوری طور پر اپنے درست آنچل کو مزید درست کرتے بولی۔ ماسٹر دین محمد نے اسے رقم اور خط دیتے ہوئے کہا

"یہ لے پتر۔۔۔ منی آرڈر کی رقم۔۔ سنبھال لے۔ اور یہ لو تمہارا خط ہے، کوئی سرکاری چھٹی لگتی ہے۔"

اس پر سلمی نے تجسس اور تذبذب میں خط کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا، اور الجھے ہوئے لہجے میں تیزی سے خط کھولتے ہوئے

کہا

''اُوہ۔! مجھے اس چھٹی کا انتظار تھا۔'' پھر ایک دم سے حیرت اور خوشی سے بھرپور لہجے میں بولی، '' ابا جی یہ دیکھیں۔۔۔ مجھے نوکری مل گئی۔۔۔ آپ کی طرح میں بھی ٹیچر بن گئی ہوں۔''

ماسٹر دین محمد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، پھر حیرت، خوف اور بدحواسی کے ملے جلے تاثرات سے لبریز لہجے میں پوچھا

''کیا تم ٹیچر بن گئی ہو؟ مطلب؟''

سلمیٰ بے انتہا خوش دکھائی دے رہی تھی۔ جیسے اسے کوئی بہت بڑا خزانہ مل گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں ستارے رقصاں تھے۔ اس نے باپ کے لہجے کو محسوس نہ کرتے ہوتے پر جوش انداز میں کہا

''یہ دیکھیں۔۔۔ آپ کو یاد ہو گا۔۔۔ دو ماہ پہلے میں انٹرویو دے کر آئی تھی۔۔۔ یہ اسی کا لیٹر ہے۔۔ اب صرف جانا ہے اور جوائین کرنا ہے۔''

''کہاں جوائین کرنا ہے۔۔۔ یہ دیکھا ہے تم نے۔۔؟ ماسٹر محمد دین نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا تو بولی

''یہ ساتھ نور پور 8 میں۔۔۔ اتنا دور تو نہیں ہے آدھے گھنٹے کا تو سفر ہے۔ بس یا ویگن پر آرام سے چلی جایا کروں گی۔''

''بہت دور ہے پتر۔۔۔ خیر تم فی الحال اسے رکھو۔۔۔ مجھے کہیں کام جانا ہے۔۔۔ پھر بات کرتے ہیں۔'' ماسٹر محمد دین کے انداز اور لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ وہ پریشان ہو گئی۔ اس نے مرجھائے ہوئے لہجے میں پوچھا

''کیا آپ کو خوشی نہیں ہوئی ابا جی۔۔۔؟''

''کہانا۔۔ پھر بات کرتے ہیں۔'' ماسٹر محمد دین نے سلمیٰ سے آنکھیں چراتے ہوئے کہا اور اُٹھ گیا۔ سلمیٰ حیران سی اس کی جانب دیکھتی رہی۔ پھر وہ بولی تو اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی ٹپک رہی تھی۔

”نہیں ابا جی۔! ہمیں اس پر ابھی بات کرنا ہو گی۔ میں آپ سے پوچھتی ہوں، کیا آپ کو میرا نوکری کرنا اچھا نہیں لگے گا؟“

”بات اچھا لگنے یا نہ لگنے کی نہیں ہے بیٹی۔ جب تم گھر سے نکلتی ہے نا تو تیرے باپ کا دل دہل جاتا ہے۔ اور تم نوکری کی بات کر رہی ہو۔“

”ابا جی۔! میں سارے حالات جانتی ہوں۔ لیکن مجھے بتائیں میں گھر میں پڑی کیا کرتی ہوں۔ کیا فائدہ اتنی تعلیم حاصل کرنے کا۔ اگر یہ تعلیم ہی میرے کام نہ آئی تو۔“ اس نے مایوسانہ لہجے میں کہا تو ماسٹر دین محمد لرزتے ہوئے بولا

”تعلیم تو ہر بیٹی کا حق ہے پتر۔ اور میں عورت کے کام کرنے کا مخالف بھی نہیں ہوں۔ بس پتر۔! زمانے سے ڈر لگتا ہے میں بوڑھا کیا کر پاؤں گا۔“

”میں آپ کی مجبوری سمجھتی ہوں ابا جی۔ مگر کب تک؟ کیا ساری زندگی یونہی گذر جائے گی۔ کبھی تو باہر نکلنا ہو گا۔ ڈر کر، زندگی گذارنے سے بہتر ہے، مر جائیں۔“ اس کے لہجے میں آگ تھی۔

’اللہ نہ کرے میری بیٹی۔ ایسا مت کہو۔ بس یہ میری پینشن والا معاملہ حل ہو جائے نا۔ تو میں تیرا فرض بھی ادا کر دوں اور۔۔۔“ ماسٹر محمد دین نے کہنا چاہا مگر سلمی بات کاٹتے ہوئے بولی

”اور آپ کو یہاں اکیلا چھوڑ دوں۔۔۔ ایسا نہیں ہو گا ابا جی۔“

”بیٹیاں اپنے ہی گھر میں اچھی لگتی ہیں۔ باپ کے گھر میں تو مہمان ہوتی ہیں۔ اللہ کرے تیرا اچھا سا گھر بن جائے تو پھر میں بھی سکون سے اللہ کے پاس چلا جاؤں۔“ وہ نڈھال سا ہو گیا تھا۔ اس کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی اور اگر تھی تو وہ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

”دیکھا۔! پھر مایوسی کی باتیں شروع کر دی ہیں نا آپ نے۔ ہم جانتے ہیں ابا جی، پینشن کیس کا فیصلہ کیوں نہیں ہو

رہا ہے۔ اور وہ منی آرڈر جس کے بارے میں پتہ نہیں کون بھیجتا ہے۔ کسی دن بھی بند ہو سکتا ہے۔ ان حالات میں گھر کیسے چلے گا۔'' اس نے حقیقت کہی

''لیکن بیٹی۔! ابھی تو گھر چل رہا ہے نا۔ پینشن کیس کا فیصلہ بھی ہو جائے گا۔'' وہ کمزور سے لہجے میں بولا

''آپ کی یہ دلیلیں بہت کمزور ہیں ابا جی۔ میں نوکری کروں گی اور بیٹا بن کر آپ کی خدمت کروں گی۔۔۔ میں۔۔۔ میں کہیں نہیں جا رہی ہوں۔ ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی۔'' اس نے مان اور انا کیساتھ کہا تو تڑپ کر بولا

''نہ میری بیٹی نہ۔۔۔ تو نوکری بے شک کر۔۔۔ مگر تجھے اپنے گھر تو جانا ہے۔ آج میری آنکھیں بند ہو جائیں تو پھر تیرا کون ہے؟''

''میری قسمت میں جو ہو گا نا ابا جی، وہ ہو کر رہے گا۔۔۔ لیکن میں اب بے بسی کی زندگی نہیں گزارنا چاہتی ہوں۔ اپنا گھر خود چلانا چاہتی ہوں۔ آپ نے کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا درس نہیں دیا، اور اس مفلوک الحالی میں بھی کسی سے کچھ نہیں مانگا۔ تو کیا میں خود کما نہیں سکتی۔؟ میں اپنے پیروں پر خود نہیں کھڑا ہو سکتی؟'' یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر کے لئے اپنے باپ کو دیکھتی رہی پھر الٹے قدموں واپس اندر چلی گئی۔ ماسٹر دین محمد نے اسے جاتے ہوئے دیکھا پھر لمبی سانس لے کر خود کلامی کے انداز میں بڑبڑایا

''اللہ تیری قسمت بہت اچھی کرے میری بیٹی۔''

یہ کہہ کر وہ سوچوں میں گم ہو گیا۔ وقت اور حالات نے اسے بوڑھا ہی نہیں لاچار بھی کر دیا تھا۔

☆۔۔۔ژ۔۔۔ظ

رات کا گہرا سناٹا اس بنگلے کے آنگن میں بول رہا تھا۔ جبکہ شب ابھی کچھ دیر پہلے ہی شہر پر اُتری تھی۔ پوش علاقے میں وہ سفید بنگلہ سنہری دھیمی روشنی میں جگمگا رہا تھا۔ پورچ میں قیمتی کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ گیٹ پر مستعد چوکیدار

رہتے۔ ان کے علاوہ کئی سارے نوکر تھے جو اپنے اپنے رہائشی کوارٹرز میں جا چکے تھے۔ اس شاندار اور قیمتی بنگلے کے مکیں صرف دو لوگ تھے۔ محمود سلیم، جو ریٹائرڈ بیوروکریٹ تھا۔ اس کی ساری زندگی مرکزی حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر سروس کرتے گزری تھی۔ زندگی نے اگرچہ اسے بہت کچھ دیا تھا لیکن اولاد جیسی نعمت سے نہیں نوازا تھا۔ وہ سمجھ دار تھا۔ ساری زندگی رب تعالیٰ پر بھروسہ کیئے رہا۔ اگر اس کا رب چاہتا تو اس کی جھولی بھر دیتا، اس نے کبھی بھول کر بھی اس نے اپنی بیوی کو یہ نہیں جتایا تھا کہ وہ اسے اولاد نہیں دے پائی ہے۔ جبکہ اس کی بیوی پوری زندگی اسی دُکھ میں گلتے ہوئے، اس جہان کو چھوڑ چکی تھی۔ بہت پہلے جب اس نے فہد حسین جیسے لاوارث بچے کو لے پالک بنا کر اپنے گھر لایا تو شوہر کی خوشی میں وہ بھی خوش ہوگئی۔ فہد کو اس نے اپنے بیٹے کی طرح پالا، جس کا وہ صرف خواب ہی دیکھتی تھی۔ فہد جوان ہوگیا مگر وہ اس کی کوئی خوشی دیکھے بنا اس دنیا سے رخصت ہوگئی۔ اب وہ دونوں ہی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ فہد حسین نے پولیس آفیسر کی ٹریننگ لی تھی، مگر جیسے ہی محمود سلیم ریٹائرڈ ہوا اور اس نے اپنا بزنس کرنے کا اعلان کیا تو اس نے پولیس کی سروس جوائن نہیں کی بلکہ اپنے باپ کے ساتھ ہوگیا۔ اس نے ابھی باقاعدہ بزنس نہیں سنبھالا تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ فہد ان دنوں میں بہت ڈسٹرب ہے۔ محمود سلیم اپنے پارٹنرز کے ساتھ اپنا بزنس سیٹ کر رہے تھے اور وہ اپنے ہی اندر کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ اس وقت بھی وہ اپنے شاندار اور قیمتی ترین اشیاء سے آراستہ بیڈ روم میں سویا ہوا تھا۔ ساری دنیا جاگ رہی تھی اور وہ دنیا سے، اُس کی دلچسپیوں سے اور اس کی کشش سے آزاد، اندھیرے اُجالے کی سی کیفیت میں اپنے بیڈ پر سویا ہوا تھا۔ شاید وہ بہت زیادہ ہی الجھا ہوا تھا۔ کیونکہ اس وقت بھی خواب کی سی کیفیت میں دھندلے دھندلے اور الجھے ہوئے خاکے چلتے ہوئے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔ اس کے ایسی بھیانک آوازیں آ رہی تھیں جن میں صرف خوف ٹپک رہا تھا۔ وہ مضطرب ہوتے ہوئے کسمسا رہا تھا۔ پھر ایک دم وہ

آنکھیں کھل گئی۔ وہ تیزی سے اٹھا اور اپنے آپ کو بیڈ پر پا کر اپنے حواسوں میں آنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس نے ٹیبل لیمپ آن کیا، اور پھر کچھ ہی دیر میں وہ اپنے آپ میں آتا چلا گیا۔ اس نے قریب پڑے جگ سے پانی گلاس میں ڈالا اور ایک ہی سانس میں پی گیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے خود پر قابو پاتا رہا اور سمجھنے کی کوشش کرنے لگا کہ آج پھر کیوں اس کے اندر کا وحشی جاگنے لگا ہے۔ اسے اس کی صرف ایک ہی وجہ سمجھ میں آئی۔ آج اس سے مائرہ ملی تھی۔ اس کا خیال آتے ہی اس سے ملاقات کی ساری جزئیات اس کے دماغ میں جاگ گئیں۔ اس ملاقات میں باتیں ہی ایسی ہوئیں، جس نے اسے سوچوں کے حصار میں لا پھنکا۔ شام کے بعد سے یہی سوچوں کا حصار، بگولے بننے لگا، جس نے اس کی پوری ذات کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ وہ مائرہ کو منع بھی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اس کی دوست تھی۔

مائرہ الٹرا ماڈرن صحافی تھی، قدرے فربہ مائل، اتنی زیادہ خوبصورت تو نہیں تھی لیکن گفتگو اور انداز میں ایسی کشش رکھتی تھی کہ دوسرے اس کی طرف متوجہ ہوئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ بہت باصلاحیت تھی، اس لئے قدرے مغرور بھی تھی۔ فہد کے معاملے میں وہ بہت نرم تھی۔ فہد کو یہ اندازہ تھا کہ وہ اس سے بے حد محبت کرتی ہے۔ اس کے باپ کا شمار شہر کے بڑے بزنس مین ہوتا تھا، جو اب سیاست میں بھی دلچسپی لینے لگا تھا۔ اس نے اپنے پاپا کے ساتھ بزنس کی بجائے محض اپنے شوق کی غرض سے میڈیا کے لئے کام کر رہی تھی۔ پرکشش، ذہین اور ماڈرن مائرہ، کبھی فہد کی کلاس فیلو تھی اور تب سے اس پر مرمٹی تھی۔ وہ تو اپنی محبت کا اظہار کئی بار کر چکی تھی، لیکن فہد ابھی تک گومگو کی کیفیت میں تھا۔ اب تک اسے کوئی جواب نہیں دے پایا تھا۔ اس کی وجہ کیا تھی، یہ اس کی اپنی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

اس شام وہ دونوں پارک میں ٹہلتے ہوئے جا رہے تھے۔ دونوں ہی خاموش تھے۔ جیسے خاموشی بھی اک زبان ہو۔ وہ چلتے ہوئے آ کر ایک ٹیبل کے گرد پڑی دو کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ سکون سے بیٹھنے کے بعد مائرہ نے فہد کے چہرے پر دیکھا اور الجھے ہوئے لہجے میں بولی

"یہ آج کل تم کہاں غائب رہتے ہو فہد۔ تمہارا فون کبھی بزی ملتا ہے تو کبھی بند۔ گھر بھی نہیں ملتے ہو اور یاد ہے تمہیں ،ہم پچھلے ایک ہفتے سے نہیں ملے ہیں۔ ایسا پہلی بار ہوا ہے۔"

مائرہ کے اس طرح شکوہ بھرے انداز پر وہ چونک گیا، پھر ہلکے سے مسکراتے ہوئے بولا

"میں۔! میں غائب رہتا ہوں، اور یہ بات۔۔۔ تم جیسی معروف اور مصروف جرنلسٹ کہہ رہی ہے۔ جس سے ملنے کے لئے خود وقت لینا پڑتا ہے۔"

"دیکھو۔! مجھے بناؤ مت۔ صاف اور سچی بات بتاؤ۔ کہاں بزی ہو۔؟" مائرہ نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ تب وہ اس آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا

"کہیں بھی غائب نہیں ہوں اور نہ ہی بزی ہوں۔"

"پھر مسئلہ کیا ہے تمھارے ساتھ۔ اتنے دن ملے، نہ بات کی۔ اور ابھی جب سے یہاں آئے ہو، گم سم ہو۔ پہلے والے فہد دکھائی ہی نہیں دے رہے ہو۔ آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟ کیوں ڈیپریس ہو آج کل؟ مسئلہ کیا ہے تمہارا؟" اس کا لہجہ ہنوز اکتایا ہوا تھا

"دیکھو مائرہ۔! تمہیں معلوم ہے کہ پاپا چاہتے ہیں کہ کوئی اچھا سا بزنس شروع کروں، مگر اپنی طبعیت ہی ابھی۔۔۔" اس نے کہنا چاہا تو وہ بات کاٹ کر بولی

"یہ اوٹ پٹانگ باتیں کر کے تم مجھے نہیں بہلا سکتے۔ کم از کم مجھے نہیں، جو تمہیں۔۔۔ تم سے زیادہ جانتی ہے۔ میں جو تم سے پوچھ رہی ہوں کہ تم ڈیپرس کیوں ہو اس کا مطلب ہے کہ کوئی نہ کوئی وجہ ہے جو تم اس طرح کا بی ہیو کر رہے ہو"

"مائرہ۔! ٹھیک ہے تم میری بہت اچھی دوست ہو۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ تم اپنی خود ساختہ سوچ مجھ پر مسلط کر دو۔ کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جو خود سے بھی چھپائی جاتی ہیں۔ اب کیا بتاؤں تمہیں؟" اس نے عجیب سے لہجے

میں کہا تو مائرہ نے اسے چونک کر دیکھا، پھر کافی حد تک دھیمے اور پر سکون لہجے میں بولی

"کیا تم ابھی تک مجھے اپنا دوست ہی سمجھتے ہو۔۔۔میں تم سے محبت کرتی ہوں فہد۔ میں نے تمہیں چاہا ہے اور پھر۔۔۔" اس سے آگے اس سے کہا ہی نہیں گیا۔ اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ روہانسا ہو گئی تو فہد نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپاتے ہوئے کہا

"سوری۔! یہ جو محبت ہوتی ہے نا مائرہ، کبھی کبھی بڑے دُکھ دے جاتی ہے۔ بندہ بے بس ہو جاتا ہے۔ زندگی کی راہ پر چلتے چلتے اچانک کوئی نہ کوئی دوراہا آ جاتا ہے۔ ایسے ہی کسی وقت کے لئے بندہ تیار رہے تو پھر وہ ٹوٹتا نہیں۔" فہد کے لہجے میں عجیب یاسیت تھی جس پر وہ چونکتے ہوئے بولی

"یہ تم کیسی فضول باتیں کرنے لگے ہو۔۔۔مائرہ اتنی کمزور نہیں ہے کہ ٹوٹ کر بکھر جائے۔ تمہاری محبت نے مجھے بہت مضبوط بنا دیا ہے۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے خود پر قابو پایا اور سخت لہجے میں بولی ،"بتاؤ، کیوں ڈِپیرس ہو تم؟" اس پر فہد نے اسے سیخ پا نگاہوں سے دیکھا، وہ بھی سخت چہرے کے ساتھ اسے گھورتی رہی۔ دونوں ایک دوسرے کو ذرا دیر تک گھورتے رہے پھر دونوں ہی ایک دم ہنس دیئے، "اچھا چلو نہ بتاؤ۔ لیکن جب تک تم یہاں میرے ساتھ ہو۔۔۔اپنا موڈ درست رکھو۔ میں وارننگ دے رہی ہوں تمہیں۔"

"شکر ہے، تمہاری یہ تفتیش ختم ہوئی۔ اگر تم مزید سوال نہ کرنے کا وعدہ کرو تو ایک بات بتاتا ہوں۔" اس نے پر سکون انداز میں کہا اور کرسی سے ٹیک لگا لی

"بولو۔۔۔نہیں کروں گی سوال۔ وعدہ۔۔۔" وہ صدق دل سے بولی تو اس نے نیلے آسمان پر ایک نگاہ ڈالی اور پھر اس کے چہرے پر دیکھ کر بولا

"مائرہ۔! میری زندگی میں ایک دوراہا آ گیا۔ یہ اچانک نہیں آیا۔ بلکہ میں خود اس کا منتظر تھا۔ مجھے کون سے راستے پر جانا

ہے اور کس رستے کو میں نے چھوڑ دینا ہے۔ اس کا فیصلہ میں کر چکا ہوں۔ اب تم خود اندازہ لگا سکتی ہو کہ میں کن حالات سے گذر رہا ہوں۔" وہ کہہ رہا تھا کہ اتنے میں ویٹر ان کے قریب آ گیا۔ مائرہ نے جلدی سے سوفٹ ڈرنک کا آرڈر دیا اور فہد سے پوچھا

"کیسا فیصلہ۔۔۔ کیسا دوراہا۔۔ میں کچھ سمجھی نہیں؟"

"تم نے ابھی کیا وعدہ کیا تھا۔۔" فہد نے تیزی سے کہا تو مائرہ کو یاد آ گیا۔ وہ چند لمحے خاموش رہی، پھر سمجھنے والے انداز میں بولی

"اوکے اوکے۔۔۔ میں تمہارے کسی فیصلے یا دوراہے کے بارے میں نہیں پوچھتی۔ لیکن ایک سوال ضرور کروں گی۔"

"بولو" اس نے بے بسی والے انداز میں کہا

"تم نے پولیس سروس جوائن کی۔ ٹریننگ بھی لے لی، آفیسر بنے اور پھر چند مہینے بعد جاب چھوڑ دی۔۔۔ کیا یہ تمہارے اسی فیصلے یا دوراہے کی وجہ سے۔۔۔ نو آر یس۔" اس نے تیزی سے آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے کہا تو فہد چند لمحے سوچ کر بولا

"ہاں۔! میں نے اسی لیے پولیس سروس چھوڑی ہے۔۔۔ اب کوئی سوال نہیں کرنا، ابھی یہاں سے کولڈ ڈرنک لو۔۔۔ پھر میں تمہیں، تمہارے فیورٹ ریستوران سے کھانا کھلاتا ہوں۔" اس نے کہا اور سوچ میں پڑ گیا۔ اسے جھوٹ بولنا آتا ہی نہیں ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر مائرہ نے زیادہ تجسس کیا تو ممکن ہے وہ کچھ کہے بنا یہاں سے اٹھ کر چلا جائے۔ کیوں کہ وہ اسے کچھ بھی نہیں بتانا چاہتا تھا۔ وہ ان لمحوں کو غنیمت سمجھ رہا تھا جو وہ اپنی دوست کے ساتھ گزار رہا تھا۔ جھوٹ بولنے کا ڈپریشن اور سچ نہ بول پانے کی بے بسی اسے اندر سے جکڑے ہوئے تھی۔ اس شام جب وہ واپس گھر آیا تو جی بہت بوجھل تھا۔ شاید یہی دباؤ تھا جس نے اوٹ پٹانگ خواب کی صورت میں اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔

وہ اب تک اپنے حواسوں میں آ گیا تھا۔ وہ اٹھا اور اپنے بیڈ روم سے باہر چلا گیا۔

وہ باہر لان میں ٹہلتے اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مائرہ اس کی بہت اچھی دوست تھی۔ اس نے ہمیشہ یہی سمجھا تھا جبکہ اسے پورا یقین تھا کہ وہ اس کے ساتھ پورے دل سے محبت کرتی ہے۔ شاید کچھ اور حالات ہوتے تو وہ اس کی محبت کا بھرپور جواب دیتا۔ مگر وہ اس راہ ایک ذرا بھی آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔ اس نے کبھی بھی اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔ اسے کوئی دُکھ نہیں تھا۔ جو آگ اس کے من میں بچپن سے لگی ہوئی تھی، اس کے سامنے مائرہ کی محبت برستی ہوئی بارش کی مانند نہیں تھی۔ جو انتقام کی اس آگ کو ٹھنڈا کر دے۔ اس نے مائرہ کو کبھی بھی دھوکا نہیں دیا تھا۔ انہی لمحات میں اس کے کاندھے پر ہاتھ کا لمس محسوس ہوا۔ اس نے چونکتے ہوئے مڑ کر دیکھا، اس کے سامنے محمود سلیم کھڑے تھے۔ تب اس نے حیرت سے پوچھا

”پاپا آپ، سوئے نہیں ابھی تک؟“

”بیٹا، یہی سوال اگر میں تم سے کروں تو۔۔۔؟“ یہ کہتے انہوں نے شفقت بھری نگاہوں سے اسے دیکھا، پھر لمحہ بھر خاموشی کے بعد بولے، ” اور ویسے بھی میں بوڑھا آدمی ہوں مجھے اتنی جلدی نیند نہیں آتی، اور پھر ابھی کتنا وقت ہوا ہے، صرف دس ہی تو بجے ہیں“ یہ کہتے ہوئے وہ ذرا سا مسکرایا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا” خیر، میں کئی دنوں سے تمہیں دیکھ رہا ہوں، تم ڈسٹرب ہو، بولو بیٹا، کیا بات ہے؟“ پاپا نے کچھ اس طرح پوچھا کہ وہ پورے اعتماد سے بولا

”پاپا! میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا، میں واقعی ڈسٹرب ہوں۔“

”کیوں بیٹا، ایسا کیا ہو گیا ہے؟ کچھ مجھے بھی تو پتہ چلے؟“ محمود سلیم نے گہری تشویش سے پوچھا تو اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا

"پاپا، میرے اندر قسمت نگر کا وہ بچہ اب بھی دھاڑیں مار مار کر رو رہا ہے، جسے اس کے والدین سمیت وہاں سے ذلیل کر کے نکل جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ یہ ایک قرض ہے مجھ پر، جو اب اتنا بڑھ گیا کہ برداشت سے باہر ہو رہا ہے۔"

"کیا میری پرورش میں کوئی کمی رہ گئی ہے کہ وہ بچہ اب تک۔۔۔؟" محمود سلیم نے دلگیر لہجے میں کہا تو شدت سے بولا

"نہ۔۔نہ۔۔۔نہیں پاپا، اگر آپ مجھے گود نہ لیتے میرے والدین کے فوت ہو جانے بعد آپ مجھے سہارا نہ دیتے تو میں بھی اب تک بے کس اور مجبور لوگوں کی طرح مر کھپ گیا ہوتا۔ اس بے رحم معاشرے کے چنگل میں پھنس کر رحم مانگنا بھی بھول گیا ہوتا۔ آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ جہاں آپ نے میری پرورش کی وہاں مجھے ذہنی شعور بھی دیا ہے۔ یہی شعور۔۔۔ میری ذات پر قرض کا بوجھ بڑھا رہا ہے۔ میں اپنے ضمیر کا سامنا نہیں کر پا رہا ہوں۔۔۔ پاپا۔۔۔نہیں کر پا رہا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔
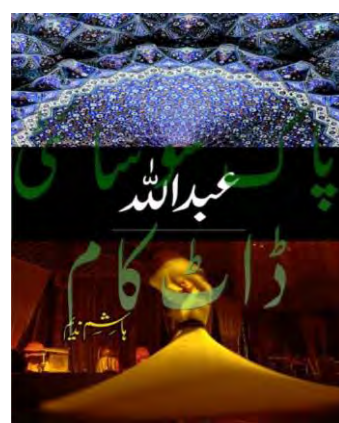
"ریلیکس بیٹا۔" یہ کہہ کر وہ لمحہ بھر خاموش رہا پھر بولا" سنو! میں ایک ریٹائیر بیورکریٹ ہوں۔ تم جانتے ہو۔۔۔ جتنی قوت اور طاقت ریٹائیرمنٹ سے پہلے تھی، اب اس سے کہیں زیادہ ہے۔ پہلے ملازمت کی کچھ مجبوریاں تھیں۔ اب تو وہ بھی نہیں رہیں۔ میرے ایک اشارے پر۔۔۔ وہ کیا۔۔۔ وہاں کا چوہدری جلال سکندر۔۔۔ اسے۔۔۔" اس نے دانت پیستے ہوئے کہنا چاہا تو فہد نے ٹوکتے ہوئے کہا

"نہیں، یہ آپ ہی نے مجھے سکھایا ہے کہ اپنے حق کے لیے خود لڑنا چاہئے، چاہے اس میں جیسے بھی حالات ہوں۔ میں اپنے حق سے دستبردار نہیں ہو سکتا، میں وہ لے کر ہی رہوں گا۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہاں تمہاری تھوڑی سی زمین اور ایک گھر ہے، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ ایک ہفتے کے اندر وہ زمین اور گھر۔۔۔" محمود سلیم نے اس کی طرف دیکھا اور کہتے کہتے رک اس کی جانب دیکھنے لگا تو فہد نے مسکراتے ہوئے کہا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-
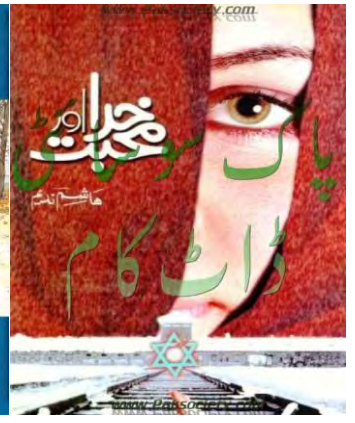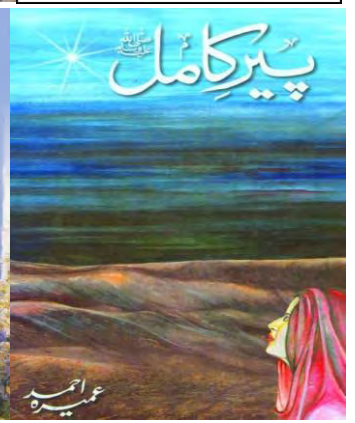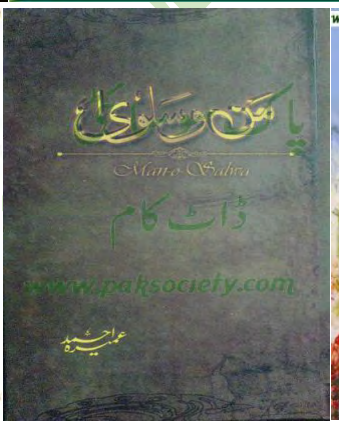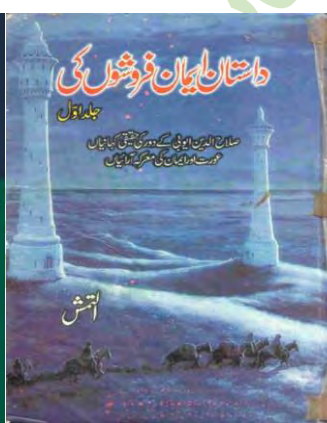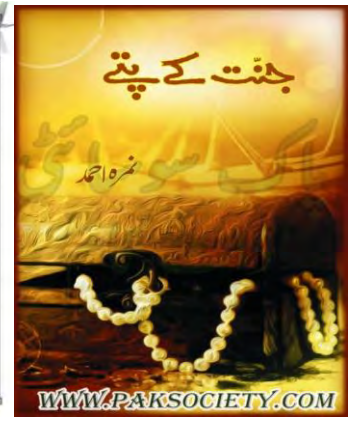
”نہیں پاپا، آپ نے جتنا مجھے دے دیا ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ زمین اور گھر تو ذرا سی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ میں اپنا وہ حق نہیں کہہ رہا، بلکہ میں اس وجہ کو ختم کرنا چاہتا ہوں، جس کے باعث نہ جانے کتنے لوگ ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ آپ کیا سمجھتے ہیں، آج کے اس جدید دور میں بھی غلامی ختم ہو گئی ہے، نہیں، آج بھی خوف کی ان دیکھی زنجیروں میں بندھے غلام موجود ہیں جو طاقت اور وسائل پر قابض لوگوں کے سامنے سر نہیں اٹھا سکتے۔ ان کا مجھ پر حق ہے۔ یہ میرا قرض ہے، جسے میں ہی چکانا چاہتا ہوں۔ “

”مجھے خوشی ہوئی بیٹا کہ تم مردہ ضمیر لوگوں میں سے نہیں ہو۔ تم جو چاہتے ہو، ویسا کرو، میں اُسے مجبور کر دوں گا کہ وہ یہاں تمہارے پاس آ کر تمہارے پاؤں پر سر رکھ کر معافی مانگے۔“ پاپا نے دبے دبے غصے میں کہا

”سوری پاپا۔ میں خود وہاں جا کر یہ قرض چکانا چاہتا ہوں۔ اس چوہدری کے لئے تو چند روپوں کی ایک چھوٹی سے بلٹ کافی ہے۔۔۔ مگر۔۔۔۔“ یہ کہتے وہ دانت پیس کر رہ گیا۔ وہ شدتِ جذبات میں کچھ کہہ نہیں پایا تھا۔ تب پاپا نے اس کے کاندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا

”اگرچہ مجھے، تمہیں یوں اجازت دینے میں دُکھ ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ جب تک تم وہ نہیں کر پائے جو تم چاہتے ہو اس وقت تک سکون نہیں پا سکو گے۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، تمہیں اجازت دیتا ہوں، تم یہ قرض چکاؤ۔ جو چاہتے ہو وہ کرو“

فہد نے چونک کر اپنے پاپا کی طرف دیکھا پھر انتہائی خوشی میں اپنے پاپا کو دونوں کاندھوں سے پکڑ کر بولا

”میں اسی الجھن میں تھا پاپا، میں آپ کی اکلوتی اُمید ہوں۔۔۔ آپ کی محبت نے مجھے روکا ہوا تھا۔۔۔ اب میں۔۔۔ میں۔۔“ مزید اس سے کچھ بھی نہیں کہا گیا وہ یہ کہتے ہوئے وہ پاپا کے گلے لگ گیا۔ محمود سلیم اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا

”میں اب سمجھا ہوں بیٹا کہ تم نے پولیس ٹریننگ کے بعد نوکری کیوں نہیں کی اور نہ ہی اب بزنس کر رہے ہو۔۔۔ کوئی بات نہیں۔ جیسا تم چاہو۔۔۔ آؤ اب سکون سے سو جاؤ، کل ہم دونوں اس پر مزید ڈسکس کر لیں گے۔ رات بہت گہری ہو گئی ہے۔“ پاپا نے کہا اور اسے ساتھ لگا کر اندر کی طرف مڑا۔ فہد اس کے ساتھ چل پڑا۔ وہ دونوں اندر کی جانب بڑھ گئے۔

☆۔۔۔ژ۔۔۔ظ

وہ حالیہ برسوں میں نیا بننے والا شہر کا پوش علاقہ تھا۔ یہاں زیادہ تر کاروباری طبقے سے تعلق رکھنے والوں نے ایک سے بڑھ کر ایک جدید طرز کا بنگلہ بنایا ہوا تھا۔ انہی میں سے ایک بنگلے کے ڈائینگ ہال میں ٹیبل پر اچھی صحت اور بہترین شخصیت والا حبیب الرحمن بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اس کے پاس اس کی بیوی بانو بیگم موجود تھی۔ اتنے میں ان اکلوتی بیٹی مائرہ تیار ہو کر آ گئی اور آتے ہی بولی

”گڈ مارننگ ماما۔۔۔ گڈ مارننگ پاپا“

”گڈ مارننگ۔۔۔ کیسی چل رہی ہے تمہاری صحافت۔۔۔“ حبیب الرحمن نے اخبار تہہ کر کے ایک طرف رکھتے ہوئے پوچھا تو چہکنے والے انداز میں بولی

”فنٹاسٹک پاپا۔۔۔“

”گڈ۔! ویسے میں بھی دیکھ رہا ہوں تمہاری نیوز سٹوریز۔۔۔ اچھا کام ہے۔“ اس نے تعریف کرتے ہوئے ٹوسٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا جو اس کی بیوی بنا کر پلیٹ میں رکھ چکی تھی۔ وہ بھی اپنے کپ میں جوس انڈیلتے ہوئے بولی

”پاپا۔! ایک بات بتائیں۔“

”پوچھو۔!“ یہ کہتے ہوئے حبیب الرحمن نے اس کی طرف دیکھا

”آپ تو سیدھے سادھے بزنس مین ہیں۔ یہ اچانک، آپ سیاست میں کیوں دلچسپی لینے لگ گئے ہیں؟اور جس پارٹی میں آپ ہیں اس میں بہت اچھا عہدہ بھی آپ کو مل گیا، یہ کیسے؟ لیکن جواب دیتے ہوئے یہ ذہن میں رہے پاپا کہ آج کل میں سیاست دانوں کے بخیے ادھیڑ رہی ہوں۔“

اس پر پہلے تو حبیب الرحمن ہنس دیا، پھر سوچتے ہوئے سنجیدگی سے بولا

”ہوں۔! یہ سچ ہے کہ میں سیاست میں دلچسپی لے رہا ہوں اور مجھے پارٹی میں بہت ذمے داری والا عہدہ بھی مل گیا ہے ۔لیکن مجھے کوئی ایم پی اے، ایم این اے وغیرہ بننے کا شوق بھی نہیں اور نہ ہی میں بننا چاہتا ہوں۔۔۔بس اتنا سمجھ لو کہ مجھے بھی تمہیں دیکھ کر سیاست میں آنے کا خیال آگیا ہے۔“

”پاپا۔۔۔یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مذاق کر رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر؟“ وہ برا سا منہ بنا کر بولی تو حبیب الرحمن نے اسی سنجیدگی سے کہا

”میں مذاق نہیں کر رہا میری بیٹی، بلکہ میں پوری سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔ کیا تم یہ بات نہیں سمجھتی ہو کہ اس وقت اپنے ملک کو روائتی سیاست چھوڑنا ہو گی۔۔۔سیاست میں پڑھے لکھے اور باشعور لوگوں کو آنا چاہئے۔ ان پڑھ اور جاہل سیاست دانوں نے اپنے ملک کی عوام کو کیا دیا ہے؟۔۔۔دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے اور ہم کہاں کھڑے ہیں؟ یہی ایک سوال ہے۔ جو بہر حال مجھے سیاست میں لایا۔ ایک خوشحال ملک بنانے میں اب ہمیں آگے آنا ہو گا۔“

”اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ اس ملک کا جتنا نقصان، ان مفاد پرست سیاست دانوں نے کیا ہے، اسے سوچیں تو لرز جائیں۔ کرپشن کے سوا کوئی بات ہی۔۔۔ سمجھ نہیں آتی آخر یہ کرنا کیا چاہتے ہیں۔ جمہوریت کا راگ ہی الاپے جا رہے ہیں، کیا جمہوریت کا مطلب ان کا ذاتی مفاد ہے؟“ وہ تلخ ہوتے ہوئے بولی

”جب کسی کے پاس مفاد پرستی کے سوا کوئی مقصد نہیں ہو گا۔ عوام کی بجائے وہ اپنی خوشحالی پر توجہ دیں گے تو ملک کا

نقصان ہی ہو گا۔اس کا ایک بیک گراونڈ ہے۔ جسے فی الحال تم ایسے نہیں سمجھ پاؤ گی۔۔۔ہم اس پر تفصیل سے پھر کبھی بات کریں گے۔۔۔ ابھی میں جارہاہوں۔۔۔"اس نے ریسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا اور اٹھ کر چل دیا۔

"ٹھیک ہے پاپا۔۔۔" مائرہ نے پلیٹ سیدھی کرتی ہوئے کہا تو اب تک خاموش بیٹھی بانو بیگم نے طنز آمیز لہجے میں کہا" مجھے تم باپ بیٹی کی بالکل سمجھ نہیں آرہی۔ پتہ نہیں کیا کر رہے ہو تم دونوں۔"

"پاپا بزنس کر رہے ہیں اور میں صحافت۔۔۔" وہ پر سکون لہجے میں بولی تو بانو بیگم نے اسی طنزیہ لہجے میں کہا

"نہ سمجھ آنے والی بات یہ ہے کہ۔۔۔ تمہاری شادی کی عمر ہو گئی ہے۔ لیکن تم دونوں کو خیال ہی نہیں ہے۔"

"اُوماما۔! یہ شادی کہاں درمیان میں آگئی۔" اس نے اکتاتے ہوئے کہا تو بانو بیگم غصے میں بولی

"میں ماں ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ بیٹی کے لئے کیا فرض ہوتا ہے۔ میں تمہاری شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اور تمہارے پاس میری بات سننے کے لئے وقت ہی نہیں ہے۔"

"ماما۔! اس میں اتنا excited ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ جب شادی ہونا ہو گی تو ہو جائے گی۔ ابھی تو میں نے بہت کچھ کرنا ہے۔" وہ عام سے لہجے میں بولی

"جو بھی کرنا ہے شادی کے بعد کرتی رہنا۔ تمہاری پھوپھو آمنہ نے مجھ سے بات کی ہے اپنے رضوان کے لئے۔" ماما نے جیسے دھماکا کر دیا تو حیرت سے بولی

"وہ تو کینیڈا رہتے ہیں۔ اتنی دور میں، وہاں کیا کروں گی۔"

"وہاں بھی ٹی وی چینل ہیں۔ بلکہ رضوان کا تو اپنا چینل ہے۔ تم بتاؤ، تم اس بارے کیا کہنا چاہتی ہو۔" ماما نے حتمی انداز میں کہا

"کیا آپ سنجیدہ ہیں ماما؟" اس نے حیرت سے تصدیق چاہی

”بالکل۔!میں نے چند دنوں میں تمہارے پاپا سے بات کرنی ہے لیکن میں نے چاہا کہ میں پہلے تم سے پوچھ لوں۔“ وہ یوں پر سکون انداز سے بولی کہ جیسے یہ بات کر کے اس نے بہت بڑا بوجھ اتار دیا ہو۔ تبھی وہ ایک طویل سانس لے کر بولی

”ٹھیک ہے ماما۔!میں آپ کو سوچ کر بتادوں گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا پرس سنبھال کر اٹھتی کھڑی ہوئی تو بانو بیگم نے حیرت سے کہا

”ناشتہ تو کر لو مائرہ۔“

”مجھے بھوک نہیں ہے۔“ یہ کہہ کر وہ باہر کی جانب چل دی۔بانو بیگم اسے دیکھتی رہ گئی۔اسے اس طرح کے ردعمل کی توقع نہیں تھی۔

وہ تپتے ہوئے دماغ کے ساتھ اپنی کار میں آبیٹھی۔اسے خود پر ہی غصہ آرہا تھا۔وہ پوری شدت سے فہد کو چاہتی تھی۔ لیکن وہ تھا کہ کسی قسم کا کوئی ریسپانس نہیں دے رہا تھا۔ کبھی اس نے اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دیا تھا۔اور نہ ہی کبھی اس کی محبت کو قبول کرنے کا اشارہ تک کیا تھا۔یوں جیسے وہ اسے نظر انداز کر رہا ہو۔دوسری طرف اس کی ماں اس سے پوچھے بغیر اس کی شادی طے کر رہی تھی۔اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے اس کی ساری زندگی میں سارے رشتے بے نام ہی ٹھہرے ہیں، جنہیں وہ اپنا سمجھتی تھی۔وہ اسی ادھیڑ بن میں اپنے آفس پہنچ گئی۔

شہر کی معروف اور مصروف ترین شاہراہ پر اس نیوز چینل کی عمارت تھی، جس میں مائرہ کام کرتی تھی۔اس وقت وہ نیوز چینل کیامالک کے آفس کی طرف جارہی تھی۔باس نے اسے بلایا تھا۔اس وقت باس اپنے لیپ ٹاپ کی اسکرین کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا، جس دوران مائرہ اُس کے آفس میں داخل ہوئی۔باس نے سر اٹھا کر دیکھا تو بہت زیادہ خوشی اور احترام کا اظہار کرتے ہوئے بولا

”ویل ڈن مائرہ، بہت خوب، میں نے رات تمہاری یہ Investigative رپورٹ دیکھی، کمال کر دیا، کیا دھجیاں اڑائیں ہیں تم نے ان سیاست دانوں کی۔ بے نقاب کر کے رکھ دیا، رات سے فون پر فون آرہے ہیں اُن کے۔ آؤ۔! آؤ پلیز بیٹھو“ اس نے اپنے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ بیٹھتے ہوئے بولی

”تھینک یو سر۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ ایک پروفیشنل جرنلسٹ کی طرح کام کروں۔“

”میں جانتا ہوں کہ یہ جو تمہاری نت نئی ایڈونچر سٹوریز ہیں۔۔۔ نیوز کی دنیا میں اپریشیٹ (Aprichat) کی جا رہی ہے۔ تمہارا کام دیکھا جا رہا ہے۔۔۔ تمہاری محنت نظر آرہی ہے۔“ اس نے ایک نظر لیپ ٹاپ پر دیکھتے ہوئے خوش ہو کر کہا

”تھینک یو سر۔ میں ایسے ہی محنت کرتی رہوں گی۔“ وہ ممنونیت سے بولی

”اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ تم بہت ساری کامیابیاں سمیٹو گی۔ میں نے تمہارے کام سے جو اب تک Abservie کیا ہے وہ یہی ہے کہ تم عام لڑکیوں سے زیادہ بہادر ہو۔“ اس نے مائرہ کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا جہاں اعتماد کے دیئے روشن تھے۔ اس پر وہ سنجیدگی سے بولی

”جھوٹ انسان کو کمزور کر دیتا ہے سر، اور سچ۔۔۔ انسان کو بہت حوصلہ دیتا ہے، ہمت دیتا ہے۔ میں نے ہمیشہ سچ کا ساتھ دیا ہے۔ میں نہیں ڈرتی کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ کیونکہ مجھے یقین ہے، جیت ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے۔“

”مائرہ۔۔۔! تمہارا واسطہ اِن سیاست دانوں سے ہے جن کے کالے کرتوت تم عوام کے سامنے لے آتی ہو۔ وہ اپنی خباثت سے تمہارے خلاف کسی سازش کا جال بُن سکتے ہیں اپنے انتقام کا نشانہ بنانے کے لئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔۔۔ یہ کبھی سوچا تم نے۔۔؟“ باس نے سمجھانے والے انداز میں پوچھا تو وہ ہنستے ہوئے بولی

”نہیں۔۔۔ اور میں کبھی سوچنا بھی نہیں چاہتی۔۔۔ کیونکہ میں سچ پر یقین رکھتی ہوں۔“

”مجھے فکر ہے مائرہ کیونکہ تم اس چینل کا حصہ ہو۔۔میں اور یہ چینل ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔تم کبھی بھی خود کو تنہا مت سمجھنا۔اگر ایسی کوئی صورت ہوئی تو ہم تمہارے ساتھ کھڑے ہیں۔“ باس نے پر یقین لہجے میں کہا

”تھینک یو سر۔۔“ اس نے عام سے انداز میں کہا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ سب پروفیشنل باتیں ہیں۔جبکہ باس کہہ رہا تھا

”کسی بھی چیز کی ضروت ہو،کوئی مشکل محسوس کرو تو فوراً مجھے بتانا“

مائرہ نے اس پر خوشگوار انداز لہجے میں کہا

”جی میں بالکل بتاؤں گی،اجازت؟“ اس نے تقریباً اٹھتے ہوئے کہا

”اوکے۔وش یو گڈ لک۔۔“ باس نے خوش ہو کر کہا جسے سن کر وہ مسکراتے ہوئے واپس پلٹ گئی۔

مائرہ اپنے کمرے میں آکر اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی لیپ ٹاپ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ تبھی دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تو مائرہ نے چونک کر اُدھر دیکھا۔دروازے میں جعفر رضا موجود تھا۔وہ اس کا کلاس فیلو اور بہترین دوست تھا۔وہ،فہد اور جعفر،ان تینوں کا ٹرائی اینگل پورے کالج میں مشہور تھا۔جعفر اور فہد نے پولیس ٹریننگ اکھٹے لی۔فہد نے تو جاب نہ کی مگر جعفر اے ایس پی کی پوسٹ پر کام کر رہا تھا۔مائرہ اس کی طرف دیکھ کر دل سے مسکرادی تو وہ بولا

”کیا میں اندر آکر آپ کی تنہائی میں مخل ہو سکتا ہوں۔“

تبھی مائرہ نے خوشگوار انداز میں کہا

”اُو۔!جعفر تم۔۔تنہائی میں مخل تو ہو ہی گئے ہو۔اب آجاؤ۔۔۔“

”ذرہ نوازی ہے آپ کی،ورنہ بندہ کس قابل ہے“ یہ کہتے ہوئے وہ اندر آگیا اور سامنے والی سیٹ پر بیٹھ کر بولا،”

ویسے لگتا نہیں تم اتنی مصروف ہو جتنا تم دکھائی دے رہی ہو۔وہی پرانی بات۔۔۔ Look busy do nothing

مطلب کرنا، کچھ نہیں اور مصروف دکھائی دینا ہے“

”تم لوگوں کو کیا پتہ کہ مصروفیت کیا ہوتی ہے۔ ایک وہ فہد ہے جو کچھ نہیں کرتا مگر اسے بھی فرصت ہی نہیں ملتی ہے ۔اور تم۔۔ اتنے دن سے کہاں غائب ہو۔ نہ فون کیا اور نہ آئے ہو۔“ اس نے شکوہ کرتے ہوئے کہا تبھی وہ کاندھے اچکاتے ہوئے بولا،

”میں اُس فہد کے بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ مگر میری تو ایک سپیشل اسائنمنٹ تھی، کچھ ڈرگز اور اس طرح کی سرگرمیوں میں ملوث گروہ تھا۔ انہی کو پکڑنے میں مصروف تھا۔ اور وہ پکڑ لئے ہیں۔ لگتا ہے کوئی میڈل شیڈل مل جائے گا۔“

واؤ۔۔۔ فنٹاسٹک۔۔۔ جعفر تم تو اچھے بھلے پولیس والے بن گئے ہو۔ خوب ڈز، ڈز ہوئی ہو گی۔ اچھا ایک بات بتاؤ۔۔ سی ایس پی پولیس آفیسر بن کر کیسا محسوس کر رہے ہو؟“ مائرہ نے حیرت بھری خوشگواریت سے پوچھا تو جعفر ذرا سنجیدگی سے بولا

”ایک پولیس آفیسر چاہے تو اپنی رینج میں جرائم کا خاتمہ کر سکتا ہے۔“ پھر ایک دم مذاق میں موڈ میں بولا” اور میں۔۔ میں نے یہ نوکری محض انجوائے کرنے کے لیے کی ہے۔ لوگوں پر رعب شوب جماؤ۔۔۔ پیسہ کماؤ۔۔۔ ویسے۔! جب پیسہ آجاتا ہے نا تو بندہ، مادیت پرست ہو جاتا ہے۔ اس میں زندگی کے لطیف احساسات۔۔۔“

”اچھا چپ کرو۔۔۔ مجھے تمہاری تقریر نہیں سننی۔۔۔“ وہ ایک دم سے اُکتاتے ہوئے بولی، پھر لمحہ بھر ٹھہر کر بولی” تمہیں کامیابی مبارک ہو۔ کالج دور میں یہ تو نہیں لگتا تھا کہ تم کوئی دھانسو قسم کہ آفیسر بنو گے۔ اب تم ویسے پولیس آفیسر بن گئے ہو۔ اور مجھے پتہ ہے تیرے جیسے بہادر اور ایماندار پولیس آفیسر کی اس معاشرے کو بہت ضرورت ہے۔“ وہ کہتے ہوئے ایک دم رُکی اور پھر بولی،” اچھا ایک بات بتاؤ “

"پوچھو۔۔!" اس نے مائرہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

"مجھے یہ بات آج تک سمجھ نہیں آیا کہ۔۔۔ فہد نے تمہاری طرح، تمہارے ساتھ پولیس کو جوائن کیا۔۔Asp آفیسر بھیبنا۔۔۔ اور اچانک سب کچھ چھوڑ کر ریزائن کر دیا۔ اگر اس نے یہ جاب چھوڑنا ہی تھا۔۔ تو اتنی مشکل سے کیوں گزرا۔۔ مطلب سی ایس ایس کیا۔۔۔ ٹرینگ کی۔۔۔" اس کے لہجے میں حیرت تھی، جس پر وہ عام سے انداز میں بولا

"سچ پوچھو نا مائرہ مجھے بھی آج تک سمجھ نہیں آسکی۔ میں نے ایک دو بار پوچھا تو وہ ٹال گیا۔ کچھ بھی نہیں بتایا مجھے۔"

"جعفر کیا تم نے Feel کیا ہے کہ آج کل وہ ہم سے مل نہیں رہا۔۔ فون کرو تو ٹھیک سے بات نہیں کرتا۔۔۔ کئی کئی دن غائب رہتا ہے۔۔۔ کوئی پرابلم تو نہیں چل رہا اس کے ساتھ؟" اس نے محتاط انداز میں پوچھا

"اب تم یقین کرو گی۔۔۔ مجھے ملے بھی کافی دن ہو گئی ہیں۔۔۔ میں اس۔۔۔" اُس نے کہنا چاہا تو وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے ناراضگی سے بولی

"تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کہ نہیں۔۔۔"

"وہ کہتے ہیں نا جو بندہ محبت میں ناکام ہو جائے تو وہ شاعر بن جاتا ہے۔ اور جو محبت کرنے کی ہمت کر رہا ہو۔۔۔ وہ میرے جیسا پولیس آفیسر بن جاتا ہے۔ مطلب میرے جیسا Asp ۔۔ جسے شاید اپنی بات کہنی نہیں آتی۔۔۔ اب وہ بے چارہ الہام کہاں سے جانے گا۔" اس کے یوں کہنے پر مائرہ ہنستے ہوئے بولی

"تمہاری یہ Explanation نہایت فضول ہے۔ یوں لگ رہا جیسے محبت کرنے کے لئے بھی۔۔۔ با قاعدہ پلان کرنا ہوتا ہے۔"

"تمہیں کیا پتہ۔۔۔ کون اپنے دل میں کیا لئے بیٹھا ہے۔ اینی ہاؤ(Any haow)۔ ہماری روایات میں مہمان نوازی بھی ہے، اور۔۔۔ چاہو تو ساتھ میں کچھ کھانے کے لئے منگوا لو، میں مائنڈ نہیں کروں گا۔۔" اس مصنوئی بے چارگی

سے کہا تو ہنس دی

"کبھی تو سیریس ہو جایا کرو۔۔۔ بولو۔! چائے یا کافی، کیا پیئو گے۔" یہ کہہ کر وہ انٹر کام کے ریسور کی جانب متوجہ ہو گئی۔ پھر کچن میں آرڈر دینے کے بعد اس کی طرف دیکھ کر بولی

جعفر، میں نے تمہیں فون کر کے اس لئے بلایا ہے کہ تم سے کچھ باتیں کر سکوں۔" اتنا کہ کر وہ لمحہ بھر کو تذبذب کی حالت میں خاموش رہی پھر بولی "دیکھو۔! جب ہم پڑھتے تھے تب بھی اور اب بھی میں اپنی پریشانی تم ہی سے شیئر کرتی ہوں۔"

"کہو۔! کیا کہنا چاہتی ہو۔ میں سن رہا ہوں۔" وہ پوری سنجیدگی سے بولا، تو وہ کہنے لگی

"میں فہد سے ملی تھی۔ وہ مجھے بہت پریشان لگا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا بھی لیکن وہ مجھے ٹال گیا ہے۔ کیا وجہ ہے، کیوں ڈیپریس ہے وہ آج کل؟"

"مجھے پہلے ہی یقین تھا۔ تم اسی کی بات کرو گی۔ خیر Feel تو میں نے بھی کیا ہے۔ مگر اس معاملے میں اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی، سو۔! میں نہیں جانتا کہ اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ ہم اسے کالج لائف سے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی پریشانی لگی رہتی ہے، اپنی نہ ہو تو کسی دوسرے کی ہوتی ہے۔" وہ کافی حد تک اکتائے ہوئے لہجے میں بولا

"تم یہ بھی جانتے ہو جعفر۔ میں اس سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ وہ مجھے اہمیت تو دیتا ہے لیکن میری محبت کا جواب محبت سے نہیں دیتا۔ کچھ دنوں سے تو اتنا سنگدل بن گیا ہے کہ بالکل اجنبی دکھائی دیتا ہے۔ ایسا کیوں ہے جعفر؟"

اس کے یوں کہنے پر وہ چونکتے ہوئے بولا

"سچ پوچھو نامائرہ۔! ہم میں کبھی اس موضوع پر بات نہیں ہوئی۔ اس نے مجھے کبھی نہیں کہا کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے یا

نہیں کرتا۔"

اس بار چونکنے کی باری مائرہ کی تھی۔ وہ پریشان لہجے میں بولی

"میں یہ نہیں مان سکتی۔ وہ تمہارا بہترین دوست ہے۔ تم نے اکھٹے تعلیم حاصل کی۔ دونوں نے مل کر پولیس ٹریننگ لی ۔وہ اپنے سارے راز و نیاز تم سے کرتا ہے۔ تو پھر یہ بات تم سے کیوں نہیں کہتا۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

"یہ سچ ہے کہ وہ اپنی ساری باتیں مجھ سے ہی کرتا ہے۔ مگر میرا یقین کرو۔ اور دیکھو، تعلیم تو۔۔ تم نے بھی ہمارے ساتھ حاصل کی ہے۔۔۔ اس نے پولیس ٹریننگ کر کے نوکری نہیں۔۔۔ کیا اس کی وجہ ہمیں بتائی۔۔ اسی طرح اس نے اپنی محبت کے بارے میں کبھی مجھ سے بات نہیں کی۔ اور نہ میں نے کبھی پوچھا۔" اس نے مائرہ کو یقین دلاتے ہوئے کہا

"کیوں۔؟" اس نے احتجاج بھرے لہجے میں پوچھا جس پر جعفر نے ہولے سے کہا

"مجھے اس کی ذاتی زندگی کے بارے میں تجسس کرنے کا کوئی حق نہیں۔ مجھے اپنے دوست پر مان بھی ہے۔ اگر اس نے کبھی اپنا یہ راز شیئر کرنا چاہا تو مجھ سے ہی کرے گا۔ ویسے ایک بات کہوں۔۔ میرے خیال میں محبت جتائی نہیں جاتی۔ یہ تو خوشبو کی مانند اپنا آپ منوا لیتی ہے۔"

جعفر کے لہجے میں اک عجیب اپنائیت بھرا احساس تھا، جس پر وہ چونکے بغیر نہ رہ سکی، وہ چند لمحے اس کی بات کے حصار میں رہی، پھر خود پر قابو پا کر بولی

"چلو میری محبت والا معاملہ تو چھوڑو۔ اس کی پریشانی کے بارے میں پوچھ سکتے ہو۔ وہ کس مشکل وقت سے گذر رہا ہے۔ کسی مشکل وقت کے لیے دوست ہی کام آتے ہیں۔"

"اُس وقت مائرہ۔! جب دوست مدد کے لئے پکارے۔ ورنہ یہ کسی کی ذاتی زندگی میں دخل اندازی ہے۔ میں اس کا

دوست ہوں، جاسوس نہیں۔" اس نے پر سکون لہجے میں کہا تو مائرہ اکتاہٹ اور بے بسی میں بولی

"یہ تم فضول بات کر رہے ہو۔ بس تم اس سے پوچھو۔ وہ پریشان کیوں ہے۔ مجھ سے بحث مت کرو۔"

"تم کہتی ہو تو میں کوشش کر لیتا ہوں۔ کل اگر اس نے شکوہ دیا تو جواب دہ تم ہو گی، میں نہیں۔" وہ صاف انداز میں

بولا تو مائرہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولی

اچھا۔! ٹھیک ہے۔"

تبھی جعفر نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا

"جو تمہارا دل چاہے۔ میں تو وہی چاہوں گا نا۔ جو تم چاہتی ہو۔۔"

اس کے یوں کہنے پر مائرہ نے ایک لمحے کے لئے اس کی جانب دیکھا ہے اور کچھ کہنا چاہا تبھی ویٹر ان کا آرڈر لے کر آ گیا۔

دونوں اپنی اپنی سوچوں میں الجھے کھانے پینے لگے۔ کمرے کا ماحول ایک دم سے بوجھل ہو گیا تھا۔

☆۔۔۔ث۔۔۔ظ

قسمت نگر میں بھی ہر گاؤں کی طرح وہ ایک چوراہا تھا۔ اس چوراہے کے درمیان میں بہت قدیم بَڑ کا درخت تھا، جس

کی گھنی چھاؤں میں گاؤں کے وہ لوگ آ کر بیٹھے رہتے جنہیں کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ وہ یا تو بالکل فارغ ہوتے اور سارا

دن تاش اور کنتوری کھیلتے رہتے۔ باقی ان کا کھیل دیکھنے جمع ہو جاتے۔ کچھ گپیں لگانے، ستانے اور وقت پاس کرنے

وہاں آ جاتے۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں سے ہر طرح کی خبر مل جاتی تھی۔ کن سوئیاں لینے والے لوگ تو یہاں ضرور

موجود رہتے تھے۔ گاؤں کے اس چوراہے میں ایک طرف مسجد تھی اور اس سے ملحقہ دوکانیں تھیں، وہاں بھی لوگ

آتے جاتے تھے اور بیٹھے رہتے تھے۔ صبح روشن ہو چکی تھی۔ اس وقت بھی بَڑ کے درخت کے نیچے کچھ لوگ پاس بیٹھے

ہوئے ہیں۔ ان میں گپ شپ چل رہی تھی۔ کچھ تاش اور کنتوری کھیلنے کے لئے پر تول رہے تھے۔ ایسے میں ان کے

عقب سے اشفاق عرف چھاکا بغل میں اپنا مرغا دبائے تیز تیز چلتا آ رہا تھا۔ پتلے سے بدن والا، سانولے رنگ کا، موٹے نین نقش، گھنگریالے بال، میانہ قد اور عام سی شلوار قمیص پہنے ہوئے تھا۔ غربت کا احساس اسے دیکھ کر ہی ہو جاتا تھا۔ وہ اپنی آپ میں مست تھا۔ وہ سیدھا حنیف دوکان دار کے پاس گیا اور جلدی سے ایک چھوٹا نوٹ بڑھاتے ہوئے، اپنے مرغے کی طرف دیکھ کر بولا

"بادام دے میرے اِس شہزادے کے لیے۔ ذرا کشمش بھی دینا ساتھ میں۔"

اس کے یوں کہنے پر حنیف دوکاندار نے اُسے گھور کر دیکھا، پھر اُکتائے ہوئے لہجے میں نصیحت کرنے والے انداز میں کہا

"اُوئے، کچھ تو بھی کھالیا کر، اپنی صحت دیکھو ذرا۔ اِسے ہی کھلاتا رہتا ہے۔"

حنیف دوکاندار نے کہا ہی تھا کہ مرغا بول پڑا، چھاکے نے حنیف کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے مرغے سے مخاطب ہو کر کہا

"او صبر کر، تو بادام ہی کھائے گا۔ یہ تو اویں سیانا بننے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔"

"ہاں جیسے تُو، تو بڑا سیانا ہے، سارا دن ان ککڑوں کے پیچھے خجل خراب ہوتا رہتا ہے۔" اس بار اُس کے لہجے میں سے غصہ چھلک پڑا تھا۔ تب چھاکے نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا

"یہ بات نہ کر، اک ہی تے میں ہوں اس پنڈ میں، جس کی سارے علاقے میں دس پچھ ہے۔ اپنا یہ ککڑ سارے علاقے کا چیمپین ہے، پتہ بھی ہے تجھے؟"

"اُوہاں خاک دَس پچھ ہے۔ وہ امین آرئیں کے بارے میں پتہ ہے کیا ہوا، اس کے ساتھ، وہ کل سے غائب ہو گیا ہے۔ اس کا کوئی اتہ پتہ ہی نہیں چل رہا ہے۔" اس بار حنیف نے ادھر ادھر دیکھ کر اسے نئی خبر سے آگاہ کیا۔ اس پر چھاکے

نے کوئی توجہ نہ دیتے ہوئےعام سے انداز میں تبصرہ کیا

''اس نے غائب کہاں ہونا ہے۔ چوہدریوں کا کوئی نیا ظلم ہو گا اور وہ کر بھی کیا سکتے ہیں۔ امین نے بھی تو اُن کے خلاف گواہی دینا تھی نا۔ اب وہ غائب نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا۔''

''اس کے گھر والے پریشان ہیں۔ سنا ہے کہ اس کا بھائی سراج بھی شہر سے آ رہا ہے۔'' وہ مصنوعی پریشانی سے بولا

''اوئے سیانے، ایک پرانی مثال ہے کہ اونٹ رکھنے والوں سے یاری ہونا تو اپنے گھر کے دروازے بڑے اور اونچے رکھنے پڑتے ہیں، امین بے چارے کو کیا معلوم کے یہ چوہدری کیا شے ہیں۔ سراج اگر آ بھی گیا تو وہ کیا کر لے گا؟'' چھاکے نے طنزیہ انداز میں سر مارتے ہوئے کہا تو حنیف دوکاندار بات سمجھتے ہوئے بولا

''بات تو تم ٹھیک کہتے ہو۔ اب ان کا سارا گھر بھی رُل جائے گا۔ سیدھی سی بات ہے، یہ چوہدریوں کے ساتھ دشمنی تو نہیں لے سکتے، کوشش کریں گے تو۔۔'' یہ کہتے کہتے وہ خوف زدہ انداز میں رُک گیا تو چھاکا طنزیہ لہجے میں بولا

''اُو تو بھی چپ کر، کہیں تم بھی چوہدریوں کے عتاب میں نہ آ جاؤ۔'' اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس کا مرغا پھر بول پڑا، چھاکا اس سے مخاطب ہو کر بولا، ''اُوئے صبر کر اُوئے صبر، بادام ہی دیتا ہوں، اُولا یار بادام، میرا شہزادہ ناراض ہو رہا ہے۔''

اس پر حنیف دوکان دار نے پہلے چھاکے کے چہرے پر پھر اس کے مرغے پر قہر آلود نگاہ ڈال کر اپنی دوکان کے اندر کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر بعد واپس آیا تو اس نے بادام ایک لفافے میں ڈال کے اسے تھما دیئے۔ چھاکا اسے لیکر چل دیا۔
اگرچہ سارے گاؤں میں یہ خبر بڑے تجسس کے ساتھ سنی گئی تھی۔ ہر کوئی اس کے بارے میں مزید جاننے کا خواہش مند تھا، لیکن چھاکے کو دیکھ کر یوں لگا تھا کہ جیسے اسے ان معاملات کی کوئی پروا نہیں ہے اور وہ اپنی دنیا میں مست تھا۔ چھاکا، تھا بھی ایسا ہی، وہ واقعتاً اپنی دنیا میں مست رہتا تھا۔ کبھی دل کیا تو مزدوری کر لی ورنہ وہ ہوتا اور اس کا مرغا، جس

کو لڑانے کی تیاری میں لگا رہتا تھا۔ خود کم کھاتا اور اپنے مرغے کو زیادہ کھلاتا تھا۔ اس دنیا میں اس کے باپ کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ جو پورے گاؤں میں چاچا سوہنا کے نام سے مشہور تھا۔ چھاکے کی طرح اسے بھی کھانے کمانے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ جب ضرورت ہوئی تھوڑا بہت کما لیا ورنہ سارا دن گاؤں کے چوراہے میں بیٹھا تاش کھیلتا رہتا تھا۔ پہلے کبھی وہ تانگہ چلایا کرتا تھا۔ اچھی بھلی آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔ مدت ہوئی اس نے یہ کام چھوڑ دیا تھا۔ چھاکا جس قدر اپنے آپ سے بیگانہ اور مست رہنے والا نوجوان تھا، اس کا باپ چاچا سوہنا اسی قدر اپنی نک سک ہر وقت درست رکھتا تھا۔ عرصہ ہوا چھاکے کی ماں اللہ کو پیاری ہو چکی تھی۔ سو ان کا گھر کیا تھا۔ بس رات کو سونے ہی کی جگہ تھی۔ سامان کے نام پر ضرورت کی چند اشیاء تھیں۔ اس وقت چھاکا اپنے گھر میں داخل ہوا تو سامنے صحن والے آئینے کے سامنے کھڑا چاچا سوہنا اپنے بال سنوارتے ہوئے گنگنا رہا تھا۔

”چھیتی بوڑیں وے طبیباں نہئی تے میں مر گئی آ، تیرے عشق نچایا کر کے تھیا تھیا۔۔۔“

چھاکا اندر آ کر غور سے اپنے باپ کو دیکھنے لگا۔ چند لمحے یونہی گھورتے رہنے کے بعد بڑے عجیب سے طنزیہ لہجے میں بولا ”اُوے ابا۔۔۔ تمیز کر۔۔۔ اس عمر میں یہ کیا کر رہا ہے۔ تو کوئی اللہ اللہ کر۔۔۔ مسجد جایا کر۔۔۔ تجھے اپنے شیر ورگے پتر کا خیال نہیں کہ وہ پنڈ میں بے عزت بھی ہو سکتا ہے، حالانکہ ایک ہی چھاکا ہے اس پنڈ میں جس کی سارے علاقے میں دَس پوچھ ہے۔ تُو اس کی دَس پچھ خراب کرنا چاہتا ہے“

چھاکے کے یوں کہنے پر چاچے سوہنے نے پہلے اُسے گھور کر دیکھا، پھر بُرا سا منہ بنا کر طنزیہ انداز میں کہا

”اوئے کھّیہ تے سَواہ۔۔۔ تیری دس پوچھ کو میں نے چٹنا ہے۔ جب تیرے جیسی اولاد اپنے باپ کے کام ہی نہیں آ سکتی۔ سارا دن اس ککڑ کو بغل میں لے کر گھومتا رہتا ہے۔ اپنے باپ کا ذرا خیال نہیں ہے تجھے۔“

”نہ ابا، مجھے بتا، میں تیرا کیا خیال نہیں کرتا۔ تیرا سارا خرچہ میں دیتا ہوں، تجھے کمانے کی کوئی فکر نہیں اور یہ سر کا چیر

نکال کر سارا دن لُور لُور پنڈ کی گلیوں میں پھرتا ہے، بتا کیا خیال نہیں کرتا؟" چھاکے نے بھنّا کر پوچھا تو چاچا سوہنا درد مند لہجے میں بولا

"نہ پتر، تیرا دل نہیں کرتا کہ تو گھر آئے، سچّی روٹی پکی ہوئی ہو، بسترے وِشّے ہوئے ہوں، گھر صاف ستھرا چمکتا ہوا ہو، "

"میں جانتا ہوں تو میری شادی کرنا چاہتا ہے میں۔۔۔" اس نے شرماتے ہوئے کہنا چاہا تو چاچا سوہنا اس کی بات کاٹتے ہوئے تڑپ کر بولا

"اُو، کون تیری شادی کی بات کر رہا ہے، میری طرف دیکھ، میں کب تک یوں جوان جہان پنڈ میں اکیلا پھرتا رہوں، تیرا جی نہیں کرتا کہ تیری ماں ہو اس گھر میں ؟"

"بس ابا۔۔۔ آگے ایک لفظ مت کہنا۔۔۔ کہیں چھاکے کی دَس پوچھ کے ساتھ اس کی بے عزتی نہ کروا دینا، آخر میری بھی کوئی عزت ہے۔" اس نے پوری سنجیدگی سے کہا

"میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔۔۔ بہت جلدی تُو دیکھ لے گا۔۔۔" وہ حتمی لہجے میں بولا، پھر گھور کر چھاکے کو دیکھتا ہوا وہ باہر کی جانب چلا گیا۔ چھاکا اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ایسے میں ککڑ بول پڑا تو چھاکا انتہائی غصے اور بے بسی میں اُس پر برس پڑا

"اُوئے تُوتے چپ کر اُوئے۔۔۔"

تبھی ککڑ اس سے ہاتھ سے نکل کر یوں بھاگ گیا جیسے وہ اس سے ناراض ہو گیا ہو۔ وہ چند لمحے مرغے کو دیکھتا رہا پھر چارپائی پر بیٹھ کر اپنے گھر کی ویرانی کو دیکھنے لگا۔ اس کی سرد آہ نکل گئی۔

☆۔۔۔ژ۔۔۔ظ

رُوشن صبح کی سنہری کرنیں سلمٰی پر بھی پڑ رہی تھیں جو اس وقت کچھ اور لوگوں کے ساتھ سٹاپ پر کھڑی کسی کنوینس

کی منتظر تھی۔ وہ پہلی بار اپنے گھر سے کمانے کی غرض سے نکلی تھی۔ اس کا یہ خواب بہت عرصے بعد پورا ہونے والا تھا۔ کتنی تگ ودو کی تھی اس نے، نامساعد حالات میں بھی اس نے تعلیم کو جاری رکھا تھا۔ قریبی گاؤں کے لڑکیوں والے سکول سے آٹھ جماعت پاس کر لینے کے بعد اس نے گھر بیٹھ کر ہیتیاری کی اور پڑھتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے بی اے کر لیا۔ پھر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی ہی سے بی ایڈ کر چکی تو استانی بن کر اپنے گھر کی معاشی حالت کو سہارا دینے کا شدت سے سوچنے لگی۔ کچھ عرصہ ہی گذرا تھا، اس نے انٹرویو دیا تھا، جس کے جواب میں اسے کال لیٹر آ گیا۔ اور اُس دن وہ قریب ہی کے قصبے نور پور میں یہ جاب جوائن کرنے جا رہی تھی۔ ابھی تک کوئی وین یا بس نہیں آئی تھی۔ اور وہ خود کو بڑی ساری چادر میں لپیٹے سٹاپ پر کھڑی تھی۔

ایسے میں چوہدری کبیر کی جیپ زَن سے اس کے قریب سے گزر گئی۔ سلمی کو معلوم نہیں تھا کہ اس میں کون ہے۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کے قریب سے کون گذر گیا ہے۔ یہ تب اُسے معلوم ہوا جب وہی جیپ بیک ہو کر اس کے قریب آن رکی۔ چوہدری کبیر نے دروازہ کھولا اور بڑی پرشوق نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ سلمی نے ایک نگاہ اسے دیکھا پھر نفرت سے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ چوہدری کبیر کو دیکھ کر وہاں سٹاپ پر موجود لوگ دھیرے دھیرے کھسکنے لگے۔ وہ اپنی جیپ میں سے نکلا، اس نے اپنی آنکھوں سے بلیک ریبین اتاری اور سیٹ پر پھینک کر سلمی کی طرف بڑھنے لگا۔۔ وہ سلمی کو اپنی نگاہوں کے حصار میں لئے ہوئے تھا۔ وہ اس کے قریب جا کر بڑے سوقیانہ لہجے میں بولا

”لگتا ہے نور پور جانے کی تیاریاں ہیں۔ آؤ، میں تجھے چھوڑ دوں۔“ اس کے یوں کہنے پر سلمٰی نے اسے نفرت بھری نظروں سے دیکھا اور منہ پھیر لیا، تب چوہدری کبیر مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”یہ فائلیں۔۔۔ اور یہ نور پور جانے کی تیاری۔۔۔ تو میں نے ٹھیک سنا۔۔۔ تم نوکری کرنے جا رہی ہو۔“ وہ کہہ رہا تھا مگر

سلمی خاموش تھی۔بس چہرے پر شدید غصے کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ گھما کے تھپڑ اس کے منہ پر دے مارے، جبکہ وہ اسی انداز میں کہتا چلا گیا، ”تمہیں نوکری کی کیا ضرورت ہے، تم تو خود شہزادی ہو۔ تمہیں پتہ ہی نہیں تم کیا چیز ہو۔ میں۔۔۔“

وہ حد سے بڑھنے لگا تو سلمٰی نے دبے دبے غصے میں دانت پیستے ہوئے کہا

”اپنی زبان کو لگام دو چوہدری۔۔۔اور جاؤ، چلے جاؤ یہاں سے۔“

چوہدری کبیر قہقہہ لگا کر بولا

”تم جانتی ہو سلمٰی۔ جس جگہ ہم کھڑے ہیں یہ ہماری زمین ہے، کہاں چلا جاؤں میں۔۔۔تم کہو تو اس جگہ کی مالکن بنا دوں تمہیں۔۔پھر کہہ سکتی ہو مجھے۔“

”میں تمہارے منہ نہیں لگنا چاہتی۔“ سلمی نے بے بسی سے کہا

”اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ میری مرضی کے بغیر تم نوکری نہیں کر سکتی۔لاؤ۔! یہ کاغذات مجھے دو۔میں تمہاری نوکری لگوا دیتا ہوں۔۔۔اور تمہیں کہیں جانے کی ضرورت بھی نہیں۔۔۔ تمہیں گھر بیٹھے تنخواہ مل جایا کرے گی۔جاؤ واپس چلی جاؤ گھر“ اس نے ہاتھ بڑھا کر کاغذات مانگتے ہوئے کہا تو وہ طنزیہ انداز میں بولی

”میری نوکری لگ گئی ہے اور میں آج پہلے دن جوائن کرنے جا رہی ہوں۔مجھے تمہاری کسی ہمدردی کی ضرورت نہیں۔“

”کہا نا کاغذات دو اور واپس جاؤ۔ تمہیں نوکری نہیں کرنی۔“چوہدری کبیر نے عجیب سے لہجے میں کہا

”کیوں۔؟تم کون ہوتے ہو۔“ وہ تڑک کر بولی۔اسے واقعتاً شدید غصہ آ گیا تھا

”میں۔۔۔!“ یہ کہتے ہوئے اس نے قہقہہ لگایا اور پھر مخمور انداز میں بولا،”میں تمہیں پسند کرتا ہوں اور میں نہیں چاہتا

کہ تم یہ چھوٹی موٹی نوکری کے لئے دھکے کھاتی پھرو۔۔۔جسے میں پسند کروں اور وہ نوکریاں کرتی پھرے، ایسا تو نہیں ہو سکتا، جانِ من"

"چوہدری۔۔۔" سلمیٰ نے انتہائی غصے میں تڑپ کر کہتے ہوئے وہ تھپڑ مارنے کو آگے بڑھی ہی تھی کہ چوہدری کبیر کے ایک ملازم نے جیپ میں بیٹھے ہی ہوائی فائر کر دیا۔ باقی دو اسلحہ برداروں نے اس پر گنیں تان لیں۔ وہ سہم کر رک گئی۔ چوہدری کبیر نے اپنے بندوں کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور اس کی طرف پر شوق نگاہوں سے دیکھتا ہوا مسکرا کر بولا

"تمہارا یہی غصہ تو مجھے اچھا لگتا ہے۔"

"ایک کمزور لڑکی کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے تمہیں شرم آنی چاہئے چوہدری کبیر" سلمیٰ نے ہتک آمیز لہجے میں کہا تو اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے، تبھی اس نے دبے دبے غصے میں کہا

"میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا سلمیٰ۔ کیوں سنایا، یہ تم اچھی طرح جانتی ہو۔ واپس پلٹ جاؤ۔"

"میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔۔۔ تم مجھے نہیں روک سکتے۔۔۔ میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی۔" اس نے کافی حد تک خوف سے نکلتے ہوئے ضدی لہجے میں کہا

"ضد مت کرو سلمیٰ۔۔۔ اور واپس پلٹ جاؤ۔ میری بات مان لو۔" اس نے پھر بڑے سکون سے سمجھانے والے انداز میں کہا

"کیا کر لو گے تم۔۔۔ قتل کر دو گے نا۔۔۔ تو کر دو۔۔۔" سلمیٰ نے سارے خوف اور ڈر کو اُتارتے ہوئے کہا، اس کی نگاہوں میں نفرت بھرے شعلے نکل رہے تھے۔ جس پر وہ مسکراتے ہوئے بولا

"میں تمہیں قتل کر ہی نہیں سکتا سلمیٰ۔۔۔ تم نے جو مجھے قتل کر دیا ہے۔۔۔ میں تو صرف نوکری کرنے سے روک رہا ہوں اور وہ میں تجھے روک لوں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اچانک اس کی فائل پکڑ لی۔ ان میں کاغذات دیکھتے ہوئے

اس میں سے ایک سفید رنگ کا لفافہ نکال کر اسے پھاڑا اور اس کے پرزے پرزے کر کے زمین پر پھینک دیئے۔ سلمی ہکابکا رہ گئی۔ " اگر اب بھی تم نے نوکری کرنے کا سوچانا، تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو گا۔" یہ کہتے ہوئے وہ پلٹ کر جیپ میں بیٹھ گیا اور اسے آگے بڑھالی۔ سلمی وہیں روتے ہوئے سسکنے لگی۔

چوہدری کبیر کو اس کے خاص ماکھے ملازم ماکھے نے جو خبر دی تھی وہ بالکل درست تھی۔ اسی لئے وہ صبح ہی صبح اس سٹاپ پر آیا تھا کہ سلمی کو یہ باور کرا سکے کہ وہ اس کے کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتی ہے۔ اگرچہ اسے سسکتی ہوئی سلمی اچھی نہیں لگی تھی، مگر ایسا کرنا ضروری تھا۔ پورے علاقے کی یہی ایک لڑکی تھی جس پر وہ مرمٹا تھا۔ ایک ظالم، بدتمیز اور بے حس جاگیر دار ہونے کی وجہ سے یہ انہونی سی بات لگتی تھی، مگر ایسا نجانے کب ہوا، اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ نجانے کتنی کلیاں اس نے مسل ڈالیں تھیں، اسے یہ دسترس بھی تھی کہ وہ جب چاہے اسے اٹھا کر اپنے ڈیرے پر ڈال سکتا تھا۔ مگر اس نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اس کی چاہت کا طلب گار تھا، وہ یہی سوچتا ہوا حویلی کیطرف جا رہا تھا۔ جہاں اس کے والدین اس کے بارے میں کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔

چوہدری جلال حویلی کے کاریڈور میں ٹہل رہا ہے۔ وہ پُر سکون سا ہے۔ تبھی اس کی بیوی بشریٰ بیگم نے اسے دیکھا اور پھر آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ کر رک گئی۔ چوہدری جلال اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا تو بشریٰ بیگم نے گہری سنجیدگی سے پوچھا

"کیا بات ہے چوہدری صاحب! بڑی گہری سوچ میں ہیں آپ؟"

"ہاں بیگم۔! میں یہ سوچ رہا ہوں زندگی کے راستے پر چلتے چلتے اچانک یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم کتنا طویل سفر طے کر آئے ہیں اور نجانے باقی کتنا سفر باقی ہے۔" وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا تو بشریٰ بیگم کو عجیب سا لگا۔ اس کا شوہر پہلے کبھی ایسے نہیں سوچا کرتا تھا، اس لئے تشویش سے کہا

”میں سمجھی نہیں، آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔“

”تم جانتی ہو بشریٰ بیگم۔! میں نے ایک بھرپور زندگی گذاری ہے۔ پرکھوں کی اتنی بڑی جائیداد میں کمی نہیں آنے دی ۔بلکہ اس میں اضافہ ہی کیا ہے۔ پورے علاقے پر رعب اور دبدبہ ہے۔۔۔ کسی کی مجال نہیں کہ میرا حکم ٹال دے۔“ اس نے گہرے لہجے میں کہا

”تو پھر پریشانی کس بات کی ہے؟“ وہ الجھتے ہوئے بولی

”میں پریشان نہیں ہوں۔ بلکہ سوچ رہا ہوں۔۔۔ حالات ایسے بن گئے ہیں کہ اب تمہارے بیٹے نکے چوہدری پر ذمے داریاں ڈالوں تا کہ وہ بڑا چوہدری بن کر اس علاقے پر حکومت کرے۔“ اس کے لہجے میں فخر جھلک رہا تھا

”ہاں چوہدری صاحب۔! اب ہم عمر کے اس حصے میں آ گئے ہیں جہاں اپنی ذمے داریاں اگلی نسل کو دینا ہو گی۔ ہمارے اکلوتے بیٹے چوہدری کبیر کو تو رَبّ نے پیدا ہی اسی لئے کیا ہے کہ وہ آرام سے بیٹھ کر حکومت کرے۔“اس کے لہجے میں بھی غرور ٹپک پڑا تھا

”اُو نہیں بھاگوانے۔! حکومت آرام سے بیٹھ کر نہیں کی جاتی۔ اس کے لئے تو چیتے کی پھرتی، باز کی آنکھ اور شیر کا دل چاہیے۔“ وہ اپنا تجربہ اور گہرا مشاہدہ بیان کرتے ہوئے بولا

”تو پھر میرے پتر میں کیا کمی ہے؟“ اس نے تیزی سے پوچھا تو وہ گہری سنجیدگی سے بولا

”کمی یہ ہے کہ وہ اب تک کھیل تماشے ہی میں وقت گزار رہا ہے۔ دنیاداری کیا ہوتی ہے۔ ابھی وہ نہیں جانتا۔ یہ ساری عقل سمجھ اسے لینا ہو گی۔ سیاست کیا ہے۔ اسے سمجھنا ہو گا، پھر وہ اس علاقے پر حکومت کرنے کے قابل ہو گا۔“

”پر میرا پتر اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہے۔ جانتا ہے کہ دنیاداری کیا ہوتی ہے۔“ وہ مان سے بولی

”تو اس کی ماں ہے نا، اس لئے ایسا کہہ رہی ہے۔ ورنہ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔ خیر۔! وہ ایک بڑا سیاست دان

بن کر اس علاقے پر حکومت کر سکتا ہے۔ اگر اس میں جذباتی پن ختم ہو جائے تو۔۔۔ میں نے یہی فیصلہ کیا ہے۔ اس بار الیکشن میں اسے ایم پی اے بنوا ہی دوں۔ دریا میں کُودے گا نا تو اسے تیرنا بھی آ جائے گا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ یہ سنتے ہی بشریٰ بیگم کافی حد تک خوف زدہ لہجے میں بولی

"ویسے چوہدری صاحب۔! اس بار آپ اسے الیکشن نہ لڑوائیں۔۔ ہم اس کی شادی کرتے ہیں دھوم دھام سے ۔۔۔ ہمارے اکلوتے بیٹے کے لئے ایک سے ایک بڑھ کر رشتے ہیں۔۔۔ ایک سے ایک بڑھ کر خاندان موجود ہے۔۔۔ کسی بڑے گھر میں شادی ہو جانے کے بعد وہ خود بخود اپنی ذمے داریوں کو سمجھنے لگ جائے گا۔"

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔ جب وہ کسی بڑے گھر کا داماد بنے گا تو اور زیادہ مضبوط ہو گا۔ اس کی رسائی اوپر تک جلدی ہو جائے گی۔ پر میں کہتا ہوں وہ کچھ نہ کچھ تو ذمے داری کا احساس دلائے۔ ہمیں پتہ چلے کہ وہ ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل ہو گیا ہے۔"

"وہ جو اس گھر میں ہماری بہو آئے گی نا، وہ خود ہی اس کو ذمے داری کا احساس دلا دے گی۔ رہے یہ کھیل تماشے۔۔۔ یہ تو خود بخود ختم ہو جائیں گے۔ آپ کیا تھے؟" اس نے لبوں میں مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ایک دم سے چونک گیا، پھر مسکراتے ہوئے بولا

"ہاں! ہم کیا تھے۔۔۔ کیا زمانہ یاد دلا دیا تم نے۔۔۔ خیر تم اپنے بیٹے کی پسند بھی پوچھ لینا۔۔۔ اگر وہ کسی کو پسند کرتا ہو تو۔۔۔"

"نہیں۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ بیٹا ہے وہ میرا۔" یہ کہہ وہ یوں خاموش ہو گئی جیسے اسے کچھ یاد آ گیا ہو، پھر بولی، "اچھا آئیں، ناشتہ لگا دیا ہے رانی نے۔" یہ کہتے ہوئے بشریٰ بیگم پلٹی ہے تو چوہدری جلال بھی اس کے ساتھ چل دیا۔ انہی لمحوں میں چوہدری کبیر حویلی میں داخل ہوا۔ اسے یہ خبر ہی نہ ہوئی کہ اس کے

والدین اس کے بارے میں کیا فیصلہ کر چکے ہیں۔

دوپہر سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ چوہدری کبیر تیار ہو کر ڈیرے پر جانے کیے لئے باہر نکلا تھا۔ وہ ڈرائینگ روم میں آیا۔ جہاں چوہدری جلال اور ان کا وکیل جمیل اختر باتیں کر رہے تھے۔ وہ بھی اشارے سے سلام کر کے بیٹھ گیا۔ تبھی چوہدری جلال نے وکیل جمیل اختر سے پوچھا

”جی۔۔۔وکیل صاحب؟۔۔۔کیا بنا پھر اس قتل کیس کا؟“

”ظاہر ہے جب اس امین آرائیں جیسے چشم دید گواہ کی گواہی نہیں ہوئی تو فیصلہ ہمارے حق میں ہونا تھا۔۔۔نہ مدعی نہ گواہ، لیکن ابھی کیس ختم تو نہیں ہوا۔ اندھا قتل ہے۔ فائلوں میں دفن کرتے کچھ وقت لگے گا نا“ وکیل جمیل اختر نے سکون سے یوں کہا جیسے یہ کوئی اہم بات نہ ہو۔

”ہم نے ایسے ہی تو آپ کو وکیل نہیں رکھا، آپ میرے اچھے دوست بھی ہیں۔ خیر یہ مقدمے بازی کی باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ سنائیں وکیل صاحب۔! نورپور کی سیاست کیا کہہ رہی ہے۔ الیکشن بھی سر پر ہیں نا“ چوہدری جلال نے لطف لیتے ہوئے پوچھا

”نورپور کی سیاست میں اب تھوڑی بہت ہلچل ہونے کا امکان لگتا ہے۔ سنا ہے، ملک نعیم اس بار الیکشن نہیں لڑے گا۔ جبکہ اس کے لوگ خاصے متحرک ہو گئے ہیں۔“ وکیل جمیل اختر نے گہری سنجیدگی سے کہا

”مجھے نہیں لگتا وکیل صاحب کہ وہ اب الیکشن لڑے گا۔۔۔ اس میں اب دَم خم نہیں رہا۔۔۔ اس بار ایم این اے کی سیٹ پر بلا مقابلہ کامیابی ہو گی۔۔۔ ہاں چھوٹی سیٹ پر کوئی سامنے آ جائے تو کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ آپ کوئی سیٹ اپ بنائیں چھوٹی سیٹ کے لئے۔“ اس نے دبے لفظوں میں اپنا مدعا کہہ دیا۔

”یہ تو آپ پر منحصر ہے نا کہ آپ اب نورپور کو کتنا وقت دیتے ہیں۔ ظاہر ہے لوگوں کو کام کاج سے غرض ہوتی

ہے۔لوگوں کے کام آکر ہی سیٹ اپ بنایا جا سکتا ہے نا۔"وکیل جمیل اختر نے صلاح دی

"لوگوں کا کام کیا ہے۔ تھانہ، کچہری یا پھر کوئی دفتر۔!یہ سب لوگ ہمارے ہی لگائے ہوئے ہیں۔۔۔ آپ ان سے کام لیں۔اگر کوئی نہیں مانتا تو۔۔۔اس کا تبادلہ کروا دیں گے۔ویسے بھی میری آئی جی پولیس سے بات ہوئی ہے۔انہوں نے پوری طرح تعاون کرنے کے لئے کہا ہے۔ آپ بس بے خوف ہو کر کام کریں۔" اس نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا جیسے عوام کے بارے سن کر اسے اچھا نہ لگا ہو۔

"چوہدری صاحب۔!ہم تو پارٹی کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔لیکن کوئی بندہ تو ہو سامنے۔۔ مطلب، چھوٹی سیٹ کے مقابلے میں کوئی فرد تو ہونا چاہیے نا۔۔۔ جس کے لیے سارا سیٹ اپ بنانا ہو گا۔" وکیل نے سمجھانے والے انداز میں کہا

"تو یہ ہے نا اپنا کبیر۔۔۔اب نور پور کو وقت دے گا۔۔۔ آپ پورے اعتماد سے کام کریں۔وہاں خاص طور پر نظر رکھنی ہے جہاں مخالفین کا مفاد ہو۔" اس نے صاف انداز میں کبیر کا نام لے دیا۔

"میں سمجھ گیا چوہدری صاحب۔!آپ کیا چاہتے ہیں۔"وکیل جمیل اختر نے اتنی بحث کے بعد وہ نام اگلوا لیا۔

"بس۔!کرنا یہ ہے کہ کوئی بھی مخالف ہمارا مقابلہ کرنے لیے سیاست میں آنے کا کبھی خواب بھی نہ دیکھے۔" اس نے اندر کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے کہا

"ایسا ہی ہو گا چوہدری صاحب۔۔ خیر اب اجازت دیں"وکیل جمیل اختر نے خوش کن انداز میں کہا

"اُو نہیں۔۔۔ نہیں، ابھی کہاں جائیں گے آپ۔ابھی کھانا کھاتے ہیں پھر جایئے گا۔ابھی باتیں کرتے ہیں ۔" چوہدری جلال نے کہا تو چوہدری کبیر کھڑا ہوتے ہوئے بولا

"میں چلتا ہوں۔ڈیرے پر کچھ کام ہیں۔"

”ٹھیک ہے“ چوہدری جلال نے اس وجہ کو سمجھتے ہوئے کہا تو یہ سن کر وہ نکلتا چلا گیا۔

☆۔۔۔ژ۔۔۔ظ

فہد کے گھر جعفر کو آئے ہوئے کافی وقت ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ڈرائینگ روم میں بیٹھے اِدھر اُدھر کی بہت ساری باتیں کر کے خاموش ہو چکے تھے۔ ملازم دوسری بار چائے لے کر آیا تو جعفر چائے کا سپ لے کر خوشگوار لہجے میں کہا

”تمہارا یہ ملازم کھانا بہت اچھا بناتا ہے۔ یہ چائے۔۔۔ یہ بھی بہت اچھی بنائی ہے اِس نے۔ وہ پہلے والا ملازم بھی خیر ٹھیک تھا۔ لیکن یہ زیادہ اچھا ہے۔“

فہد نے جعفر کی طرف سُتے ہوئے چہرے سے دیکھا اور پھر اُکتائے ہوئے انداز میں بولا

تم بہت بول چکے ہو یار، اب مطلب کی بات کرو جعفر۔۔۔ تم مجھ سے کیا بات کرنے آئے ہو؟ صبح سے اب تک یونہی بولے چلے جا رہے ہو۔“

اس پر جعفر نے اسے گھور کر دیکھا اور ایک دم سنجیدہ ہو کر کہا

”تم ٹھیک سمجھے ہو۔ میں تم سے چند ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھ کر خاموش رہا، پھر کہنے لگا، ”پہلی بات یہ ہے فہد۔! کیا تم مائرہ سے محبت کرتے ہو؟ اگر اس سے محبت کرتے ہو تو اس کی محبت کا جواب محبت سے کیوں نہیں دیتے ہو؟“

”سچ پوچھو نا۔ مجھے خود نہیں معلوم۔ میں اس سے محبت کرتا بھی ہوں یا نہیں۔“ فہد نے صاف لفظوں میں اعتراف کر لیا، جس پر جعفر الجھتے ہوئے بولا

”یہ کیا کہہ رہے ہو۔ وہ تمہاری محبت کے سہارے نجانے سپنوں کے کتنے محل تعمیر کر چکی ہے۔۔ تمہیں پانے کی خاطر وہ دنیا سے ٹکرا جانے کی ہمت رکھتی ہے اور تم۔۔۔ تمہیں اس کا احساس تک نہیں؟“

”احساس۔!مجھے کیا احساس کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔۔میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں۔۔لیکن۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا تو جعفر اس کی بات کاٹ کر بولا

”لیکن یہ ہے کہ تم اس کے ساتھ شادی نہیں کرنا چاہتے۔اب تک کیا تم اس کے ساتھ محض وقت گذار رہے تھے۔وہ صاف لفظوں میں اپنی محبت کا اظہار تم سے کر چکی ہے اور تم اسے مسلسل نظر انداز کر رہے ہو۔آخر کیوں فہد؟“

”میں اس سے کوئی حتمی بات نہیں کر سکتا۔شادی، وقت گذاری، محبت کا اظہار، ایسی فضول باتیں نہ کرو۔۔۔میرے سامنے ایک پل صراط ہے جعفر۔۔۔اور مجھے وہ پار کرنا ہے۔میں اس کی یا کسی کی محبت میں خود کو کمزور نہیں کرنا چاہتا۔مجھے کچھ اور کرنا ہے۔“ اس نے پہلی بار اپنے دل کی بات سے جعفر کو آگاہ کیا، جسے وہ نہ سمجھتے ہوئے بولا

”محبت کمزور نہیں ہوتی فہد۔تمہیں جو کرنا ہے۔وہ کرو۔لیکن تم ایک کومل سی لڑکی کے سچے جذبات کو یوں نظر انداز کر رہے ہو جیسے ان جذبوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔“

”میں مانتا ہوں جعفر، محبت انسان میں وہ قوت بھر دیتی ہے، جس سے وہ پوری دنیا کے ساتھ لڑ سکتا ہے، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ حد درجہ کمزور بھی کر دیتی ہے۔مقصد اور محبت میں کبھی نہیں بنی اور میں جو مقصد لئے جہاں پر کھڑا ہوں۔وہاں سے میں پیچھے نہیں ہٹ سکتا، اور نہ ہی کوئی سمجھوتہ کر سکتا ہوں۔“ اس کی یوں کہنے پر وہ چونک گیا۔اس لئے تشویش بھرے لہجے میں بولا

”اس وقت جو میرے سامنے فہد بیٹھا ہے یہ وہ تو نہیں ہے جیسے میں جانتا ہوں۔تم بدل گئے ہو۔محبت، دوستی ، تعلق۔۔۔اب تمہارے لئے کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے۔جان گیا ہوں۔شاید اب تمہیں ہم جیسے دوستوں کی ضرورت نہیں رہی۔“

”نہیں۔تم بہت غلط سمجھے ہو جعفر۔!مجھے افسوس ہوا۔“ اس نے آزردہ لہجے میں شکوہ بھرے انداز میں کہا، پھر لمحہ بھر

ٹھہر کے بولا، ” تم ایک ذہین۔۔۔ایمان دار اور قابل پولیس آفیسر ہو۔۔۔تم عام آدمی سے زیادہ بہتر حالات کا تجزیہ کر سکتے ہو۔۔۔ آؤ۔! میں تمہیں ایکہانی سناؤں۔ بالکل سچی کہانی۔۔۔ پھر میں تم سے ایک فیصلہ چاہوں گا۔۔۔“

”سچی کہانی۔۔اور فیصلہ۔۔۔یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔۔؟“جعفر نے حیرت سے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھاتو فہد نے پرسکون لہجے میں کہا

”پہلے ایک کہانی سن لو۔!ایک چھوٹی سی کہانی۔۔پھر بات کرتے ہیں۔۔۔“ فہد نے کہا پھر کسی نامعلوم نکتے پر نگاہیں جماتے ہوئے کہتا چلا گیا۔”ایک گاؤں میں غریب والدین کا ایک بیٹا تھا۔۔۔وہ کوئی اور نہیں، میں خود تھا۔۔۔میرے باپ کا نام فرزند حسین تھا، میری ماں مجھے بہت پیار کرتی تھی۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ ایک غریب کسان کا بیٹا، مزدوری کے علاوہ کیا کر سکتا تھا، مگر میرے ماں باپ نے مجھے اسکول میں داخل کروادیا۔ وہاں پر میرے استاد ماسٹر دین محمد ہوا کرتے تھے۔ میرا بہت خیال کرتے تھے۔ بہت اچھے دن گذر رہے تھے۔ اُس شام میں گھر پر تھا“ یہ کہتے ہوئے وہ خیالوں میں کھو گیا

فہد بیل گاڑی سے چارہ اُتار رہا تھا، ماں چولہے کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اور باپ چارپائی پر بیٹھا ہے۔ اچانک فہد کی نگاہ گیٹ کی طرف اٹھ گئی۔ پھاٹک میں ماسٹر دین محمد کھڑا مسکرا رہا تھا۔ فہد نے چارہ وہیں پھینکا اور بھاگ کر اپنے استاد کی طرف گیا۔ جھک کر سلام کیا اور حیرت سے بولا

”آیئے استاد جی۔! آپ اس وقت ہمارے گھر؟“

”ہاں پتر۔! بات ہی ایسی ہے۔۔۔آ، تیرے باپ کے سامنے تجھے بتاؤں۔“ ماسٹر دین محمد نے خوشی سے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا اور اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر اندر کی جانب بڑھا۔ وہ دونوں صحن کی جانب بڑھے۔ تبھی فہد کا باپ فرزند حسین آگے بڑھ کر ماسٹر دین محمد کو عاجزی سے ملا

”آیئے ماسٹر صاحب۔!ادھر بیٹھیں۔۔“

اس دوران اس کی ماں بھی اپنا دوپٹہ سنبھالتی اُٹھ کر وہیں ان کے پاس آ گئی۔

”اسلام علیکم بھائی جی۔۔۔اللہ خیر سکھ رکھے۔ آپ ہمارے گھر؟“ماں نے خوشگوار حیرت سے پوچھا

”وعلیکم سلام بہن۔!میں بتاتا ہوں نا کہ میں کیوں آیا ہوں۔۔لے بھائی فرزند حسین۔!آج میں تمہیں ایک بہت بڑی خوشخبری سنانے آیا ہوں۔۔۔تیرے سامنے میں بھی سرخرو ہوا اور یہ فہد بھی۔“ ماسٹر دین محمد نے دبے دبے جوش سے کہا تو فرزند حسین نے یاد کرتے ہوئے کہا

”ہاں ماسٹر جی، میں نے فہد کو پانچویں جماعت کے بعد سکول سے اٹھا لیا تھا۔میں غریب آدمی،اس کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ آپ نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔تب سے یہ آپ ہی کا بیٹا ہے جی۔۔۔یہ آپ کی مہربانی کہ اس کا خرچ آپ نے اپنے ذمے لے لیا۔ مجھ پر بوجھ نہیں بنا۔“

”بہت سارے غریب والدین اپنے بچوں کو سکول سے اٹھا لیتے ہیں اور انہیں کام پر لگا لیتے ہیں، خیر اب سنو۔!اس فہد نیہمارے اعتماد کا ہمیں کیا پھل دیا۔۔۔اپنے فہد نے پورے بورڈ میں پہلی پوزیشن حاصل کر کے پورے علاقے کا سر فخر سے بلند کر دیا۔“ ماسٹر دین محمد نے انتہائی خوشی سے بتاتے ہوئے کہا تو فرزند حسین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔چند لمحے تو اس سے بولا ہی نہیں گیا،اس کے منہ سے صرف اتنا نکلا

”ہائیں۔۔۔“!

یہی حال اس کی ماں کا اور اس کا اپنا بھی تھا۔ماں نے فرطِ محبت میں فہد کو گلے لگا لیا۔ جبکہ ماسٹر دین محمد فخر سے کہہ رہا تھا

”فرزند حسین کا بیٹا اور ماسٹر دین محمد کا شاگرد، یہ فہد، پورے علاقے کے تمام لڑکوں سے آگے بڑھ گیا ہے۔“

اس پر ماں نے اپنا آنچل پھیلا کر نہایت عاجزی سے کہا

”ہم آپ کو دعا دینے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں ماسٹر دین محمد بھائی۔ مبارک باد کے حقدار تو آپ ہیں۔ اسے آپ نے اپنے بیٹوں کی طرح رکھا۔۔۔ اس کا صلہ تو ہم نہیں دے سکتے۔ میرا رب ہی آپ کو صلہ دے گا۔“

”اب سنو میں سیدھا سکول سے کیوں یہاں آیا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لئے رُکا اور پھر بولا، ”کل فہد نے اور مجھے نور پور جانا ہے بورڈ کے دفتر۔ وہاں نتیجے کا باقاعدہ اعلان ہو گا اور پوزیشن لینے والے بچوں کو انعام ملیں گے۔۔ اس لیے کل صبح جلدی تیار ہو جانا۔“ ماسٹر دین محمد نے آخری لفظ فہد کو دیکھتے ہوئے کہے تو وہ مستعدی سے بولا

”جی استاد جی۔! میں تیار رہوں گا۔“

”بس ٹھیک ہے۔ میں وہ سوہنے تانگے والے سے کہہ دوں گا۔ وہ ہمیں نور پور لے جائے گا۔ اچھا، میں اب چلتا ہوں۔۔ بہت تھک گیا ہوں۔ سکول سے سیدھا ادھر آ گیا تھا۔“ ماسٹر دین محمد نے اٹھتے ہوئے کہا

”ماسٹر جی کچھ کھا پی لیں۔۔ پھر۔۔ چلے جایئے گا۔“ فرزند حسین نے کہا تو وہ بولا

”اُو یار کھا پی بھی لیں گے پھر کبھی، ابھی مجھے جانا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ چل دیا۔ تبھی فہد نے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا

”نکے چوہدری کا کیا بنا استاد جی، وہ پاس تو ہو گیا ہے نا؟“

”اس کی قسمت پتر۔! اس نے نقل لگائی تھی نا۔ وہ فیل ہو گیا ہے۔ بس تم صبح تیار رہنا۔“ ماسٹر دین محمد نے دکھی لہجے میں کہا اور پھاٹک پار کر گیا۔ فہد پلٹ کر بیل گاڑی سے چارہ اتارنے لگا تو اس کے باپ نے قریب آ کر پیار سے اُسے دیکھتے ہوئے کہا

”بس بھئی، آج سے تمہارا یہ کام دھندہ ختم۔ اب تُو صاحب بندہ بن گیا ہے۔ میں کر لوں گا یہ سب کچھ، تُو جا۔“

وہ بہت خوش تھا، اتنا خوش کہ خوشی سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھی۔ رات گئے تک وہ خوش کن خیالوں میں کھویا رہا۔ اس رات اس کے والدین نے اسے جی بھر کے پیار کیا تھا۔ وہ صبح ہی صبح تیار ہو کر اپنے گھر کے پھاٹک کے باہر آن کھڑا

ہوا۔ اسے اپنے استاد کا انتظار تھا، جو سوہنے تانگے والے کو لے کر آنے والے تھے۔ اسے تھوڑا ہی انتظار کرنا پڑا۔ سوہنا اپنا تانگہ لے کر آتا ہوا دکھائی دیا۔ ماسٹر دین محمد اس میں سوار تھے۔ فہد اپنے گھر کے سامنے سے تانگے پر سوار ہوا۔ تانگہ گلیوں میں سے گذرتا ہوا گاؤں کی اس کچی سڑک پر آ گیا جو گاؤں سے باہر جاتی تھی۔ گاؤں کی صبح میں جو فطرتی آوازیں اس دن کچھ زیادہ ہی اچھی لگ رہی تھیں۔ تانگے کے چلنے کی آواز، پرندوں کے چہچہانے کی آواز، ہوا کی سرسراہٹ، مویشیوں کے گلے میں گھنٹیوں کی آواز سب بہت بھلا لگ رہا تھا۔

فہد اور ماسٹر دین محمد کے ساتھ سوہنا باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ تانگہ اپنی مخصوص رفتار سے اس کچی سڑک پر چلتا چلا رہا تھا جو گاؤں سے باہر جاتی تھی۔ تبھی کچی سڑک کے درمیان کچھ فاصلے پر جیپ کھڑی دیکھ کر سوہنے تانگے والے نے کہا

”اللہ خیر کرے۔! یہ چوہدری جلال کی جیپ کیوں راستے میں کھڑی ہے صبح صبح۔۔۔؟“

”ہو سکتا ہے خراب ہو گئی ہو۔ تم ذرا احتیاط سے تانگہ نکال لینا۔ کہیں ان پر دھول مٹی نہ پڑ جائے۔“ ماسٹر دین محمد نے کہا تو سوہنے تانگے والے بولا

”آپ فکر نہ کریں ماسٹر جی۔“

ذرا سی دیر میں جیپ ان کے نزدیک آ گئی۔ تبھی اس میں سے چند آدمی نکلے۔ ان میں سے ایک آدمی نے ہاتھ کا اشارہ کر کے انہیں للکارتے ہوئے اونچی آواز میں کہا

”اُوئے سوہنے۔۔۔ تانگہ روک۔“

سوہنے نے جلدی سے تانگہ روک لیا تو ماسٹر دین محمد نے پوچھا

”کیا بات ہے پہلوان۔ تم نے تانگہ کیوں رکوایا؟“

اس پر وہ پہلوان نے انتہائی بدتمیزی سے کہا

”تم اور تمہارا شاگرد۔۔۔نور پور نہیں جائیں گے۔۔۔یہ چوہدری صاحب کا حکم ہے۔“

تبھی جیپ میں بیٹھے ہوئے چوہدری جلال کے خشمگیں چہرے پر پڑی، جس سے غصہ چھلک رہا تھا۔ماسٹر دین محمد نے کسی حد تک بات سمجھتے ہوئے پوچھا

”کیوں۔۔۔؟“

”یہ تم اپنے ہیڈ ماسٹر سے پوچھتے رہنا۔اب واپس مڑ جاؤ۔“ اس نے پھر بد تمیزی سے کہا تو ماسٹر دین محمد نے سوچتے ہوئے تحمل سے کہا

”بات سن پہلوان۔اپنے چوہدری صاحب سے کہو۔اپنے بیٹے کے فیل ہو جانے کا غصہ اس بے چارے غریب پر نہ اُتارے۔۔نکا چوہدری محنت کرتا تو یقیناً پاس ہو جاتا۔۔۔لیکن اُس نے نقل لگائی اور پکڑا گیا۔۔جو کچھ کیا امتحانی عملے نے کیا۔ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔نہ اس بچے کا، نہ ہیڈ ماسٹر کا“

”بکواس نہیں کر واوئے ماسٹر، تم نے صرف اس کمّی کے بیٹے کو پوزیشن دلانے کے لئے یہ سب کیا۔اگر نکا چوہدری پاس نہیں ہوا تو سمجھو علاقے کا کوئی لڑکا بھی پاس نہیں ہوا۔خیریت اسی میں ہے کہ واپس چلا جا۔“

”میں کرتا ہوں چوہدری صاحب سے بات۔۔۔“ ماسٹر دین محمد نے پھر تحمل سے کہتے ہوئے تانگے سے اُتر کر قریب کھڑی جیپ میں چوہدری جلال کے پاس جا کر انکساری سے کہا

”چوہدری صاحب۔!اس بچے نے محنت کی ہے۔اس لئے تو یہ پوزیشن لے گیا۔نکے چوہدری۔۔۔“ ماسٹر دین محمد نے کہنا چاہا تو چوہدری جلال نے انتہائی حقارت سے پہلوان کی طرف دیکھ کر بولا

”اُوئے پہلوان۔اِس ماسٹر سے کہو، ہم کمی کمین لوگوں سے بات نہیں کرتے۔۔۔“

اس پر ماسٹر دین محمد نے چونک کر اسے دیکھا، اس کے لہجے میں تکبّر تھا، پھر بھی وہ خود پر قابو پاتے ہوئے بولا

”ہم کمی کمین ہی سہی چوہدری صاحب، تم اگر تانگہ رکوالو گے تو کیا ہم پیدل نہیں جا سکیں گے۔۔۔ نورپور نہ بھی جا سکے تو کیا اس کی پوزیشن چھن جائے گی۔ سیدھا کیوں نہیں کہتے تم غریب بچوں سے بھی جلتے ہو۔ ہوش کرو چوہدری ہوش۔“

”اُوئے پہلوان۔! اس ماسٹر کی بک بک تو بند کرا۔ اب یہ پیدل بھی نورپور نہ جا سکیں۔ دُو ٹکے کے لوگ ہم سے مقابلہ کرتے ہیں۔“ چوہدری جلال نے حقارت سے کہا تو فہد تڑپ اٹھا۔ وہ کسی خوف اور ڈر کے بغیر بولا

”چوہدری صاحب۔ میرے استاد جی کی شان میں گستاخی نہ کرو۔ یہ اچھا نہیں ہے“

”بھونکتا ہے کتے کے پلے“ چوہدری نے دھاڑتے ہوئے کہا تو پہلوان سمیت چوہدری کے لوگ ان دونوں پر پل پڑے ہیں۔ اسے تانگے سے کھینچ کر اتارا اور اسے مارنے لگے۔ استاد دین محمد ان کی مار برداشت نہ کرتے ہوئے زمین پر گر گیا۔ فہد اپنے استاد کو مار سے بچانے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ اسی کی طرف بڑھتا تو لوگ اسے کھینچ کر مارنے لگتے۔ ایسے میں استاد کی پگڑی پرے جا گری تو فہد کا دماغ گھوم گیا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا پتھر آ گیا۔ اس نے قریب کھڑے آدمی کے سر پر مار دیا۔ اس آدمی کا سر پھٹ گیا۔ تبھی باقیوں نے اسے اٹھایا اور اُٹھا کر ایک درخت میں دے مارا۔ وہ ببول کے درخت سے ٹکرایا تو درد کی ایک شدید لہر اس کے بدن میں اٹھی، جسے وہ برداشت نہ کر پایا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتا چلا گیا۔

ماسٹر دین محمد اور فہد دونوں بے ہوش ہو گئے تھے۔ سوہنا تانگے والا ہونقوں کی مانند انہیں دیکھتا رہا۔ چوہدری نے انتہائی حقارت اور نفرت سے انہیں زمین پر پڑے ہوئے دیکھا اور وہاں سے اپنے آدمیوں کے ساتھ گاؤں کی طرف چلا گیا۔ تبھی سوہنے تانگے والے نے انہیں اپنے ہاتھوں سے بمشکل اٹھایا اور نورپور کے ہسپتال کی طرف تیزی بڑھتا چلا گیا۔

وہ دونوں ڈرائینگ روم میں بیٹھے تھے۔ چائے کے کپ میز پر دھرے ہوئے تھے۔ فہد نے ایک طویل سانس لی اور جعفر سے پوچھا

”اب بتاؤ جعفر۔! تمہارا فیصلہ کیا ہے اس لڑکے فہد کے بارے میں۔ جس نے پوزیشن لی تھی مگر اپنا انعام نہ لے سکا، بلکہ زخم کھائے اور پھر دوبارہ کبھی گاؤں نہیں جا سکا۔ میرے والدین کو چوہدریوں نے بہت ذلیل کیا۔ انہوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر میں گاؤں میں دکھائی دیا تو وہ مجھے مار دیں گے۔ میرے والدین نے مجھے گاؤں واپس نہیں جانے دیا تھا۔ میں نور پور میں اکیلا اور میرے ماں باپ گاؤں میں تھے۔ وہ بچارے پہلے ہی میرے لیے تڑپ رہے تھے اوپر سے ان پر چوری کا الزام لگا دیا گیا۔“

”پھر کیا ہوا۔۔؟“ جعفر نے تڑپ کر پوچھا تو وہ بولا

”ہونا کیا تھا، انہی بے غیرت چوہدریوں کی اپنی بنائی ہوئی پنچائت نے میرے باپ پر الزام ثابت کر دیا۔ چند ایکڑ زمین، جو ہماری روزی روٹی کا واحد ذریعہ تھی، انہوں نے چھین لی اور میرے والدین کو گاؤں سے نکال دیا۔ وہ نور پور آ گئے اور وہ یہیں فوت ہو گئے۔ میرے والدین کو یہی دکھ مار گیا کہ ان پر چوری کا الزام لگا۔ اور پھر قدرت مجھے پاپا کے پاس لے آئی۔“

”یعنی محمود سلیم صاحب کے پاس۔۔۔ کیسے۔۔ ان کے پاس کیسے؟“ جعفر نے تجسس سے پوچھا

”میں اس دنیا میں اکیلا ہو گیا تھا۔ اپنی محنت مزدوری بھی کرتا رہا اور پڑھتا بھی رہا۔ میں نے دسویں جماعت میں پوزیشن لی تھی۔۔۔ ماسٹر دین محمد صاحب کے ایک دوست کی وجہ سے میں پڑھنے لگا تھا۔ میرے کالج کے پرنسپل نے مجھے پاپا سے ملوایا۔ انہوں نے مجھے بیٹا بنا لیا۔ کیونکہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ انہوں نے پرورش کے ساتھ زندگی گذارنے کے لئے میری راہنمائی کی۔ جیسے وہ تمہاری راہنمائی بھی کرتے ہیں۔“

"یوں تم، کالج میں آ گئے اور تب سے ہمارا ساتھ ہوا۔ سوری فہد۔! میں نے غلط سوچا لیکن، اب تم کیا کرنا چاہتے ہو۔" جعفر نے تیزی سے کہتے ہوئے پوچھا

"مجھے تو قرض چکانا ہے۔ اپنی ذات کا قرض۔" اس نے یوں پر سکون انداز میں کہا جیسے طوفان آنے سے پہلے خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس پر جعفر چونک گیا، پھر دھیرے سے پوچھا

"کیسے۔۔۔ کیسے کرو گے؟"

"یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں نے زندگی میں اسی لئے اتنی جدوجہد کی ہے۔ میں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اپنی محبت تو کیا اپنی زندگی بھی قربان کر سکتا ہوں۔" اس نے پر یقین لہجے میں کہا

"تو کیا تم نے پولیس جوائن کرنے بعد نوکری اس لیے چھوڑ دی؟ اگر پولیس میں ہوتے تو تم زیادہ اچھی طرح ان سے بدلہ لے سکتے تھے؟" جعفر نے صلاح دیتے ہوئے کہا تو وہ مایوسی سے بولا

"تم بھی یہ کہہ رہے ہو جعفر؟۔ یہ میرے پیشے سے بد دیانتی ہوتی اور میں ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ سرکاری ملازم جتنا بھی اختیار رکھتا ہو۔۔ وہ بہر حال اپنے اختیارات میں محدود ہوتا ہے۔ اور میں آزاد رہنا چاہتا ہوں۔۔۔ مجھے اپنا زور بازو آزمانا ہے کہ یہ میری ذات کا قرض ہے۔"

جعفر نے یوں دھیرے سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو لیکن کہہ نہیں پا رہا ہو۔ تب اچانک دونوں گلے لگ گئے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ ان کے دکھ کا مداوا کیا ہے۔

☆۔۔۔ ژ۔۔۔ ظ

بے حال امین آرائیں اپنے ڈیرے پر انتہائی خستہ حال میں پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سلامے کے قتل کا منظر گھوم رہا تھا۔ اس کے دماغ میں غصہ بگولوں کی مانند اسے پاگل کئے دے رہا تھا۔ اسے وہ حقارت آمیز سلوک یاد آ

رہا تھا جو آج ہی چوہدریوں کے پالتو غنڈوں نے اس کے ساتھ کیا تھا۔ انہوں نے اس پر شدید تشدد کیا تھا۔ دوپہر کے بعد وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں ان کے اُس کمرے کے فرش پر پڑا تھا، جہاں انہوں نے اسے قید رکھا ہوا تھا۔ وہ زخمی تھا۔ ایسے میں دروازہ کھلا اور اس میں ماکھا نمودار ہوا۔ امین ارائیں نے اس کی جانب غضب ناک انداز میں دیکھا تو وہ حقارت سے بولا

”چل اوئے اُٹھ۔۔۔ بھاگ یہاں سے۔۔“

”تم اور تمہارے چوہدری نے جتنا تشدد مجھ پر کیا ہے۔ یہ تم لوگوں کو بہت مہنگا پڑے گا۔ میں۔۔۔“ امین ارائیں نے کہنا چاہا تو ماکھا ہتک آمیز انداز میں بولا

اوئے چل اوئے اٹھ۔۔۔ بھاگ جا یہاں سے۔۔ تیری قسمت اچھی ہے کہ ہم تجھے چھوڑ رہے ہیں۔۔ اب تیری کوئی ضرورت نہیں رہی۔۔۔ تو جا۔۔“

”قانون اتنا بھی اندھا نہیں ہے۔۔۔ جتنا تم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے۔ آج بھلے ثبوت نہ ہو۔۔۔ مگر کل تم سب کو عدالت میں آنا پڑے گا۔“ امین ارائیں نے اسے دھمکی دیتے ہوئے کہا

”اوئے زیادہ بک بک کر کے دماغ خراب نہ کر۔۔۔ ورنہ یہیں دفن کر دوں گا۔۔۔ تیری زندگی بخش رہے ہیں۔۔۔ تو شکر منا۔۔۔ ورنہ جس کیلئے تو گواہی دیتا پھرتا ہے نا اس کی طرح منوں مٹی تلے چلا جائے گا۔ سیانا بن سیانا۔۔۔ اور دوبارہ چوہدریوں کے خلاف سوچنا بھی مت۔ چل اٹھ۔۔ چل باہر نکل۔۔“ ماکھے نے کہا تو امین ارائیں بولا

”بہت پچھتاؤ گے تم لوگ۔۔۔“

ماکھے نے یہ سنا تو غضب ناک ہو کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ امین ارائیں نے ایک طرف گر گیا۔ پھر دوبارہ سر اٹھایا تو اس کے لبوں سے خون بہہ رہا تھا۔

"اپنے آپ پر ترس کھا اوئے۔۔۔ یہ جو تیری حالت میں نے بنائی ہے نا۔۔۔ یہ کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ تیری ساری ہڈیاں سلامت ہیں اب تک۔۔۔ تو شکر کر شکر۔۔۔ اور آرام سے اپنے گھر جا کر گم ہو جا۔۔۔ ورنہ تُو تو نہیں۔۔ تیرے گھر والے بے چارے پچھتائیں گے۔" ماکھے نے دانت پیستے ہوئے کہا تو امین ارائیں نے نفرت سے کہا

"تُو چوہدریوں کی طاقت کے بل بوتے پر بھونک رہا ہے ماکھے۔۔۔ ورنہ تیرے جیسے بدمعاش اس علاقے میں دیکھنے کو بھی نہ ملیں۔ تُو اور تیرا چوہدری ہڈیاں توڑ سکتا ہے۔۔ گولی مار کر ختم بھی کر سکتا ہے۔۔۔ لیکن میرا ارادہ نہیں بدل سکتے تم لوگ۔۔۔ مارنا ہے تو ابھی مار دو۔۔۔ ورنہ سمجھ لو کہ میں تمہاری موت ہوں"

یہ سن کے ماکھا غصے میں پاگل ہو گیا۔ یہ ایک طرح سے انہیں کھلی دھمکی تھی۔ انہوں نے جتنا بھی تشدد کیا تھا، وہ بے کار گیا تھا۔ وہ اس کا نہ ارادہ دل سکے تھے اور نہ ہی اسے خوف زدہ کر پائے تھے۔ اس لئے وہ بھناتے ہوئے بولا

"دل تو کرتا ہے کہ ابھی ایک گولی تیرے بھیجے میں اتار دوں جس میں تیرا یہ ارادہ بیٹھا ہوا ہے۔۔۔ چل پھر۔۔ تجھے گولی مار ہی دیتے ہیں۔۔۔ نہ تو رہے گا نہ تیرا ارادہ۔۔۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا ریوالور نکالا اور اس کی نال امین ارائیں کی کنپٹی پر رکھ دی جو قطعاً خوف زدہ نہیں ہوا۔ تبھی ٹریگر پر انگلی رکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔۔۔ "چل جا۔۔۔ جا کر جو کچھ تو نے کرنا ہے کر۔۔۔ اپنے دل کی حسرت پوری کر لے۔۔۔ گولی تو میں تجھے کبھی بھی مار سکتا ہوں۔"

ماکھے نے پھر اسے کوئی بات نہیں کرنے دی۔ اسے بازو سے پکڑ کر تقریباً گھسیٹتے ہوئے باہر کی جانب لے گیا اور دھتکارتے ہوئے باہر سڑک پر پھینک دیا۔

امین ارائیں کو یہ یاد آیا تو اس نے اذیت کو برداشت نہ کرتے ہوئے زور سے آنکھیں بند کر لیں۔ اسے اپنے بدن پر لگے زخموں کی اتنی اذیت نہیں ہو رہی تھی، جتنا کسے کتے کی طرح ذلیل کرنے پر اس کا دماغ تپ رہا تھا۔ اسے اپنے وجود سے کراہت محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک وہ اٹھا اور جوتے پہن کر چل دیا۔ اس نے ایک دم سے ہی فیصلہ کر لیا تھا۔

امین آرائیں سیدھا قسمت نگر کی چوکی پر چلا گیا اور چوکی انچارج انسپکٹر کے سامنے بے حال سا کھڑا تھا۔ اسے گاؤں ہی کے دو لوگوں نے تھاما ہوا تھا۔ اس کے زخم ابھی تک تازہ تھے۔ انسپکٹر اس کا بیان سن چکا تھا۔ اس لئے حیرت سے پوچھا

”اوئے تُو پاگل ہو گیا ہے جو چوہدری کبیر اور چوہدری جلال کے خلاف پرچہ کٹوانے آ گیا ہے۔ اُو جا، کوئی عقل کا علاج کروا، یہ نہیں ہو سکتا۔“

”انہوں نے مجھ پر تشدد کیا ہے۔ دیکھیں، انہوں نے میرا یہ حال کر دیا ہے۔ تین دن تک انہوں نے مجھے اپنے ڈیرے پر رکھ کر تشدد کیا اور تم ان کے خلاف پرچہ نہیں کاٹ رہے ہو۔“ امین آرائیں نے انتہائی غصے اور بے چارگی سے کہا تو انسپکٹر سر ہلاتے ہوئے لاپرواہی سے بولا

”ہو گا، انہوں نے تم پر تشدد کیا ہو گا۔۔۔ تم نے کچھ کیا ہو گا تبھی تیرا یہ حال ہوا ہے نا۔“

”انہوں نے میری آنکھوں کے سامنے قتل کیا سلامے کا، میں نے گواہی دینا چاہی تو انہوں نے مجھے عدالت جانے سے روکا۔۔۔ تاکہ میں گواہی نہ دے سکوں۔ یہ تمہیں بھی معلوم ہے کہ انہوں نے قتل کیا ہے۔ جس کا میں چشم دید گواہ ہوں۔“ امین آرائیں نے اسے یاد دلاتے ہوئے کہا تو وہ ہنس کر بولا

”اور تجھے بھی پتہ ہے کہ میں نے وہی کچھ کرنا ہے۔۔۔ جو چوہدری نے کہنا ہے۔۔۔ ہم تو ان کے غلام ہیں، وہ جو کہیں گے، وہی ہو گا۔ میرا مشورہ مان۔۔۔ تُو چپ کر کے اپنے گھر چلا جا۔۔۔ یہ جو زندگی کے چار سانس لئے پھرتا ہے نا۔۔۔ یہ بھی ختم ہو جائیں گے۔۔۔ اور یہ جو تم نے چشم دید والی رٹ لگا رکھی ہے نا۔۔۔ اسے بھی بند کر ورنہ یہی تیری جان لے لے گی۔ جا چلا جا۔۔۔“

”تو پھر یہ تھانے کس لئے ہیں؟۔۔۔ بند کروا نہیں اور تم بھی جاؤ اپنے گھر۔۔۔ جب کسی بندے کی آواز ہی نہیں سنی جانی تو کیا فائدہ۔۔۔“ امین آرائیں نے طنزیہ لہجے کہا تو انسپکٹر بھڑک اٹھا

”بک بک بند کر اوئے۔۔۔میں تیری آواز سن بھی لوں تو کیا ہو گا؟۔۔۔کچھ بھی نہیں ہو گا۔ تیری کٹی کٹائی ایف آئی آر ردی کی ٹوکری میں چلی جائے گی۔۔۔خوامخواہ کاغذ کالے کرنے کا فائدہ۔۔۔تُو جا۔۔۔اور جا کر اپنا آپ سنبھال۔“

”انسپکٹر۔!میری ایف آئی آر لکھ لے۔“امین آرائیں نے ضد کرتے ہوئے کہا

”کیا لکھوں۔!کیا ثبوت ہے تیرے پاس۔۔۔تیری گواہی کون دے گا۔ کہاں ہیں تیرے زخم۔۔۔مجھے تو کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا۔“ انسپکٹر ہنستے ہوئے بولا

”میں جب تھانے کے سامنے خود کو آگ لگالوں گا تو۔۔۔زخم نظر آجائیں گے۔“ وہ دھاڑتے ہوئے بولا تو انسپکٹر نے سرد مہری سے کہا

”تم جو مرضی کرو۔۔۔خود کو آگ لگاؤ یا کنویں میں گر جاؤ۔۔۔تمہارا ایسا کرنا بھی فضول ہے۔۔۔میں تمہیں بتاتا ہوں ۔۔۔تم عدالت جاؤ۔۔۔وہاں سے پرچے کا حکم لے آؤ۔۔۔جاؤ شاباش۔۔۔میرا دماغ نہ کھاؤ“

”میں نے پرچہ کٹوانا ہے انسپکٹر۔۔۔میں تھانے کے باہر خود کو آگ لگالوں گا۔۔۔پھر کچھ نا کچھ تو ہو گا۔“امین آرائیں نے حتمی لہجے میں کہا تو انسپکٹر نے چونک کر اسے دیکھا پھر بولا

”اچھا تو یہ بات ہے،“ یہ کہہ کر اس نے باہر کی طرف ہانک لگا کر کہا”اُوئے بشیرے،۔۔۔اوئے ڈال اوئے اِس کو اندر۔۔۔اقدامِ خودکشی کے کیس میں۔۔۔ذرا اسے پتہ چلے۔۔۔مرنا کسے کہتے ہیں۔۔۔ڈال اسے حوالات میں۔۔۔اور پانی تک نہیں دینا اسے۔۔۔مرتا ہے تو مر جائے۔۔۔“

اس کی آواز کی بازگشت میں ایک سپاہی نے آکر انسپکٹر کے حکم پر امین آرائیں کو جکڑ کر حوالات کی طرف لے جانے لگا۔اس کے ساتھ آئے دونوں بندے ہونقوں کی طرح یہ ساری کاروائی دیکھتے رہے۔ تبھی انسپکٹر نے انہیں گھور کر

دیکھا اور وہاں سے چلے جانے لے لئے ہاتھ کا اشارہ کیا تو چپ چاپ تھانے سے باہر نکل گئے۔ انسپکٹر چند لمحے اپنی کرسی پر بیٹھا رہا اور پھر اٹھ کر تیزی سے باہر چلا گیا۔ تھانے میں امین آرائیں کی چیخیں گونجنے لگی تھیں۔

(جاری ہے باقی آئندہ شمارے میں)

مبارک ہو مبارک ہو مبارک ہو

داستان دل اپریل سے کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے

اب آپ داستان دل اپنے گھر، ہوسٹل، آفس، کالج کے ساتھ ساتھ دنیا کے کسی بھی کونے میں حاصل کر سکتے ہیں، تو ابھی اپنا نام ممبر شپ میں فائنل کروائیں

معلومات ممبر شپ:

سالانہ بمعہ ڈاک خرچ	:	1200/-
چھ ماہ بمعہ ڈاک خرچ	:	600/-
تین ماہ	:	300/-

(ممبر شپ 03225494228 اس نمبر پر موبی کیش اکاونٹ میں جمع کروا کہ اپنا ایڈریس اسی نمبر پر واٹس اپ یا مسیج میں سینڈ کریں)

مزید معلومات کے لیے: 03225494228 واٹس اپ / موبائل نمبر

عنوان میری اُجالا

مصنف حسیب اشرف

کمرے میں داخل ہوتے ہی اُس کی نظر فہد پر پڑی جو ابھی تک نیند کی وادی میں گم تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر کھڑکی سے پردہ ہٹایا تو سورج کھڑکی سے اندر جھانکنے لگا۔ سورج کی کرنوں سے اُسے اپنے چہرے پر تپش محسوس ہوئی تو اُس نے اپنا چہرہ کمبل کے پیچھے چھپا لیا۔

"فہد اُٹھو کب تک سوتے رہو گے" ماہم نے کمبل سرکاتے ہوئے کہا۔

"کیا یار ماہم تم بھی کسی چڑیل کی طرح ناک میں دم کرنے کے لیے آجاتی ہو" اُس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"اگر میں چڑیل ہوں تو چڑیل کا شوہر کیا ہوا۔۔۔؟" اُس نے شوخ نظروں سے فہد کو دیکھا۔

"جن۔۔۔"؟ اُس نے بھی اُسی انداز میں جواب دیا۔

"عینک والا جن۔۔۔" اُس نے چشمہ فہد کی طرف پھینکا اور زور سے قہقہہ لگایا۔

"اچھا یار جاؤ اور مجھے آرام سے سونے دو" اُس نے عینک سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور پھر سے کمبل اُوڑھ لیا۔

"فہد پلیز اُٹھ جاؤ تمھیں پتا ہے آج دس مارچ ہے؟"۔

"ہاں یار پتا ہے آج دس مارچ ہے۔۔۔ اتوار ہے اور چھٹی کا دن ہے" اُس نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"آج اُجالا کی سالگرہ بھی ہے یہ بھی یاد ہے کہ نہیں" اُس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"اوہ۔۔۔ شٹ میں تو بھول ہی گیا تھا" یہ سن کر وہ

ہڑبڑاہٹ میں اُٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"ابھی یاد آ گیا نہ اس لیے جلدی سے اُٹھو ہمیں بہت ساری تیاریاں کرنی ہیں"۔

"ٹھیک ہے تم ناشتہ تیار کرو میں پانچ منٹ میں آیا پھر مل کر اُجالا کی سالگرہ کی پارٹی کی تیاری کرتے ہیں"۔

"ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں جلدی سے نیچے آ جاؤ۔۔۔"اُس نے حکم دینے کے سے انداز میں کہا۔

"یس باس"اُس نے بھی فرمانبردار خادم کی طرح سر جھکا دیا۔

***

آج گھر کو خوب سجایا گیا تھا ایک شاندار کیک بھی ٹیبل پر رکھا ہوا تھا لیکن کیک کاٹنے کے لیے جس کا انتظار تھا شاید وہ نہیں آنے والی تھی۔

"فہد آج پورے پانچ سال ہو گئے ہیں ہم ہر سال اس دن اپنے پورے گھر کو سجاتے ہیں کیک بھی لاتے ہیں اور پھر خود ہی اس کیک کو کاٹتے اور خود ہی کھاتے ہیں اگر کوئی اور ہماری یہ حالت دیکھے تو ہمیں پاگل سمجھے گا"۔

"تو اور ہے ہی کون ہمارا یہاں جو کسی کو انوائیٹ کریں"۔

"کتنی عجیب بات ہے نہ ایک میں ہوں جس کا اس دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں اور ایک تم ہو جو اتنا بڑا خاندان ہوتے ہوئے بھی بالکل تنہا زندگی گزار رہے ہو"اُس نے سوالیہ نگاہوں سے فہد کو دیکھا۔

"تنہا کہاں ہوں تم ہو نہ میرے ساتھ"اُس نے بات کو گول کرنے کی کوشش کی۔

"لیکن وہ تو نہیں ہے جس کے لیے تم یہ پارٹی منا رہے ہو"وہ بالکل بھی مذاق کے موڈ میں نہیں تھی۔

"تو کیا کروں یار۔۔۔تم تو جانتی ہو میں اُس کی سالگرہ میں شرکت نہیں کر سکتا اسی لیے خود ہی اُس کی سالگرہ منا کر اپنا من ہلکا کر لیتا ہوں"اُس نے ایک سرد آہ بھری۔

"جب سے ہماری شادی ہوئی ہے تب سے تم ایک بار بھی اپنے گھر والوں سے ملے ہو اور نہ ہی وہ تم سے ملنے آئے ہیں انسان کی زندگی میں اُس کے خاندان کی بہت اہمیت ہوتی ہے اور تم خوش قسمت ہو کہ تمھارا خاندان ہے اس لیے جاؤ اور جا کر ملو اپنے خاندان والوں سے اُجالا سے جس کے بغیر تم گُٹ گُٹ کے

زندگی گزار رہے ہو"۔

"بس یار ہے کوئی مجبوری جس کی وجہ سے۔۔۔"۔

"فہد میں زندگی کے اس سفر میں تمھاری ہم سفر ہوں کیا تم اپنی یہ مجبوری مجھے بھی نہیں بتاؤ گے"اُس نے فہد کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"کیا کرو گی جان کر۔۔۔؟"اُس نے سوالیہ نگاہوں سے ماہم کی طرف دیکھا۔

"تمھاری واپسی کا کوئی چارہ کروں گی"۔

"میں جن راستوں سے ہو کر یہاں آیا ہوں اب واپسی ممکن نہیں ہے"اُس نے ایک سرد آہ بھری۔

"پانچ سال گزر گئے ہیں فہد کیا تمھیں اپنے گھر والوں کی یاد نہیں آتی"اُس نے ایک بار پھر سے اُس کے دکھ کو تازہ کرنے کی کوشش کی۔

"پانچ سال تو ہماری شادی کو ہوئے ہیں میں تو پچھلے آٹھ سال سے اپنے گھر والوں سے دور ہوں"اُس نے ماہم کی بات درست کرتے ہوئے کہا۔"اور رہی بات یاد کرنے کی تو یہ تو تم بھی جانتی ہو کہ میں اُن سب کو اور خاص طور پر اُجالا کو کتنا یاد کرتا ہوں"۔

"اُجالا تمھاری اکلوتی بہن ہے نہ۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ کتنی ہی دعاؤں کے بعد اللہ تعالیٰ نے بابا کو دو بیٹوں کے بعد ایک بیٹی سے نوازہ تھا۔ بابا کا ماننا تھا کہ یہ بیٹی اُن کی زندگی میں نئی خوشیاں لے کر آئے گی اور غم کے اندھیروں کو دور کر دے گی اس لیے اُنھوں نے اپنی بیٹی کا نام اُجالا رکھا تھا۔ میں دس سال کا تھا اور ساحر سات سال کا تھا جب اُجالا پیدا ہوئی تھی ہم دونوں بھائی اپنی پری سی بہن کو پا کر بہت خوش تھے اور بابا کی توقعات بالکل درست ثابت ہوئیں اور اُجالا کے آتے ہی اُن کی زندگی میں بہار آگئی۔ کاروبار میں دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی ہونے لگی۔ اُجالا تو پہلے ہی سب کو پیاری تھی اب سب کی آنکھ کا تارہ بن گئی تھی"۔

"دیکھنے میں کیسی تھی وہ۔۔۔"۔

"بالکل پریوں جیسی۔۔۔ بلکہ پریوں جیسی کیا پری ہی تو تھی وہ معصوم سا چہرہ نیلی آنکھیں جس کی نظر اُس پر پڑتی تو وہ بس صرف اُسے ہی دیکھنا چاہتا تھا، سکول سے واپسی کے بعد سارا دن اُس کے ساتھ کھیلنے میں ہی نکل جاتا تھا میں نے اپنے سارے کھلونے اُجالا کو دے دیے تھے اور اسی بات پر ساحر مجھ سے جھگڑا کرتا تھا

کہ اُجالا کے آنے کے بعد اُس کی قدر و قیمت کم ہو گئی ہے" اس بات پہ وہ بے اختیار مسکرا دیا تھا اور اُس کے ساتھ ماہم بھی مسکرا دی تھی۔

"کتنی بڑی تھی جب تم اُسے چھوڑ کر آئے تھے"۔

"پورے دس سال کی تھی میری شہزادی جب آخری بار اُسے دیکھا تھا اب تو وہ مجھ سے بھی لمبی ہو گئی ہو گی ،پتا ہے گھر میں سب اُس سے پیار کرتے تھے بابا بھی اُس کی ہر خواہش پوری کرتے تھے لیکن پھر بھی جب اُسے کسی چیز کی ضرورت ہوتی تھی وہ میرے پاس ہی آتی تھی اور پیار سے میرے گلے کے گرد اپنی بانہیں پھیلا دیتی اور اپنی کوئل سی آواز میں کہتی تھی کہ بھائی مجھے فلاں چیز چاہیے اور میں بھی اُسی وقت اُس کی وہ خواہش پوری کرنے نکل جاتا تھا اُس کی آنکھوں میں [illegible] آ گئے تھے۔

"جب تم لوگ اتنے ہی خوش تھے اپنی زندگی میں تو پھر تم لوگ جدا کیسے ہو گئے آخر ایسا کیا ہوا تھا جس کی وجہ سے تمھیں سب کچھ چھوڑ کر یہاں آنا پڑا" وہ آج ہر ایک راز جان لینا چاہتی تھی۔

بابا کی ایک بڑی بہن تھی جن کہ شوہر فوج میں تھے تقریباً اُجالا کی پیدائش کے ایک سال بعد جب اُن کی شہادت کی خبر ملی تو بابا پھوپھو کو ہمارے گھر لے آئے اور پھر اُنھوں نے ہمارے ساتھ ہی رہنا شروع کر دیا تھا۔

"کیا تمھاری پھوپھو کی وجہ سے تم یہاں۔۔۔؟" ماہم نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

"نہیں پھوپھو کی بڑی بیٹی سائرہ کی وجہ سے۔۔۔"۔

"سائرہ کی وجہ سے" اُس نے خیرت بھری نگاہوں سے فہد کی طرف دیکھا۔

"ہوں" اُس نے اثبات میں سر ہلایا۔

***

آج گھر میں سائرہ کو دیکھنے کے لیے لڑکے والے آنے والے تھے اور اسی لیے وہ بھی خوب تیار ہو رہا تھا کیونکہ بابا کی ہدایت کے مطابق اُسے ہی مہمانوں کا استقبال کرنا تھا اُس نے گرے کلر کا تھری پیس زیب تن کیا اور سامنے پڑے ہوئے ٹیبل سے سپرے اپنے اوپر انڈیلی۔

"فہد بھائی مہمان آ گئے ہیں اور نیچے آپ کا انتظار کر رہے ہیں" اُس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ سائرہ تھی۔

"سائرہ رکو" وہ مڑ کر جانے لگی تو اُس نے پیچھے سے آواز دی۔

"کیا تم اس رشتے سے خوش تو ہو میرا مطلب ہے کہ تم تو ثاقب کو جانتی ہو اُس کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھی ہو" وہ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اُس کی مرضی جان لینا چاہتا تھا۔

"جہاں تک یونیورسٹی کی بات ہے تو میں یونیورسٹی میں صرف پڑھائی کرنے جاتی تھی دوستیاں بنانے نہیں اور رہی بات خوشی کی تو اگر اس رشتے سے آپ سب لوگ خوش ہیں تو۔۔۔ میں بھی خوش ہوں"۔

"کیا مطلب کہ ہماری خوشی میں تم بھی خوش ہو کیا تمھاری اپنی کوئی مرضی نہیں"۔

"شریف گھرانے کی لڑکیاں اپنے گھر والوں کی خوشی میں ہی خوش ہوتی ہیں" اُس کے اس جواب کے بعد وہ بالکل لاجواب ہو گیا تھا۔

"بھائی آپ ابھی تک تیار نہیں ہوئے نیچے سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں" اُجالا نے رعب ڈالنے والی آواز میں کہا۔

"بیٹا تیار ہی تو کھڑا ہوں یہ تو تمھاری سائرہ آپی نے باتوں میں لگا دیا ورنہ میں تو نیچے جانے ہی والا تھا" اُس نے سارا الزام سائرہ پر ڈال دیا۔

سب کی رضامندی سے رشتہ پکا ہو گیا اور جلد ہی نکاح کی تاریخ بھی رکھ دی گئی۔

**

رُخصتی کی تاریخ نکاح کے ایک ہفتے بعد کی تھی وقت بہت کم تھا لیکن محمود ہاؤس میں تیاریاں زور و شور سے جاری تھی اور پھر وہ دن بھی آن پہنچا جس دن رُخصتی ہونی تھی۔ سب لوگ بے صبری سے بارات کے آنے کا انتظار کر رہے تھے لیکن بارات تو نہیں آئی البتہ ایک بری خبر آ گئی۔

"محمود صاحب سننے میں آیا ہے کہ دولہے کی کار کو حادثہ ہو گیا ہے اور اُس میں سوار سب لوگ جاں بحق ہو گئے ہیں" ایک پڑوسی نے محمود صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد ہجوم میں ایک شور سا بھرپا ہو گیا کوئی کہنے لگا کہ ہائے بیچاری قسمت کی ماری ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی جو بیوہ ہو گئی اور ایک عورت نے تو حد ہی کر دی " دیکھو کتنی منحوس ہے یہ لڑکی جس کے ساتھ

رشتہ جڑتے ہی بیچارے کا موت سے ناطہ
جڑ گیا" یقیناً یہ سب سائرہ کے لیے آسان نہیں تھا
لیکن اُس نے بڑی ہمت سے یہ سب کچھ برداشت کیا۔

***

"ہائے۔۔۔ میری بچی کی قسمت بھی کتنی پھوٹی ہے کہ
ابھی تو اُس کے ہاتھوں سے مہندی کا رنگ بھی نہیں
اُترا تھا اور وہ بیوہ بھی ہو گئی"۔

"ایسا نہ کہو فضیلہ خدا کے فیصلوں پر اعتراض کرنے کی
ہماری اوقات نہیں ہے" محمود صاحب کو اُس کا یوں
بین کرنا اچھا نہیں لگا تھا۔

"میں خدا کے فیصلے پر اعتراض نہیں کر رہی بھائی میں تو
اپنی بچی کی قسمت پر رو رہی ہوں"۔

"ایسا نہ کہو خدا پر یقین رکھو اُس نے ہماری بچی کے لیے
کچھ اچھا ہی سوچا ہو گا" محمود صاحب نے دلاسہ دیتے
ہوئے کہا۔

"جس لڑکی کے لیے سارا محلہ باتیں بنا رہا ہو اور اُسے
منحوس کہہ رہا ہو اُس کے لیے اچھا کیا ہو گا اب کون
کرے گا میری بیٹی سے شادی" فضیلہ کے دل کی بات
زبان پر آ ہی گئی۔

"دیکھو اس وقت میں یہ بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن
اب تم نے مجبور کر ہی دیا ہے تو دھیان سے سنو میں
نے فیصلہ کیا ہے کہ سائرہ کی عدت پوری ہوتے ہی فہد
اور سائرہ کا نکاح کر دیا جائے"۔

محمود صاحب کی بات سُن کر فضیلہ کا چہرہ کھل اُٹھا۔

"لیکن بھائی آپ نے اس بارے میں فہد سے بات کی
ہے" وہ اپنے تمام تر خدشات دور کر لینا چاہتی تھی۔

فہد سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے وہ میرا بیٹا
ہے وہ کبھی میری بات نہیں ٹالے گا" محمود صاحب
نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔

"لیکن پھر بھی ایک بار۔۔۔"۔

"اپنے دماغ سے سارے خدشے دور کر دو سائرہ کی
عدت ختم ہونے میں دس دن باقی ہیں اور اسی لیے میں
نے فہد کو بھی لندن سے یہاں بلا لیا ہے ٹھیک آج سے
پندرہ دن بعد یعنی کے جمعے کے روز ان دونوں کا نکاح
کر دیا جائے گا" محمود صاحب نے اُس کی بات کاٹتے
ہوئے کہا۔ فضیلہ بھی جانتی تھی کہ اب اگر محمود
صاحب نے کہہ دیا ہے تو یہ ہو کر ہی رہے گا کیونکہ کسی
کی بھی محمود صاحب کے فیصلے کے خلاف جانے کی

ہمت نہیں تھی۔

***

"بابا میری زندگی کا اتنا بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے آپ نے ایک بار بھی مجھ سے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا" اُسے محمود صاحب کا فیصلہ سُن کر دکھ ہوا تھا۔

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے تم میرے بیٹے ہو کیا میرا اتنا بھی حق نہیں ہے کہ میں تمھاری زندگی کے بارے میں کوئی فیصلہ کر سکوں"۔

"آپ کو حق ہے بابا لیکن میں سائرہ سے شادی کیسے کر سکتا ہوں"۔

"کیوں کیا کمی ہے سائرہ میں" محمود صاحب کی نظروں میں خیرت تھی۔

"بات کمی کی نہیں ہے آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم بچپن سے بہن بھائیوں کی طرح رہے ہیں اور اب آپ کہہ رہے ہیں کہ میں اُس سے شادی کرلوں"۔

"شریف گھرانے کہ بچوں کی یہی نشانی ہوتی ہے اور سائرہ تمھاری پھوپھو کی بیٹی ہے اور ہمارا مذہب پھوپھو زاد بہن سے شادی کی اجازت دیتا ہے" محمود صاحب نے اسلام کی تعلیمات یاد کرواتے ہوئے کہا۔

"بابا ہمارا مذہب بچوں کی شادی کرنے سے پہلے اُن کی مرضی جان لینے کی اجازت بھی دیتا ہے" مذہب کے بارے میں وہ بھی جانتا تھا۔

"فہد تمھیں ہم نے لندن پڑھنے کے لیے بھیجا تھا اس لیے نہیں کہ تم اپنی تہذیب اور ثقافت کو بھول جاؤ یہ کونسا طریقہ ہے اپنے بابا سے بات کرنے کا" مسز محمود نے بھی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

"امی، بابا میں اپنے رویے کے لیے آپ دونوں سے معافی چاہتا ہوں لیکن پلیز مجھے اس شادی کے لیے مجبور نہ کریں ابھی تو میری پڑھائی بھی پوری نہیں ہوئی" اُس نے درخواست کرنے سے کہ انداز میں کہا۔

"تم چاہو یا نہ چاہو میں فضیلہ کو زبان دے چکا ہوں اس لیے اب اگر تمھارے دل میں میرے لیے تھوڑی سی بھی عزت یا احترام ہے تو تم میرا فیصلہ مان لو ورنہ تمھاری مرضی۔۔۔" محمود صاحب نے جذبات کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔

"بابا۔۔۔" محمود صاحب اپنے کمرے میں جانے لگے تو اُس نے پیچھے سے آواز دی لیکن وہ سُنے بغیر اپنے کمرے میں چلے گئے۔

"امی آپ تو مجھے سمجھنے۔۔۔"۔

"فہد بیٹا سمجھنے کی کوشش تم کرو یہ ہماری عزت کا سوال ہے اس وقت لوگ سائرہ کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کر رہے ہیں اُسے منحوس کہہ رہے ہیں اس لیے تمھاری شادی اُس کے ساتھ ہونا بہت ضروری ہے تاکہ لوگوں کی زبانیں بند ہو سکیں" مسز محمود نے اُسے نصیحت کرنے کی کوشش کی۔

"لیکن اُس کی شادی کسی اور کے ساتھ بھی تو ہو سکتی ہے"۔

"بیٹا سب لوگ اُسے منحوس سمجھ رہے ہیں ایسے میں کوئی بھی اُس سے شادی کرنے کے لیے تیار نہیں ۔۔۔فہد بیٹا تم میرے اچھے بیٹے ہو اس لیے چپ چاپ اپنے بڑوں کے فیصلے کو مان لو ہمیشہ خوش رہو گے" مسز محمود اُسے تسلی دے کر چلی گئیں اور وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

***

"السلام۔۔۔و۔۔۔علیکم" وہ اپنے کمرے میں نیم دراز حالت میں لیٹا ہوا تھا کہ اُجالا کی آواز سنتے ہی اپنی ساری پریشانیاں بھول کر فوراً اُٹھ کھڑا ہوا۔

"وا علیکم السلام۔۔۔کیسی ہے میری شہزادی بہن" اُس نے اُجالا کو اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے کہا۔

"بھائی آپ کے تو امتحان ہونے والے تھے پھر آپ اتنی جلدی کیسے واپس آ گئے" وہ وہیں اُس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"ہاں بیٹا آنا تو امتحان کے بعد ہی تھا لیکن وہ بابا نے کسی ضروری کام سے بلا لیا لیکن لگتا ہے تمھیں میرے آنے سے زرا بھی خوشی نہیں ہوئی"۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے میں تو آپ کے آنے سے بہت خوش ہوں اچھا آپ میرے لیے کیا لائے" اُس نے معصومیت بھرے انداز سے کہا۔

"تمھارے لیے۔۔۔ایک بہت ہی پیاری سے گڑیا بالکل تمھارے جیسی وہ وہاں میرے بیگ میں پڑی ہے جاؤ لے لو"۔

"واؤ۔۔۔یہ تو بہت ہی پیاری ہے" اُس نے بیگ سے گڑیا نکالتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم سے زیادہ نہیں ہے۔۔۔اچھا یہ بتاؤ گھر میں باقی سب کیسے ہیں اور ساحر تمھارے ساتھ جھگڑا تو نہیں کرتا"۔

”نہیں ساحر بھائی جھگڑا نہیں کرتے اور باقی سب تو ٹھیک ہیں لیکن سائرہ آپی آج کل بہت کم بولتی ہیں ،اپنے کمرے سے باہر بھی نہیں آتی اور اکثر روتی رہتی ہیں، میں نے سب سے پوچھا کہ سائرہ آپی کو کیا ہوا ہے لیکن کوئی کچھ نہیں بتاتا۔۔۔بھائی کیا آپ کو پتا ہے کہ سائرہ آپی کو کیا ہوا ہے“۔

”ہوں۔۔۔ نہیں۔۔۔اُجالا بیٹا آپ کو تو پتا ہے کہ میں ابھی لندن سے واپس آیا ہوں مجھے کیسے پتا ہو گا کہ سائرہ کو کیا ہوا ہے“اُس نے بات کو ٹال مٹول کرنے کی کوشش کی۔

”پہلے وہ کتنا خوش رہتی تھی لیکن اب۔۔۔“اُس نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔

”اُجالا۔۔۔بیٹا آپ پریشان نہ ہو وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی اور پھر سے پہلے کی طرح خوش رہنے لگے گی“۔

”اور میرے ساتھ پہلے کی طرح کھیلا بھی کریں گی“اُس کا چہرہ اچانک خوشی سے کھل اُٹھا تھا۔

”ہاں۔۔۔“۔

”پرامس“۔

”پکا پرامس۔۔۔ابھی تم جاؤ میں تھوڑی دیر میں تیار ہو کر آتا ہوں پھر کہیں گھومنے چلتے ہیں“۔

”آئس کریم کھانے چلیں گے“اُس نے فرمائش کرتے ہوئے کہا۔

”جہاں تم کہو گی وہاں چلیں گے“۔

”ٹھیک ہے بھائی۔۔۔میں نیچے آپ کا انتظار کر رہی ہوں آپ جلدی سے تیار ہو کر آجائیں“۔

“ok”اُجالا کے باہر جاتے ہی اُس نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور واپس پلنگ پر آکر لیٹ گیا۔

***

وہ باہر سے تھکا ہوا آیا اور آتے ہی ہال میں پڑے ہوئے صوفے پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھ گیا اور صوفے کی پشت پر سر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔

”فہد بھائی“ جیسے ہی آواز اُس کے کانوں میں پڑی تو اُس نے اپنی آنکھیں کھول کر دیکھا تو سامنے مائرہ تھی (سائرہ کی چھوٹی بہن)۔

”آؤ مائرہ بیٹھو۔۔۔“ اُس نے اپنے سامنے والے صوفے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”فہد بھائی میں آپ کو یہ بتانے آئی ہوں کہ سائرہ

آپ سے بات کرنا چاہتی ہے"۔

"سب ٹھیک تو ہے سائرہ نے مجھ سے کیا بات کرنی ہے"
سائرہ کے بلاوے نے اُسے سوچ میں ڈال دیا تھا۔

"یہ تو اُس نے نہیں بتایا لیکن وہ سٹڈی روم میں آپ کا انتظار کر رہی ہے"۔

"ٹھیک ہے تم جاؤ میں سٹڈی روم میں جا رہا ہوں" مائرہ اپنے کمرے کی طرف چلی گئی اور وہ سٹڈی روم کی طرف ہو لیا۔

**

"آ جائیں" دروازے پر دستک ہوئی تو اُس نے اندر سے جواب دیا۔

"السلام و علیکم" اُس نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"وا علیکم السلام" اُس نے بجھے سے انداز میں جواب دیا۔

"جو کچھ تمھارے ساتھ ہوا مجھے اُس کا بے حد افسوس ہے" اُس نے مشکل سے بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"اب تو چار مہینے گزر گئے اس بات کو اور آپ اب افسوس کر رہے ہیں" اُس نے نم آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھا تو شرم سے اُس کا سر جھک گیا۔

"میں تو پہلے ہی آنا چاہتا تھا لیکن پھر تم عدت میں تھی اس لیے میں۔۔۔"۔

"خیر جو ہونا تھا ہو گیا۔۔۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ گھر والے اس جمعے کو ہمارا نکاح کروانا چاہتے ہیں"۔

"ہاں میں جانتا ہوں" اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔

"میں جانتی ہوں کہ آپ اس فیصلے سے خوش نہیں ہیں ماموں نے زور زبردستی سے آپ کو منایا ہو گا" اُس نے فہد کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ لگانے کی کوشش کی۔

"میں کوئی بچہ تو نہیں ہوں جو کوئی میرے ساتھ زور زبردستی کرے گا اور رہی بات میری خوشی کی تو جس فیصلے سے گھر والے خوش ہیں اس میں میری بھی خوشی ہے"۔

"لیکن میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی" اُس نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا کمی ہے مجھ میں" وہ اُس کا جواب سن کر دنگ رہ گیا تھا۔

”آپ میں کوئی کمی نہیں ہے لیکن لوگ کہتے ہیں کہ میں منحوس ہوں اگر میری وجہ سے آپ کو کچھ ہو گیا تو۔۔۔“ بالآخر اُس نے اپنا خدشہ ظاہر کر ہی دیا۔

”میں ان بکواس باتوں پر یقین نہیں کرتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے اور اللہ کی اشرف بنائی ہوئی چیز منحوس تو نہیں ہو سکتی“۔

”لیکن اگر آپ کو کچھ ہو گیا تو۔۔۔“ اُس نے ایک بار پھر اپنی بات دہرائی۔

”مجھے جو ہونا ہے وہ ہو کر ہی رہے گا اس لیے اپنے دماغ سے سارے وہم نکال دو۔۔۔ اور ہاں لوگ جو کہتے ہیں اُنھیں کہنے دو مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور تمھیں بھی نہیں پڑھنا چاہیے“ اُس نے غصیلے انداز میں کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

***

جمعہ کے مبارک روز نکاح کی تیاری کی گئی تھی۔ فضیلہ کی خوشی تو دیدنی تھی اور باقی سب بھی بہت خوش تھے لیکن یہ خوشی صرف چند لمحوں کی ثابت ہوئی۔ عمر اور ساحر جس جھومر کے نیچے کھڑے ہو کر باتیں کر رہے تھے کہ اچانک جھومر کی رسی کھل گئی اور وہ نیچے آن گرا۔ وہ تو عین اُسی وقت ساحر کی نظر جھومر پر پڑھ گئی اور اُس نے فہد کو دھکا مارا اور خود بھی دور جا گرا لیکن فہد کا سر ٹیبل سے ٹکرا گیا اور وہ وہیں بے خوش ہو گیا۔ محمود صاحب اور ساحر نے اُسے اُٹھایا اور ہسپتال لے گئے اور یہاں مسز محمود اور سائرہ کا رو رو کر بُرا حال تھا۔

”ارے بھابھی ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ لڑکی منحوس ہے ارے پہلے ہی اپنے سابقہ شوہر کو کھا چکی ہے اور اب آپ کے بیٹے کے ساتھ رشتہ جڑنے والا تھا کہ وہ ہسپتال پہنچ گیا“ حالات کا فائدہ اُٹھا کر ایک عورت مسز محمود کے پاس آئی اور اُن کہ کان بھرنے لگی۔

”زرا سوچیے اگر یہ نکاح ہو گیا تو آپکا بیٹا تو۔۔۔“۔ ”باقی ہمارا کام تو صلاح دینا تھا ماننا یا نہ ماننا آپ کی مرضی ہے“۔ اُس عورت کی باتوں کا مسز محمود پر ایسا گہرا اثر ہوا کہ وہ بھی سوچ میں پڑھ گئیں۔

**

نکاح کا پروگرام کینسل کر دیا گیا تھا سب لوگ اپنے

اپنے گھروں کو جا چکے تھے لیکن مسز محمود ابھی تک پریشان بیٹھی ہوئی تھیں۔

"بھابھی ہسپتال سے کوئی خبر آئی"فضیلہ نے مسز محمود سے پوچھا جو اپنے خیالوں میں گم تھی۔

"ہاں ساحر کا فون آیا تھا فہد اب پہلے سے بہتر ہے صبح تک گھر واپس آ جائے گا"۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میں ابھی یہ بات جا کر سائرہ کو بتاتی ہوں وہ تو اُس وقت سے کافی پریشان ہے"۔

"فضیلہ۔۔۔بیٹھو مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے "فضیلہ مڑ کر جانے لگی تو مسز محمود نے اُسے روکا۔

"جی بھابھی کہیے۔۔۔"انھوں نے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

دیکھو فضیلہ مجھے غلط مت سمجھنا۔۔۔لیکن میں چاہتی ہوں کہ فہد اور سائرہ کے نکاح والی بات کو یہیں ختم کر دیا جائے"۔

"بھابھی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں"فضیلہ نے خیرت بھری نگاہوں سے مسز محمود کو دیکھا۔

"تم تو جانتی ہو کہ سائرہ کے بارے میں لوگ شروع سے ہی باتیں کر رہے ہیں لیکن ہم لوگوں نے پھر بھی اُن سب باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے سائرہ کو اپنی بہو بنانے کا فیصلہ کیا لیکن جو کچھ بھی ہوا وہ تمھارے سامنے ہے"۔

"تو بھابھی آپ کیا کہنا چاہتی ہیں کہ یہ سب میری بیٹی کی وجہ سے ہوا ہے"فضیلہ نے سوالیہ نگاہوں سے مسز محمود کی طرف دیکھا۔

"میں کسی کو الزام نہیں دے رہی میں تو بس تمھیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر رہی ہوں کہ یہ شادی اب نہیں ہو گی اور میں فہد کو کل واپس لندن بھیج رہی ہوں"۔

"تو صاف صاف کہیے نہ کہ آپ نے بھی لوگوں کی طرح سائرہ کو منحوس سمجھ لیا ہے"فضیلہ نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

"اگر تم نے یہی سمجھنا ہے تو یہی سہی لیکن یہ شادی اب نہیں ہو گی میں نے کہہ دیا تو کہہ دیا"۔ مسز محمود نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا اس بات سے بے خبر کہ پیچھے سیڑھیوں پر کھڑی سائرہ سب کچھ سن رہی تھی۔

**

سورج طلوع ہو چکا تھا اور سب لوگ کھانے کی میز پر جمع ہو گئے تھے۔

”بشرہ تم نے فہد کے کمرے میں ناشتہ بھجوا دیا“ مسز محمود نے اپنی ملازمہ کو مخاطب کیا۔

”جی بیگم صاحبہ فہد صاحب ابھی سو رہے ہیں جب اُٹھ جائیں گے تو ناشتہ دے آؤں گی“۔

”ٹھیک ہے“۔

”ارے بھئی آج یہ سائرہ بیٹی کہاں رہ گئی روز تو وہ سب سے پہلے اُٹھ جاتی ہے اور کھانا بھی خود پیش کرتی ہے“ محمود صاحب کو سائرہ کی غیر موجودگی ناگوار گزری تھی۔

”بھائی جو کچھ بھی کل ہوا اُس کی وجہ سے وہ کافی پریشان تھی اسی لیے رات کو دیر سے سوئی ہو گی اُسے رہنے دے اپنے کمرے میں آپ لوگ کھانا شروع کیجیے“۔

”امی میں کب سے دروازے پر دستک دے رہی ہوں لیکن سائرہ باجی نہ تو دروازہ کھول رہی ہیں اور نہ ہی کچھ بول رہی ہیں“ جیسے ہی وہ کھانا شروع کرنے لگے مائرہ بھاگتی ہوئی آئی اُس کے چہرے پر بارہ بجے ہوئے تھے۔

”یا اللہ خیر۔۔۔میری بچی کو کچھ ہو تو نہیں گیا“ فضیلہ نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

سب بے اختیار سائرہ کے کمرے کی جانب بھاگے فہد بھی شور سن کر اپنے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔

”سائرہ۔۔۔بیٹا دروازہ کھولو“ فضیلہ نے آواز دیتے ہوئے کہا۔

”بشرہ جاؤ اور میرے کمرے سے چابیاں لے کر آؤ“ مسز محمود نے ملازمہ کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

”چابیاں ڈھونڈنے کا وقت نہیں ہے امی یہ دروازہ ہی توڑنا پڑے گا“ ساحر اور محمود صاحب نے مل کر دروازے کو چھ سات دھکے دیے تو ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ سائرہ سامنے بستر پر بے سدھ پڑی ہوئی تھی اور اُس کے منہ سے جھاگ نکل رہی تھی۔ فضیلہ بیگم کی تو یہ دیکھ کر جان ہی حلق میں آ گئی تھی۔ مائرہ نے بھاگ کر اُسے سیدھا کیا اور اُس کے اوپر چادر اُوڑھ دی۔

”مجھے لگتا ہے کہ سائرہ باجی نے چوہے مار گولیاں کھالی ہیں“ ملازمہ نے اپنا اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

”کیا بکواس کر رہی ہو تم بشرہ۔۔۔“ مسز محمود نے اُسے جھاڑتے ہوئے کہا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں کل رات کو وہ کچن میں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں میں نے پوچھا تو مجھے کہہ دیا کہ ماچس ڈھونڈ رہی ہوں جبکہ ماچس سامنے پڑی ہوئی تھی''۔

''یہ وقت ان فضول باتوں کا نہیں ہے ساحر بیٹا جلدی سے گاڑی نکالو ہمیں سائرہ کو اسی وقت ہسپتال لے کر جانا ہوگا''۔

''بابا میں نے ڈاکٹر جبار کو فون کر دیا ہے وہ آنے ہی والے ہونگے''۔

**

''معافی چاہتا ہوں لیکن سائرہ بیٹی کی روح تو کب کی پرواز کر چکی ہے''ڈاکٹر جبار نے بغور معائنہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ سنتے ہی گھر میں ایک کہرام مچ گیا تھا فضیلہ بی بی کی حالت تو غیر ہو رہی تھی، سب لوگ خیران تھے کہ سائرہ جیسی معصوم لڑکی اتنا بڑا اقدم کیسے اُٹھا سکتی ہے۔ خبر سنتے ہی آس پڑوس کے لوگ بھی تعزیت کے لیے جمع ہو گئے تھے۔

''بہت دکھ ہوا فضیلہ بہن یہ سن کر آخر تمھاری بھابھی نے تمھاری بیٹی سے اپنی جان چھڑا ہی لی''ایک عورت نے فضیلہ بی بی سے تعزیت کرتے ہوئے کہا۔

''کیا مطلب''فضیلہ بی بی نے اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''تم تو بہت ہی بھولی ہو بہن ارے تمھاری بھابھی تو شروع سے ہی سائرہ کو اپنی بہو نہیں بنانا چاہتی تھی وہ تو محمود بھائی کی وجہ سے خاموش تھی ارے وہ تو کئی بار مجھ سے اس بات کا اظہار کر چکی ہیں اور تو اور میں نے اُنھیں ایک بابا سے تاویز لیتے ہوئے بھی دیکھا تھا''۔

''کیا بکواس کر رہی ہو تم۔۔۔'' فضیلہ نے اُسے جھاڑتے ہوئے کہا۔

''تمھارا دکھ بہت بڑا ہے بہن ابھی تم کو میری باتیں سمجھ میں نہیں آئیں گی چند روز گزر جانے دو پھر تفصیل سے سمجھاؤں گی ابھی میں چلتی ہوں خدا تمھیں یہ دکھ برداشت کرنے کا حوصلہ دے بہن۔۔۔

''فضیلہ تو پہلے ہی مسز محمود کے خلاف تھیں ہمسائی کی باتوں نے جلتی پر تیل چھڑکنے کا کام کیا۔

***

''یقین نہیں آتا کہ اس زمانے میں بھی ایسے تقیانوس لوگ پائے جاتے ہیں'' ماہم کو زمانے کی بے حسی پر

یقین نہیں آ رہا تھا۔

"لوگوں کی باتوں نے اُسے ذہنی طور پر اتنا پریشان کر دیا تھا کہ اُس نے اپنے ہی ہاتھوں اپنی جان لے لی"۔

"کیا تمھاری کزن نے صرف اس لیے اپنی جان دے دی کیونکہ لوگ اُسے منحوس کہتے تھے" اُسے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا۔

"پتا نہیں اُس نے اتنا بڑا قدم کیوں اُٹھایا لیکن اُس کے لکھے ہوئے اُس ایک خط نے میری پوری زندگی بدل کہ رکھ دی"۔

"کونسا خط اور کیا لکھا تھا اُس خط میں...؟"۔

"سائرہ نے مرنے سے پہلے ایک خط لکھا تھا جس میں لکھا ہوا تھا کہ۔۔۔ اُس نے میری وجہ سے خودکشی کی ہے"۔

"کیا تمھاری وجہ سے۔۔۔" ؟ ماہم نے سوالیہ نگاہوں سے فہد کی طرف دیکھا۔

"ہاں میری وجہ سے" اُس نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

**

فضیلہ بہن آپ نے مجھے بلایا تھا" وہ آرام کی غرض سے لیٹی ہوئیں تھی کہ کان میں پڑھنے والی آواز سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"آؤ نسیم میں تمھارا ہی انتظار کر رہی تھی" فضیلہ نے اُسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔

"اب بتاؤ مجھے اُس دن تم کیا کہہ رہی تھی"۔

"میں تو وہی کہہ رہی تھی جو میں نے دیکھا اور سنا تھا" وہ عورت اب بھی اپنی بات پر قائم تھی۔

"پہیلیاں مت بجھاؤ صاف صاف بتاؤ کیا دیکھا تھا تم نے "فضیلہ جاننے کے لیے بے چین تھی۔

"فضیلہ بہن یہ جو تمھاری بھابھی ہے نہ یہ کوئی عام عورت نہیں بلکہ بہت ہی چلاک ہے اس نے ہی تمھاری بیٹی کو منحوس مشہور کیا تھا اور تو اور تمھارے داماد پر بھی اسی نے کالا جادو کروایا تھا میں نے اپنی آنکھوں سے اُسے ایک بابا سے تاویز لیتے دیکھا تھا"۔

"بھابھی یہ سب کیوں کریں گی" فضیلہ کو ابھی تک یقین نہیں آیا تھا۔

"یہ تو مجھے نہیں پتا لیکن اگر تمھیں میری باتوں پر یقین نہیں تو میں تمھیں اُس بابا کے پاس لے جاؤں گی جس سے تمھاری بھابھی نے تاویز لیے تھے شاید وہ

تمھارے سوال کا جواب دے سکے"۔

"ٹھیک ہے کل صبح دس بجے آ جانا پھر ہم اُس بابا کے پاس جائیں گے فضیلہ کو اب بھی اُس کی باتوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا"۔

ٹھیک ہے بہن میں پورے دس بجے آ جاؤں گی لیکن تم اپنے ساتھ اپنی بھابھی کی کوئی تصویر لے لینا اور کچھ پیسے بھی لے لینا"۔

"کیوں تصویر کی کیا ضرورت ہے"؟۔

"ارے فضیلہ بہن وہ بابا بہت ہی مشہور ہے اُس کے پاس دن میں بہت سے لوگ آتے ہیں تو اُسے پہچاننے کے لیے تصویر کی ضرورت ہو گی"۔

"ٹھیک ہے اب تم جاؤ اور کل صبح دس بجے آ جانا "فضیلہ نے اُسے ہدایت کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں جاتی ہوں"۔

***

"یہ تم مجھے کہاں لے آئی ہو نسیم، اتنا گندہ راستہ ہر طرف جھاڑیاں، جانوروں کی ہڈیاں یہ کس واہیات جگہ رہتا ہے بابا"اُس نے اپنی ناک کہ آگے دوپٹہ رکھا ہوا تھا۔

"فضیلہ بہن یہ کالے جادو والے بابے اسی طرح گندی جگہوں پر رہتے ہیں میں نے سنا ہے کہ ایسی جگہوں پر رہنے سے ان کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے"۔

"یہ لوگ اپنی طاقت بڑھاتے ہیں تاکہ معصوم لوگوں کی زندگیاں برباد کر سکیں"۔

"وہ دیکھو فضیلہ بہن وہ سامنے والے گھر میں رہتا ہے وہ بابا جس سے تمھاری بھابھی نے تاویز لیے تھے"۔

"میں اپنی بھابھی کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ ایسی گندی جگہ پر کبھی بھی نہیں آ سکتی"۔

اب دروازے تک آ چکی ہو تو اندر آ کر ایک بار بابا سے مل لو پھر اُس کے بعد ہی فیصلہ کرنا کہ میں سچ بول رہی ہوں یا جھوٹ۔۔۔"۔

"سلام بابا۔۔۔یہ میری بہن فضیلہ ہے وہ جو عورت آپ سے تاویز لے کر گئی تھی نہ یہ اُس کی نند ہے"۔

"ہمارا کام تو لوگوں کی خدمت کرنا ہے اور میرے پاس تو دن میں بہت سے لوگ آتے ہیں مجھے کیا معلوم کہ تو کس عورت کی بات کر رہی ہے" بابا نے بڑے فخریہ انداز میں کہا۔

"بابا میں اس عورت کی بات کر رہی ہوں"اُس نے

تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ عورت۔۔۔ہاں یہ میرے پاس آئی تھی اپنی بیٹی کے لیے تاویز لینے کے لیے" بابا نے اپنے محسوس سے انداز میں کہا۔

"اُس کی بیٹی تو بالکل ٹھیک ہے پھر اُسے تاویز لینے کی کیا ضرورت ہے"فضیلہ بی بی نے خیرت بھری نگاہوں سے نسیم کی طرف دیکھا۔

"تمھیں اس بات سے کیا لینا دینا۔۔۔جاؤ بی بی اپنا کام کرو"۔

"بابا اُس عورت نے آپ سے جھوٹ بولا تھا اُس نے آپ سے جو تاویز لیے تھے اُن تاویزوں سے اُس نے میری بہن کی بیٹی کی جان لے لی ہے"نسیم نے فضیلہ کہ درد کو تازہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو بی بی۔۔۔؟"۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں بابا اسی لیے تو میں آپ سے پوچھ رہی ہوں کہ اُس نے آپ سے وہ تاویز کس لیے تھے آپ جتنے پیسے کہیں گے میں آپ کو دوں گی لیکن خدا کے لیے مجھے سچ بتا دیجے"۔

"اُس عورت نے مجھے کہا تھا کہ اُس کی ایک سات سال کی بیٹی ہے جس پر کسی نے جادو کیا ہوا ہے اس لیے میں نے اُسے تاویز دیئے تھے کہ وہ کسی طرح یہ اُس عورت کو کھلا دے جس نے اُس کی بیٹی پر جادو کیا ہے اس سے اُسکی بیٹی پر سے جادو کا اثر ختم ہو جائے گا اور اُس عورت پر الٹا اثر شروع ہو جائے گا" بابا نے تفصیل سے آگاہ کیا۔

"بابا جو تاویز آپ نے اُس عورت کو دیئے تھے اُس سے کیا اثرات ہو سکتے تھے"۔

"جو بھی وہ تاویز کھائے گا وہ بے چین ہو جائے گا اور اُس کی زندگی سے خوشی کے اُجالے دور اور غم کے سائے چھانے لگے گے اور وہ جو چیز چاہے گا وہ اُس سے دور ہو جائے گی اور لوگ اُس سے نفرت کریں گے اور اُس کی شکل بھی نہیں دیکھنا گوارہ کریں گے"۔

"کیا لوگ اُسے منہوس بھی سمجھے گے"نسیم نے اپنی طرف سے اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

"ہاں لوگ اُسے منہوس سمجھے گے اور اُس سے دور ہی رہیں گے" بابا نے بھی اُس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"فضیلہ بہن یہی سب تو ہماری سائرہ کے ساتھ ہوتا رہتا تھا"نسیم اور بابا کی باتیں سُن کر فضیلہ کا ذہن مزید

الجھ گیا تھا۔

"مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ میری بیٹی سے اُس کی کیا دشمنی تھی"۔

"یہ تو وہی بتا سکتی ہے کہ کس بات کا بدلہ لیا ہے اُس نے تم سے لیکن جو بھی تمھاری بھابھی نے کیا ہے وہ بہت غلط ہے اور میرے خیال سے تمھیں اس کا بدلہ ضرور لینا چاہیے" نسیم نے اُسے ورغلانے کی کوشش کی۔

"چلو میرے ساتھ میں ابھی جا کر بھائی کو بتاتی ہوں کہ اُس کی بیوی یہ سب کیا کرتی پھر رہی ہے"۔

"فضیلہ بہن رکو یہ تم کیا کرنے جا رہی ہو تم اچھی طرح جانتی ہو کہ محمود بھائی ان سب باتوں میں یقین نہیں کرتے اور تو اور اس بات کا تمھارے پاس کوئی ثبوت بھی تو نہیں ہے"۔

"تو پھر میں کیا کروں اُس عورت نے میری بیٹی کو اس قدر پریشان کیا کہ وہ خودکشی کرنے پر مجبور ہو گئی اور تم چاہتی ہو کہ میں اُسے چھوڑ دوں میں اُس ناگن کو اپنے ہاتھوں سے قتل کر دوں گی" فضیلہ نے غصیلے انداز میں کہا۔

"ارے فضیلہ بہن اپنے ہاتھوں سے اُسے مار دو گی تو خود بھی جیل چلی جاؤ گی جب ہمارے پاس کالے جادو جیسا ہتھیار ہے تو تمھیں اپنے ہاتھ خون سے رنگنے کی کیا ضرورت ہے" اُس نے مشورہ دیتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب ہے تمھارا" فضیلہ نے سوالیہ نگاہوں سے نسیم کی طرف دیکھا۔

"تم چلو میرے ساتھ میرے گھر میں تمھیں سب کچھ سمجھاتی ہوں"۔

***

"ہاں نسیم اب بتاؤ تم کیا کہنا چاہتی ہو" فضیلہ نے گھر کے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"ارے فضیلہ بہن پہلے آرام سے بیٹھ تو جاؤ پھر سب کچھ سمجھاتی ہوں"۔

"دیکھو تمھاری بھابھی سے بدلہ لینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُسے بھی وہی تکلیف دو جو اُس نے تمھیں دی ہے" نسیم نے اُس کے پاس چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"جو کچھ بھی کہنا ہے صاف لفظوں میں کہو"۔

"مطلب یہ کہ اگر تم اُسے مار دیتی ہو تو یہ تو اُس کے

لیے ایک بہت ہی چھوٹی سی سزا ہو گی تمھارا بدلہ صرف اسی صورت پورا ہو سکتا ہے کہ تم بھی اُس کے ساتھ وہی سب کرو جو اُس نے تمھارے ساتھ کیا ہے"۔

"مجھے اب بھی تمھاری بات کی کوئی سمجھ نہیں آئی"فضیلہ اُس کی پہیلیوں سے تھک چکی تھی۔

"ارے تم تو واقعی ہی بہت بھولی ہو میرا مطلب ہے کہ اگر اُس نے تمھیں اولاد کا دکھ دیا ہے تو تم بھی اُسے اولاد کا دکھ دو"اب اُس نے کھل کر وضاحت کی تھی۔

"تم کہنا چاہتی ہو کہ میں اپنی سائرہ کا بدلہ لینے کے لیے اُجالا کی جان لے لوں۔۔۔تم نے یہ سوچا بھی کیسے وہ معصوم بچی ہے میں کیسے اس کی جان لے سکتی ہوں"فضیلہ غصے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"تو کیا تمھاری سائرہ معصوم نہیں تھی اُس نے کسی کا کیا بھگاڑا تھا"نسیم نے اُسے جذبات میں لانے کی کوشش کی۔

"لیکن میں پھر بھی کسی کی جان نہیں لے سکتی"فضیلہ نے ایک بار پھر اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

"اگر تم اُس کی جان نہیں لینا چاہتی تو تمھاری بھابھی سے بدلہ لینے کا ایک طریقہ اور بھی ہے"۔

"وہ کیا۔۔۔" فضیلہ نے غور سے نسیم کو دیکھا۔"اُس نے تو تم سے ایک بیٹی دور کی ہے تم اُس کے تینوں بچوں کو اُس سے دور کر دو میرا مطلب یہ ہے کہ اُن سب کے دل میں ایک دوسرے کے لیے نفرت پیدا کر دو یعنی

کے اُس کے بچے زندہ بھی رہیں گے اور اُسے اولاد کی خوشیاں بھی نصیب نہیں ہونگی اور اس کی شروعات ہم فہد سے کریں گے"۔

"ہاں یہ طریقہ ٹھیک ہے اس سے کسی کی جان بھی نہیں جائے گی اور میرا بدلہ بھی پورا ہو جائے گا"۔

**

وہ اپنے کمرے میں نیند کی وادیوں میں گم تھا کہ اچانک زور زور سے دروازہ پیٹنے کے شور سے وہ اُٹھ گیا۔

"فہد۔۔۔دروازہ کھولو میں تمھیں جان سے مار دوں گا" محمود صاحب زور زور سے دروازہ پیٹ رہے تھے۔

فہد نے جیسے ہی دروازہ کھولا تو محمود صاحب نے تھپر مارنا شروع کر دیے اور اُسے کمرے سے گھسیٹ کر باہر

لے آئے۔

"بابا آپ مجھے اس طرح مار کیوں رہے ہیں۔۔۔میں نے کیا کیا ہے ؟"۔

"بے غیرت تجھے یہ سب کرتے ہوئے زرا بھی شرم نہیں آئی" محمود صاحب اُسے مارتے جا رہے تھے اور بڑبڑاتے جا رہے تھے۔

"بابا یہ آپ کیا کر رہے ہیں آخر بھائی نہ کیا کیا ہے جو آپ اُنھیں اتنی بری طرح سے پیٹ رہے ہیں" ساحر نے محمود صاحب سے فہد کا گریبان چھڑاتے ہوئے کہا۔

"کیا کیا ہے اس نے۔۔۔اس کمینے نے ایک معصوم لڑکی کو جان سے مار ڈالا۔۔۔"۔ محمود صاحب نے ایک دفعہ پھر سے اُسے دبوچنے کی کوشش کی۔

"یہ سب جھوٹ ہے" فہد نے اپنا جرم ماننے سے انکار کر دیا۔

"مرنے والا کبھی جھوٹ نہیں بولتا اور یہ رہا تمھارے گناہ کا ثبوت" محمود صاحب نے اپنی جیب سے ایک خط نکالا اور فہد کی جانب پھینکا۔

فہد نے خط کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔

"پیاری امی جان مجھے معاف کر دیں کے میں آپ کو اور مائرہ کو چھوڑ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جا رہی ہوں ،میں تھک گئی ہوں لوگوں کی باتیں سن سن کر اور اب تو مجھے خود بھی لگنے لگا ہے کہ میں منحوس ہوں۔لوگ تو پہلے بھی باتیں کرتے تھے لیکن میں نے اُن کی کبھی پرواہ نہیں کی لیکن آج صبح جب فہد ہسپتال سے واپس آیا تو وہ سیدھا میرے کمرے میں آیا اور مجھے کھری کھری سنانے لگا جیسے اُس پر جھومر میں نے گرایا ہو،اُس نے مجھے یہ احساس کروایا کہ میں واقعی منحوس ہوں۔وہ مجھ سے شادی نہیں کرنا چاہتا اور ماموں اپنے فیصلے کو بدلنے والے نہیں اس لیے مجھے ڈر ہے کہ کہیں میری یہ منحوسیت آپ میں سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے اس لیے میں آپ سب کو چھوڑ کر جا رہی ہوں۔

سائرہ"

"بابا میرا یقین کریں یہ سب جھوٹ ہے میں اُس دن سائرہ سے ملا بھی نہیں تو یہ سب کیسے کہہ سکتا ہوں"۔

"دیکھ لیں اپنے بیٹے کی حرکت بھائی صاحب پہلے تو

میری بیٹی کو خودکشی کرنے پر مجبور کیا اور اب میری مری ہوئی بیٹی پر بہتان باندھ رہا ہے"۔

"پھوپھو میرا یقین کریں میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے سائرہ سے یہ سب نہیں کہا پتا نہیں اُس نے ایسا کیوں۔۔۔میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا" اُس نے ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

"لیکن میری سمجھ میں آگیا ہے تم پہلے ہی اُس سے شادی نہیں کرنا چاہتے تھے اسی لیے تم نے اُس سے جان چھڑانے کے لیے یہ سب کچھ کیا" فضیلہ نے جلتی پر تیل پھینکا۔

"دفعہ ہو جا میری نظروں سے ورنہ میں تیری جان لے لوں گا" محمود صاحب ایک بار پھر جوش میں آ گئے۔

"خدا کا خوف کریں جوان بیٹے کو گھر سے نکال رہے ہیں" مسز محمود نے دخل اندازی کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں ہے یہ میرا بیٹا مر گیا ہے یہ آج سے ہمارے لیے اور ہم اس کے لیے۔۔۔میرے لیے تو پہلے ہی تیرے دل میں کوئی عزت نہیں تھی لیکن اگر تیری ماں اور بہن بھائیوں کے لیے کوئی پیار ہے تو دفعہ ہو جا اس شہر سے اس ملک سے اور پھر کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا" محمود صاحب نے آگ بھگولا ہوتے ہوئے کہا۔

یہ سب سُن کر تو فہد کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی ساحر اور مسز محمود نے اُسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ بوجھل قدموں سے گھر سے نکل گیا اور پھر کبھی واپس لوٹ کر نہیں آیا۔

***

"تم نے اپنے بابا کی باتوں کو اتنا سیریس لے لیا کہ آٹھ سال گزر گئے ایک بار بھی واپس جانے کی ہمت نہیں ہوئی" ماہم کو اُس کی اس حرکت پر بہت خیرت ہوئی تھی۔

"تم میرے بابا کو نہیں جانتی ماہم جب وہ ایک بار کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں تو پھر کچھ بھی ہو جائے وہ کبھی اپنا فیصلہ واپس نہیں لیتے"۔

"لیکن ہو سکتا ہے یہ سب کچھ اُنھوں نے غصے میں کہہ دیا ہو" ماہم نے اندازہ لگاتے ہوئے کہا۔

''لندن واپس آنے کے ایک مہینے بعد ایک دفعہ بڑی ہمت کر کہ گھر پر فون کیا تھا لیکن اتفاق سے بابا نے فون اُٹھالیا اور نے میری آواز پہچان لی اور مجھ سے کہا کہ اگر میں نے دوبارہ اُنھیں فون کرنے کی کوشش کی تو وہ اپنی جان دے دیں گے، اس لیے میں نے اُنھیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا اور ایک کمپنی میں نوکری کر لی اور پھر میری ملاقات تم سے ہوئی اور میں نے تم سے شادی کر لی اور یہیں لندن میں اپنا گھر آباد کر لیا'' اُس نے موڈ کو ہلکا پھلکا کرنے کی کوشش کی۔

''چلو مانا کہ بابا نے تو تمھیں منع کر دیا تھا لیکن کیا تم نے کبھی امی، ساحر اور اُجالا کی بھی خبر لینے کی کوشش نہیں کی''۔

''دو تین مہینے تک ایک دوست کی مدد سے گھر والوں کی خیریت معلوم ہو جاتی تھی پھر اُس کی بھی نوکری دوبئی میں لگ گئی تو خبر آنا بھی بند ہو گئی''۔

''ذرا سوچو فہد وہ اُجالا جو تم سے کبھی دور نہیں رہ سکتی تھی تم آخری بار اُسے مل کر بھی نہیں آئے وہ کتنا روتی ہو گی تمھیں یاد کر کے تمھیں نہیں لگتا کہ ہمیں ایک بار پاکستان جانا چاہیے اُن سے ملنے کی کوشش کرنی چاہیے'' ماہم نے اُس کے غم کو تازہ کرنے کی کوشش کی۔

''وقت سب سے بڑا مرہم ہوتا ہے ماہم اب دیکھو نہ میں بھی تو اُن کے بغیر پچھلے آٹھ سال سے رہ رہا ہوں اسی طرح اُن کو بھی میرے بغیر رہنے کی عادت ہو گئی ہو گی پھر یوں اچانک اُن کے سامنے جا کر میں اُن کے پرانے زخم تازہ نہیں کرنا چاہتا، اس لیے اب چپ چاپ یہ کیک کھاؤ اور جا کہ سو جاؤ''۔

''لیکن فہد۔۔۔''۔

''پلیز ماہم مجھے ابھی نیند نہیں آرہی میں کچھ دیر اکیلا رہنا چاہتا ہوں تم جا کہ سو جاؤ'' وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن فہد کچھ سننے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ماہم اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور وہ کافی کا کپ ہاتھ میں تھامیں سوچوں میں گم ہو گیا۔

***

''ارے فضیلہ بہن یہ لو میں بابا سے تاویز لے آئی ہوں'' اُس نے چپ کہ سے تاویز پکڑاتے ہوئے کہا۔'' بابا کہہ رہے تھے کہ یہ تاویز پانی میں گھول کر پلا دینا پھر

دیکھنا اسے پینے والا کیسے تمھارے اشارے پر ناچتا ہے
"۔

"بہت اچھے نسیم تمھارا بہت شکریہ" اُس نے تاویز کو
اپنے ہاتھ میں دباتے ہوئے کہا۔

"یقیناً یہ تاویز تم محمود بھائی کو پلانے والی ہو" نسیم نے
ہوا میں تیر چلانے کی کوشش کی۔

"نہیں یہ تاویز میں نے اپنی بیٹی مائرہ کے لیے منگوایا
ہے"۔

"کیا تم اپنی ہی بیٹی کو تاویز دو گی لیکن کیوں۔۔۔" اُس
کی آنکھوں میں خیرت عیاں تھی۔

"کیونکہ مائرہ اور سائرہ کی لکھائی بالکل ایک جیسی ہے
میں مائرہ سے خط لکھواؤں گی اور پھر وہ خط محمود بھائی کو
دے دوں یہ کہہ کر کہ یہ مجھے سائرہ کے کمرے سے ملا
ہے"۔

"اُس سے کیا ہو گا" نسیم جاننے کے لیے بے چین
تھی۔

اُس کے بعد جو ہو گا اُسکا تو تم اندازہ بھی نہیں لگا سکتی
تم تو بس دیکھتی جاؤ اب میں ان لوگوں سے اپنی
بیٹی کا بدلہ کیسے لیتی ہوں"۔

**

"السلام و علیکم اینڈ گُڈ مارننگ"۔۔۔"اُٹھ جاؤ میری
پیاری چڑیل اپنی سالگرہ کے موقع پر بھی کوئی اتنی دیر
تک سوتا ہے" اس وقت اُس کا موڈ بالکل فریش تھا۔

"تمھیں یاد تھا کہ آج میری سالگرہ ہے" اُس نے بجھے
سے انداز میں کہا۔

"تمھاری سالگرہ میں کیسے بھول سکتا ہوں صرف ایک
دن کا ہی تو فرق ہے تمھاری اور اُجالا کی سالگرہ میں"۔

"تمھیں میری سالگرہ اس لیے یاد ہے کیونکہ اُجالا کی
سالگرہ بھی مارچ میں ہی ہے" کل والی بات کا غصہ ابھی
تک قائم تھا۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے وہ تو بس۔۔۔"۔

"بس کرو فہد آخر کب تک تم اپنے آپ سے اور مجھ
سے جھوٹ بولتے رہو گے تمھارا کوئی دن ایسا نہیں
ہوتا جس میں اُجالا نہ ہو، ہمارے گھر کو دیکھ لو اس گھر
میں اتنی تصویریں ہماری نہیں ہیں جتنی اُجالا کی ہیں
، تمھارے دل میں اتنی جگہ میری نہیں ہے جتنی اُجالا
کی ہے، بس کرو اب ختم کر و اس قصے کو یا تو مکمل طور پر
بھول جاؤ سب کچھ یا پھر واپس چلے جاؤ اُن کے

پاس"ماہم نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"ماہم تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں ان دونوں میں سے کوئی بھی کام نہیں کر سکتا"۔

"فہد مجھے تمھاری ان حرکتوں سے تکلیف نہیں ہوتی بلکہ جلن ہوتی ہے، مجھے یوں لگتا ہے کہ تم بار بار اپنے بہن بھائیوں کا میرے سامنے اس لیے زکر کرتے ہو تا کہ تم مجھے یہ احساس کروا سکو کہ میرا کوئی بہن بھائی نہیں ہے"اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"ماہم یہ تم کیا کہہ رہی ہو میں تمھیں تکلیف پہنچانے کا سوچ بھی نہیں سکتا"اُس کے لہجے میں محبت عیاں تھی ۔

"اگر تم واقعی مجھے تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے اور مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو تو پلیز مجھے پاکستان لے چلو"اُس نے موقع کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"ماہم یار تم یہ کیا نئی ضد پکڑ کر بیٹھ گئی ہو"اُس نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"فہد میں تم سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں تمھیں گھر جانے کے لیے مجبور نہیں کروں گی ہم صرف سات دن کے لیے پاکستان جائیں گے اور کسی ہوٹل میں ٹھہر جائیں گے"۔

"کیا کرو گی تم پاکستان جا کر"وہ جاننے کے لیے بے چین تھا۔

"وہاں جا کر ہم اُجالا اور ساحر سے ملیں گے"اُس نے خوشی سے چہکتے ہوئے کہا۔

"اور اگر اُنھوں نے تمھیں ملنے سے انکار کر دیا تو"۔

"تب کی تب دیکھی جائے گی فی الحال تم جانے کی تیاری کرو"۔

"ٹھیک ہے اگر تمھاری یہی ضد ہے تو چلتے ہیں"اُس نے بالآخر ہار مان ہی لی۔

"تھینک یو سوچ"اُس نے تشکر بھری نگاہوں سے فہد کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

***

"دیکھا فضیلہ بہن فہد کے جانے کے بعد تمھاری بھابھی کیسے ادھ موئی ہو گئی ہے"۔

اب اُسے میری تکلیف کا کچھ تو اندازہ ہوا ہو گا"فضیلہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"ابھی اُسے خاک اندازہ ہوا ہو گا ابھی تو صرف ہماری پہلی کاوش کامیاب ہوئی ہے ابھی تو ہمیں دو اور وار

کرنے ہیں"۔
"کیا مطلب۔۔۔؟"اُس نے نسیم کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔
"میرا مطلب ہے کہ فہد کے بعد اب ساحر کی بھاری ہے"۔
"نہیں ہم ساحر کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گے"فضیلہ نے ساحر کا نام سنتے ہی ٹکا سے جواب دیا۔
"ارے تم تو بہت ہی رحم دل ہو جس عورت نے تمھاری بیٹی کو مار ڈالا اُس کے بچے کے لیے بھی تمھارے دل میں کتنا رحم ہے"نسیم نے پھر سے جذبات کا سہارا لیتے ہوئے کہا۔
"بات رحم کی نہیں ہے دراصل ساحر اور مائرہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں ایک بیٹی کی خوشیاں تو میں نہیں دیکھ سکی اب دوسری کی میں برباد نہیں کرنا چاہتی"۔
"یہ بات بھی ٹھیک ہے فضیلہ بہن لیکن اب اُجالا کے لیے اپنے دل میں رحم نہ پال لینا یہ بات جان لو کہ اُجالا میں اُس عورت کی جان اٹکی ہوئی ہے اگر اُسے زرا بھی تکلیف پہنچی تو وہ تڑپ کر رہ جائے گی"۔

"ٹھیک کہہ رہی ہو تم واقعی اُجالا میں تو سب کی جان اٹکی ہوئی ہے"۔
"میں کل بابا کے پاس گئی تھی اُنھوں نے کہا کہ تم مجھے اُس لڑکی کے بال دے دو پھر دیکھو میرا کمال۔۔۔"۔
"بال تو تمھیں مل جائیں گے لیکن یاد رہے کہ اُس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے"۔
"ارے فضیلہ بہن یقین رکھو مجھ پر اس عمل سے بس اُس کے سر میں ہلکا سا درد اُٹھے گا لیکن وہ ہلکا سا درد بھی اُس مغرور عورت کی جان نکال دے گا"۔
"تو پھر ٹھیک ہے ابھی تم جاؤ کل جاتے وقت مجھ سے اُجالا کے بال لے جانا"فضیلہ نے اُسے چلتا کیا اور خود سوچوں میں گم ہو گئی"۔

***

"کتنا اچھا لگ رہا ہے نہ اپنے ملک میں واپس آکر"اُس نے سامان صوفے پر رکھتے ہوئے کہا۔
"اچھا تو لگ رہا ہے لیکن ڈر بھی لگ رہا ہے"۔
"ڈرو مت فہد۔۔۔ اللہ سے اچھی اُمید رکھو"اُس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔
"اللہ تعالیٰ کا ہی تو سہارا ہے۔۔۔"اُس نے ایک

ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''اچھا ہم تو ہوٹل میں رکنے والے تھے نہ پھر تم مجھے کس کے گھر لے آئے ہو''۔

''یہ میرے دوست کا گھر ہے وہ سب ایک مہینے کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں تو اُس نے مجھے یہاں رہنے کی اجازت دے دی ہے''۔

''یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے''اُس نے اپنے بیگ سائیڈ پر رکھا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

''اور تمھارے لیے ایک اور بھی اچھی خبر ہے''فہد بھی اُس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

''وہ کیا۔۔۔''اُس نے تجسس بھری نگاہوں سے فہد کی جانب دیکھا۔

''میرے اُس دوست سے مجھے ساحر کا نمبر بھی مل گیا ہے''۔

''تو پھر انتظار کس کا ہے۔۔۔ ابھی نمبر ڈائل کرو اور بات کرو''اُس نے خوشی سے اُچھلتے ہوئے کہا۔

''میں بعد میں بات کر لوں گا ابھی میں فریش ہونے جا رہا ہوں اور تم بھی فریش ہو جاؤ پھر کھانا کھانے باہر چلتے ہیں''۔

''ٹھیک ہے''۔ فہد نے اپنا موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور کمرے کی جانب بڑھ گیا۔

**

''ماہم میں تیار ہوں اور کتنی دیر انتظار۔۔۔''وہ سیڑھیوں سے نیچے آیا تو ماہم کو کسی کے ہنس کر باتیں کرتا دیکھ وہ چونک گیا وہ شخص کوئی اور نہیں بلکہ ساحر تھا۔

''ساحر تم یہاں۔۔۔''اُس کے منہ سے بے اختیار نکل آیا۔

''میری چھوڑو بھائی تم کہاں تھے اتنے سال کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا میں نے تمھیں''اُس نے زور سے لپٹتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو یقین نہیں آ رہا کہ اتنے بڑے ہو گئے ہو تم''۔

''جدائی نے صرف پچیس سال کی عمر میں ہی کتنا بوڑھا کر دیا ہے آپ کو''اُس نے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کیسے گزار لیے اتنے سال تم نے ہمارے بغیر''۔

''بس یار یوں سمجھ لو کہ ہر دن سو بار جیتا تھا سو بار مرتا تھا''اُس نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

"مریں تمھارے دشمن۔۔۔ جتنی جدائی لکھی تھی وہ ہم نے بھگت لی اب میں تمھیں خود سے دور نہیں جانے دوں گا" وہ بدستور اُس سے لپٹا ہوا تھا۔

"جانا تو میں بھی نہیں چاہتا لیکن جانا ہو گا۔۔۔ تجھے یاد نہیں بابا نے کیا کہا تھا کہ اگر میں نے اُنھیں اپنی شکل بھی دکھائی تو وہ اپنی جان لے لیں گے اسی لیے میں نہ چاہتے ہوئے بھی اتنے سال تم لوگوں سے دور رہا یہ تو ماہم کی تم لوگوں سے ملنے کی ضد تھی جو مجھے یہاں تک کھینچ لائی ورنہ میں ساری زندگی واپس نہ آتا"۔

"تب کی بات اور تھی بھائی اب تو سب گھر پہ آپ کا انتظار کرتے ہیں اور آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں"۔

"کیا۔۔۔ بابا۔۔۔ بھی" وہ محمود صاحب کے دل کا حال جاننے کے لیے بے چین تھا۔

"جی ہاں بابا، امی، میں اور مائرہ آپ سب کو بہت یاد کرتے ہیں"۔

"اور اُجالا۔۔۔ کیا وہ مجھے یاد نہیں کرتی"۔

"اُجالا۔۔۔۔۔۔ اگر ہوتی تو۔۔۔ ضرور یاد کرتی۔۔۔" اُس نے زرا ٹھہر کر جواب دیا۔

"کیا مطلب ہے تمھارا کہ ہوتی تو یاد کرتی۔۔۔؟" اُس نے سوالیہ نگاہوں سے ساحر کی طرف دیکھا۔

"بھائی۔۔۔ اُجالا۔۔۔ اس دنیا میں نہیں رہی"۔

یہ سُن کر تو اُس کے قدموں تلے سے زمین ہی نکل گئی وہ ڈرام کر تا زمیں پر جا گرتا اگر ساحر اور ماہم اُسے سہارہ نہ دیتے۔

***

"فہد بیٹا آنکھیں کھولو۔۔۔ کب سے ترس رہی ہوں تمھاری آواز سننے کے لیے" وہ بے ہوش پڑا ہوا تھا اور مسز محمود اُس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھیں۔

"امی۔۔۔ کیا یہ کوئی خواب ہے یا واقعی آپ میرے سامنے ہیں" آنکھ کھلتے ہی اُس نے مسز محمود کو اپنے سامنے دیکھ کر کہا۔

"کوئی خواب نہیں ہے بیٹا۔۔۔" مسز محمود نے اُس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا۔

"میں کہاں ہوں۔۔۔ اور مجھے یہاں کون لایا"۔

"تم اپنے گھر میں ہو بیٹا۔۔۔ ساحر تمھیں یہاں لیکر آیا ہے"۔

"اُجالا۔۔۔؟" اُس کے لہجے میں دکھ اور آنکھوں میں

نمی تھی۔

''ہاں بیٹا۔۔۔قسمت کو یہی منظور تھا اُجالا اب اس دنیا میں نہیں رہی'' مسز محمود کی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھی۔

''جب میں گیا تھا وہ بالکل ٹھیک تھی پھر اچانک کیا ہو گیا''۔

''کیا بتاؤں بیٹا تمھارے جانے کے بعد وہ بہت چپ چپ سی ہو گئی تھی شروع شروع میں تو ہم نے اُسے یہی بتایا کہ تمھارے امتحان ہونے والے تھے اس لیے تم واپس لندن چلے گئے ہو لیکن ایک دن اُس نے تمھارے بابا اور میری باتیں سن لی، اُس کے بعد وہ ہر وقت روتی رہتی اور تم سے ملنے کی ضد کرتی تھی'' مسز محمود نے اپنی آنکھوں سے آنسوں صاف کرتے ہوئے کہا۔''اچانک ایک دن اُس کے سر میں شدید قسم کا درد اُٹھا اُس درد کی وجہ سے وہ ہر وقت تکلیف میں رہتی تھی اور پھر وہ تکلیف اُس کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوئی''۔

''کس قسم کا درد تھا وہ۔۔۔'' ماہم نے بھی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔

''پتا نہیں بیٹا ہم لوگ بڑے سے بڑے ڈاکٹر کے پاس گئے بڑے بڑے ہسپتالوں کے چکر بھی لگائے لیکن کسی کو کچھ سمجھ نہیں آیا اور میری بیٹی مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور میں بے بس اُسے دیکھتی رہی'' مسز محمود کی آنکھوں میں ایک بار پھر سے آنسو اُمڈ آئے۔

''اپنے آپ کو سنبھالیے امی خدا کے فیصلوں کے سامنے ہم سب ہی بے بس ہوتے ہیں وہی خالق و مالک ہے اور جو کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے'' ماہم نے مسز محمود کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''اور۔۔۔بابا'' فہد نے بھی اپنی آنکھوں سے آنسو پونچھ کر کہا۔

''بہن کی محبت میں آکر اولاد کی جدائی کا غم تو پہلے ہی دل پر تھا اوپر سے اُجالا کی موت نے ایسی ضرب لگائی کہ تمھارے بابا بستر سے ہی جا لگے۔۔۔یکے بعد دیگرے دو بار اٹیک ہو چکا ہے جیسے اب تو جینے کی چاہت ہی ختم ہو گئی ہو''۔

''بابا اب کہاں ہیں'' اُس نے اپنے بستر سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''وہ اپنے کمرے میں ہیں لیکن فہد بیٹا ابھی تم آرام

کرو تمھیں آرام کی سخت ضرورت ہے"۔

"میں ٹھیک ہوں" وہ محمود صاحب سے ملنے کے لیے بضد تھا اور اپنے کمرے سے نکلا اور سیدھا محمود صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گیا ماہم بھی اُس کے پیچھے چلی گئی۔

"بابا۔۔۔"اُس نے جھٹکے سے دروازہ کھولا تو محمود صاحب آنکھیں موندیں بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔

"فہد۔۔۔"اُس کی آواز کانوں میں پڑتے ہی وہ اُچھل کر بستر سے نیچے اُتر آئے لیکن کمزوری کی وجہ سے ایک قدم چلنے کے بعد وہیں گر گئے"۔

"بابا۔۔۔"اُس نے بھاگ کر محمود صاحب کو سنبھالا اور گلے سے لگالیا۔

"مجھے معاف کر دو بیٹا میں نے تمھیں غلط سمجھا۔۔۔"محمود صاحب کو اپنے کیے پر پشیمانی تھی۔

"معافی تو مجھے مانگنی چاہیے بابا۔۔۔ماں باپ تو بچوں کو ڈانٹتے ہی ہیں لیکن بچے گھر چھوڑ کر تو نہیں جاتے اور میں تو ایسا گیا کہ آٹھ سال تک پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا یہ بھی نہیں سوچا کہ میرے بابا کو اس وقت میری سب سے زیادہ ضرورت ہے"اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا نہ رُکنے والا سیلاب اُمڈ آیا تھا۔

"بس اب تو تم آگئے ہو نہ اب میں تمھیں کہیں نہیں جانے دوں گا"ماہم اور مسز محمود بھی کمرے میں آ گئیں۔

"ارے آپ نیچے کیسے گر گئے۔۔۔مسز محمود اُنھیں اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گئیں۔"فہد بیٹا جلدی سے جاؤ اور ڈاکٹر کو بلاؤ"۔

"نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے"محمود صاحب نے فہد کا سہارا لیا اور پھر سے بستر پر لیٹ گئے۔

"بابا اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم کہیں نہ جائیں تو آپ کو جلد سے جلد صحت یاب ہونا ہو گا یہ آپکے مریض بننے کی عمر تو نہیں ہے"ماہم نے محمود صاحب کے سر کے نیچے تکیہ رکھتے ہوئے کہا۔

"یہ پیاری سی بیٹی۔۔۔"محمود صاحب نے مسز محمود کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"جی بالکل ٹھیک پہچانا آپ نے۔۔۔یہ ماہم ہے آپ کی بڑی بہو"مسز محمود نے ماہم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ماشاء اللہ۔۔۔خدا کرے کہ تم ہمیشہ یونہی مسکراتی رہو" محمود صاحب نے ماہم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"محمود صاحب یہی ہے جو فہد کو یہاں لے کر آئی ہے ورنہ شاید فہد تو ساری زندگی آپ کے غصے کا سامنہ کرنے کی ہمت نہ کرتا" مسز محمود نے بھی پیار سے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔

"شکریہ بیٹا تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے ورنہ مجھے تو یہ ڈر تھا کہ کہیں اپنے بیٹے کی شکل دیکھے بغیر ہی نہ مر جاؤں"۔

"بابا خدا کے لیے ایسی مایوسی کی باتیں نہ کریں ابھی تو میں آپ سب سے ملی ہوں اور آپ پھر سے بچھڑنے کی باتیں کر رہے ہیں" اُس نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔

"سوری بیٹا" محمود صاحب نے بھی فورا معذرت کی۔

"اچھا امی فہد نے مجھے مائرہ اور پھوپھو کے بارے میں بتایا تھا لیکن وہ دونوں کہاں ہیں۔۔۔؟" ماہم نے سوالیہ نگاہوں سے مسز محمود کی طرف دیکھا۔

"بیٹا مائرہ کی امی کی طبیعت کافی خراب ہے اس لیے وہ زیادہ وقت اپنی امی کے کمرے میں ہوتی ہے شائد ابھی بھی وہیں ہے"۔

"کیا ہوا ہے پھوپھو کو۔۔۔"۔

"بیٹا فہد کی پھوپھو کو کینسر کا مرض ہے اور وہ بھی آخری سٹیج۔۔۔کچھ ماہ پہلے جب اُنھیں اس بیماری کا پتا چلا تو وہ بہت بے چین ہو گئی وہ اپنی بیٹی کی خوشی دیکھنا چاہتی تھیں اسی لیے اُنہی کی خواہش پر ہم نے مائرہ اور ساحر کی شادی بھی کروادی" مسز محمود نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"بابا اگر آپ کی اجازت ہو تو میں پھوپھو سے ملنا چاہتا ہوں" اُس نے محمود صاحب سے اجازت لی۔

"ٹھیک ہے بیٹا جاؤ" فہد اور ماہم کمرے سے باہر چلے گئے اور محمود صاحب نے اپنی آنکھیں بند کر لی آج سالوں بعد اُن کے چہرے پر مسکراہٹ اور سکون نظر آ رہا تھا۔

***

"آجائیں دروازہ کھلا ہوا ہے" اُس نے دروازے پر دستک دی تو اندر بیٹھی مائرہ نے آواز بلند کی۔

"ارے فہد بھائی آپ۔۔۔امی دیکھیں فہد بھائی آئے ہیں" فہد اندر داخل ہوا تو مائرہ اُسے دیکھ کر بے اختیار

فضیلہ کو جگانے لگی۔

"فہد بیٹا تم آ گئے کب سے انتظار کر رہی تھی میں تمھارا" فضیلہ نے آنکھیں کھولیں تو اُسے اپنے سامنے دیکھ کر کہا۔

"پھوپھو یہ سب کیا ہو گیا" اُسے فضیلہ کی یہ حالت دیکھ کر یقین نہ آیا۔

"یہ سب میرے کیے کی سزا ہے جو مجھے مل رہی ہے "فضیلہ کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے۔

"لیکن میں نے تو کبھی بھی آپ کو بد دعا نہیں دی"۔

"تم نے تو بد دعا نہیں دی لیکن یہ اُس معصوم کی آہ ہے جس کی جان میری وجہ سے چلی گئی"۔

"کیا مطلب۔۔۔"فضیلہ کے باتیں اُس کے سر سے گزر رہی تھی۔

"اُجالا کی موت کی میں زمہ دار ہوں"۔فضیلہ کے منہ سے اتنی بڑی بات سُن کر سب کے منہ کھلے کہ کھلے رہ گئے۔

"امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں" مائرہ کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں بیٹا۔۔۔"فضیلہ اپنے گناہوں کا اقرار کر رہی تھی اور وہ تینوں کھڑے سُن رہے تھے

***

"ارے نسیم۔۔۔تجھے خدا کا خوف نہیں رہا یہ تو نے کیا کر دیا ایک معصوم بچی کی جان لیتے ہوئے تیرے ہاتھ نہیں کانپے "فضیلہ نے اُسے کوستے ہوئے کہا۔

"میں نے کیا کیا ہے فضیلہ بہن" اُس کے لہجے میں معصومیت بھری ہوئی تھی۔

"اتنی بھولی نہ بن ابھی ابھی مجھے ہسپتال سے فون آیا ہے کہ اُجالا اب اس دنیا میں نہیں رہی۔۔۔"فضیلہ نے اُس کی گردن دبوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں تو اس میں میرا کیا قصور ہے جو بھی کیا ہے تم نے خود ہی کیا ہے" اُس نے فضیلہ پر الزام لگاتے ہوئے کہا۔

"میں نے تو تمھیں اُجالا کے بال دیتے وقت سختی سے منع کیا تھا کہ اُس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہونا چاہیے لیکن تم نے۔۔۔میں تمھیں اس گنونے کام کی سزا دلوا کر رہوں گی" وہ بدستور اُس کی گردن دبوچے ہوئے تھی۔

"کیسی سزا اور کس کام کی سزا۔۔۔" اُس نے ایک

دھکہ مارا اور فضیلہ دور جا گری۔ "میں نے تمھیں پہلے ہی بتایا تھا کہ کالے جادو کی کوئی سزا نہیں ہوتی کیونکہ اس کا کوئی ثبوت ہی نہیں ہوتا" اس لیے مجھے سزا دلوانے کی تمھاری خواہش تو پوری نہیں ہو سکتی"۔

"میں محمود بھائی کو سب کچھ بتا دوں گی پھر دیکھنا وہ تمھارا کیا حال کرتے ہیں"۔

"بے وقوف عورت کیا بتاؤ گی اپنے بھائی کو کہ میں نے تمھاری بیٹی پر کالا جادو کروایا تھا۔۔۔ لیکن کالے جادو کے لیے مجھے اُس کے بال کس نے دیئے تھے۔۔۔ اُس کی اپنی بہن نے۔۔۔ اور جب وہ میری یہ بات سنے گا تو بالکل پاگل ہو جائے گا پھر میرا تو جو ہو گا وہ ہو گا لیکن تمھارا کیا حال ہو گا ذرا وہ سوچو۔۔۔" اُس نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

"لیکن تم نے ایسا کیوں کیا آخر اُس معصوم بچی نے تمھارا کیا بگاڑا تھا۔۔۔؟"۔

"تو کیا میری بچی معصوم نہیں تھی جس کی دوائی کے لیے میں نے تمھاری بھابھی سے پیسے مانگیں تو اُس نے یہ کہہ کہ مجھے گھر سے نکال دیا کہ ان لوگوں کا تو روز روز کا ڈرامہ ہے۔۔۔ یہیں اسی جگہ میری چھوٹی سی بیٹی نے دوائی نہ ملنے کی وجہ سے تڑپ تڑپ کر اپنی جان دے دی، اُس نے روتے روتے اپنا حال بیان کیا۔ "میں نے تو اسی دن سوچ لیا تھا کہ میں اُس سے بدلہ لے کر رہوں گی اسی لیے میں نے تمھاری بیٹی کو منحوس مشہور کیا اور الزام تمھاری بھابھی پر لگا دیا اور پھر تم نے غصے میں آ کر بدلہ لینے میں میری مدد کی" اُس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"کیا تم نے میری بیٹی کو۔۔۔" فضیلہ نے نسیم کو دھکا دیا اور پاس پڑا ہوا راڈ اُس کے سر پر دے مارا۔ نسیم درد سے کراہنے لگی اور فضیلہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

***

"پھوپھو میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ اتنا گرا ہوا کام کر سکتی ہیں" اُس نے فضیلہ کو غصے سے گھورتے ہوئے کہا۔

"مجھے میرے کیے کی سزا مل رہی ہے بیٹا میں تو زندہ ہی اس لیے تھی کہ تم سے معافی مانگ سکوں"۔

"آپ کو شرم نہیں آتی کہ اتنا گرا ہوا کام کرنے کے بعد معافی مانگ رہی ہیں، میں آپ کو اس دنیا میں تو کیا

حشر کے دن بھی معاف نہیں کروں گا" اُس نے دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

"بدلے کی آگ نے آپ کو اتنا اندھا کر دیا کہ آپ نے ایک چھوٹی سی بچی کو بھی نہیں بخشا" ماہم کو بھی فضیلہ سے نفرت ہو رہی تھی۔

امی اگر آپ نے اُسے اپنی بھتیجی نہیں سمجھا تھا تو یہ تو سمجھ سکتی تھیں کہ وہ آپ کی بیٹی کی نند ہے، اب میں کیا منہ دکھاؤں گی گھر والوں کو آپ نے تو مجھے کسی سے نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں چھوڑا" یہ اُس کے گناہوں کی سزا تھی کہ آج اُس کی اپنی بیٹی اُسے کوس رہی تھی۔

**

"ارے یہ ساحر اور مائرہ کہاں رہ گئے ابھی تک آئے نہیں" مسز محمود نے سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بابا میں اُن دونوں کو بلا کر لاتی ہوں" ماہم اُن دونوں کو بلانے چلی گئی۔

"میں مائرہ کو اچھی طرح جانتا ہوں وہ بہت ہی اچھی بچی ہے اپنی ماں کی اس حرکت کی وجہ سے وہ ہمارا سامنا کرنے سے کترا رہی ہے" محمود صاحب اپنی رائے بیان کرتے ہوئے کہا۔

"یقین نہیں آتا کہ فضیلہ اتنا بڑا گناہ کر سکتی ہے" مسز محمود کو اب تک یقین نہیں ہو رہا تھا۔

"غصہ انسان کو اندھا کر دیتا ہے پھر اُسے کسی چیز کا ہوش نہیں رہتا"۔

"اتنا اندھا کر دیتا ہے کہ اُسے اپنے رشتوں کا بھی کوئی خیال نہیں رہتا" مسز محمود میں کے لہجے میں غصے اور غم کے ملے جلے اثرات تھے۔

"اگر اُس نے رشتوں کا خیال نہیں کیا تو تم ہی کر لو اس وقت موت کے قریب ہے اُسے معاف کر دو ویسے بھی اللہ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔

"وہ جو سزا بھگت رہی ہے وہ اُسی کے لائق ہے میں اُسے کبھی معاف نہیں کروں گی"۔

"اچھا ابھی اپنا موڈ ٹھیک کرو بچے آرہے ہیں" محمود صاحب نے بچوں کو آتے دیکھ کر کہا۔

"السلام وعلیکم" مائرہ اور ساحر نے سب کو سلام کیا۔

"کیا بات ہے۔۔۔ آج تو بابا بھی ناشتے کی میز پر ۔۔۔" اُسے محمود صاحب کو دیکھ کر خیرت ہوئی تھی۔

”ہاں بھائی آج میری بہو نے کھانا بنایا ہے تو میں بھی کھانے چلا آیا“۔
”مطلب کہ آج کھانا بھابھی نے بنایا ہے“ ساحر نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
”اچھا اس سے پہلے کہ سب کھانا شروع کریں مجھے آپ سب سے ایک ضروری بات کرنی ہے“ ماہم نے سب کو اپنی طرف متوجہ کیا۔
”ہاں بیٹا بولو کیا بات ہے“ محمود صاحب نے ماہم کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔
”بابا میں جانتی ہوں کہ پھوپھو نے جو کچھ بھی کیا وہ غلط کیا لیکن۔۔۔“۔
”ماہم میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا کہ تم اس بارے میں کوئی بات نہیں کرو گی“ فہد نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
”فہد پلیز مجھے بات کرنے دو پھر جو تم کہو گے میں وہی کروں گی“ اُس نے درخواست کرنے والے لہجے میں کہا۔
”ایک بار سب سن لو کہ ماہم کیا کہنا چاہتی ہے اُس کے بعد فیصلہ کرنا کہ تم لوگوں کو کیا کرنا ہے“ محمود صاحب نے اُس کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔
”میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ بے شک میں نے اُجالا کو دیکھا نہیں لیکن میں بھی اُس سے اتنی ہی محبت کرتی ہوں جتنی آپ سب لوگ کرتے ہیں لندن میں ہر سال ہم اُس کی سالگرہ مناتے تھے، یقیناً کسی اپنے کو کھونے کا غم بہت بڑا ہوتا ہے میں دس سال کی تھی جب میں نے اپنے ماں باپ کو کھو دیا تھا لیکن میں اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوئی اور دیکھ لیں آج اللہ تعالیٰ نے آپ سب کو میری زندگی میں شامل کر دیا“ سب بڑی غور سے اُس کی بات سن رہے تھے۔
”دیکھیں پھوپھو نے بہت بڑی غلطی کی ہے بلکہ گناہ کیا ہے لیکن اب وہ اُس گناہ کی سزا بھگت رہی ہیں اور اب اُن کے پاس بہت کم سانسیں بچی ہیں اس لیے میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ سب بھی پھوپھو کو اُجالا کا خون معاف کر دیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کریں مجھے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو بہت جلد آپ کی اُجالا واپس لٹا دے گا میرے بچے کی صورت میں“ اُس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔
”ماشاء اللہ۔۔۔ کتنے دنوں بعد ہمارے گھر میں بھی

کوئی خوشی آئی ہے میں اسی خوشی میں فضیلہ کو معاف کرتا ہوں" محمود صاحب نے پہل کرتے ہوئے کہا۔

"میں بھی معاف کرتا ہوں" ساحر نے بھی ہاں میں ہاں ملائی"۔

"اگر تم بچوں کی یہی خوشی ہے تو میں بھی فضیلہ کو معاف کرتی ہوں"۔ مسز محمود نے بھی خوش ہوتے ہوئے کہا۔

اب سب کی نظریں فہد پر جمی ہوئی تھی۔

"فہد بھائی آپ بھی پلیز امی کو معاف کر دیں" مائرہ نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے میں بھی پھوپھو کو معاف کرتا ہوں" فہد نے بھی بالآخر فضیلہ کو معاف کر دیا۔

"امی اتنی بڑی خوشخبری ملی ہے کوئی مٹھائی بھی کھانے کو ملے گی یا پھر صرف ناشتے سے ہی کام چلانا پڑے گا" ساحر نے فرمائش کرتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ کھانا شروع کرو میں مٹھائی لے کر آتی ہوں" مسز محمود مٹھائی لینے چلی گئی اور باقی سب باتوں میں مصروف ہو گئے۔

آج سالوں بعد محمود ہاؤس میں خوشیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

ختم شد

☆☆☆☆☆

اپنی قسمت سنوار لیتے ہیں
اُس کا صدقہ اُتار لیتے ہیں
ضد محبّت میں ہم نہیں کرتے
ہم جُواری ہے ہار لیتے ہیں
دل تڑپتا ہے چوم لینے کو
جب وہ زلفیں سنوار لیتے ہیں
جب وہ زلفیں سنوار لیتے ہیں
کس نے وعدہ نبھایا اُلفت میں
شیّریوں زندگی گزاری ہے
جیسے سب سے اُدھار لیتے ہیں
شیر علی شیرؔ شکاگو امریکہ

مبارک ہو مبارک ہو مبارک ہو

داستان دل اپریل سے کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے

اب آپ داستان دل اپنے گھر، ہوسٹل، آفس، کالج کے ساتھ ساتھ دنیا کے کسی بھی کونے میں حاصل کر سکتے ہیں، تو ابھی اپنا نام ممبر شپ میں فائنل کروائیں

معلومات ممبر شپ:

سالانہ بمعہ ڈاک خرچ	:	1200/-
چھ ماہ بمعہ ڈاک خرچ	:	600/-
تین ماہ	:	300/-

(ممبر شپ 03225494228 اس نمبر پر موبی کیش اکاونٹ میں جمع کرواکہ اپنا ایڈریس اسی نمبر پر واٹس اپ یا مسیج میں سینڈ کریں)

مزید معلومات کے لیے: 03225494228 واٹس اپ / موبائل نمبر

ترانوے سالہ پروگرام

صداقت حسین ساجد

موبائل نمبر --- 03006385915

فیصل کو سیزر پر آئے ہوئے ایک گھنٹا بھی نہیں ہوا تھا کہ اس سے ایک بے حد سنگین جرم سرزد ہو گیا تھا۔ وہ زمین کا رہنے والا ایک خلاباز تھا۔ وہ اس وقت سیزر پر پہنچا ہی تھا کہ اسے اپنی جان بچانا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے ایک سیزری باشندے کو قتل کر دیا تھا۔ 3050ء کے ترقی یافتہ دور میں قتل کوئی ایسا سنگین جرم نہیں رہا تھا کہ اس پر مجرم کو پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔ زمین اور دوسرے سیاروں پر اس کی سزا بالکل ہلکی پھلکی تھی، اس لیے وہاں قتل و غارت کا بازار پوری طرح سے گرم تھا، لیکن سیزر پر قتل کی سزا بہت سخت تھی اور یہاں اس جرم کو ناقابلِ معافی سمجھا جاتا تھا۔

فیصل اب تک کئی سیاروں پر گھوم پھر چکا تھا اور جانے ان جانے میں اس سے جرائم ہوتے رہتے تھے۔ وہ قانون شکنی کا مرتکب ہو جاتا تھا، لیکن اسے وہاں یہ رعایت مل جاتی تھی کہ اسے قانون کا پتا نہیں ہوتا تھا۔ یوں وہ قانون سے لاعلمی کی وجہ سے بچ جاتا تھا۔ یہاں تو وہ پھنس ہی گیا تھا۔

اب اسے پلوٹو کی یاد بہت شدت سے آ رہی تھی، جہاں اس نے ایک دو نہیں، بلکہ پورے پانچ آدمی قتل کر ڈالے تھے۔ جب عدالت میں مقدمہ چلا، تو عدالت نے یہ بات مان لی کہ ان پانچوں نے اس پر حملہ کیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو بچانے کے لیے انھیں مجبوراً

قتل کر ڈالا تھا ۔

بہر حال اس نے سیزر پر ایک قتل کر دیا تھا ۔ بات اتنی بڑی نہیں تھی۔ وہ ایک ایسی جگہ تھوک بیٹھا تھا جہاں تھوکنا منع تھا۔ سیزر کے ایک باشندے نے اسے وہ جگہ صاف کرنے کو کہا، تو وہ اڑ گیا۔ بات بڑھتے بڑھتے ہاتھا پائی تک جا پہنچی۔ فیصل کو اس نے نیچے گرا لیا تھا اور اس کے اوپر چڑھ کر مکے برسانے لگا ۔فیصل کو کچھ اور نہ سوجھا، اس نے اس کی گردن پکڑ لی اور زور سے دبانے لگا۔ اس کا مقصد تو یہ تھا کہ اس طرح کرنے سے سیزری اسے چھوڑ دے گا، لیکن سیزری کا تو وقت پورا ہو چکا تھا۔ یوں وہ گردن دبنے کی وجہ سے مر گیا ۔

یہاں قتل کی سزا موت تھی، چاہے وہ قتل کسی بھی وجہ سے کیوں نہ کیا گیا ہو ۔

جب اس بات کا پتا فیصل کو چلا، تو اس کے ہوش اڑ گئے ۔ وہ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ مزید جب اسے یہ پتا چلا کہ پچھلے پچاس برسوں میں یہاں صرف ایک قتل ہوا ہے اور وہ بھی اس نے کیا ہے، تو اسے یقین ہو گیا کہ اب اس کا بچنا مشکل ہی نہیں بلکہ نا ممکن ہے ۔

وہ سر جھکائے پریشانی کے عالم میں عدالت میں کھڑا تھا ۔

اس کا دل سینے میں یوں دھڑک رہا تھا جیسے کوئی اندر بیٹھا ہتھوڑے سے پسلیوں کے پنجر پر ٹھوکریں مار رہا ہو ۔

سیزری عدالت میں بیٹھا ہوا جج اسے اپنی موت کا قاصد دکھائی دے رہا تھا ۔

”یہ معزز عدالت تمام گواہوں اور ثبوتوں کی روشنی میں تمھارے لیے موت کی سزا تجویز کرتی ہے۔۔۔“

جج کی بارعب آواز سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ بے اختیار چلا اٹھا ۔

”رحم ۔۔۔ جج صاحب ! رحم کیجیے ۔۔۔“

اس کی آواز بھرا گئی اور اس کی آنکھوں سے بے بسی سے آنسو جاری ہو گئے تھے، لیکن جج پر اس کی اس ابتر حالت کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اس کی طرف توجہ دیے بغیر کہنے لگا ۔

”کل صبح ہوتے ہی تمھیں فائرنگ اسکواڈ کے حوالے کر دیا جائے گا۔۔۔ تمھاری موت کا یہ طریقہ صرف

اس لیے مخصوص کیا جارہا ہے کہ جب تمھیں چوک پر گولیوں کا نشانہ بنایا جائے گا، تو سیزر کے تمام لوگ تمھاری اس طرح کی موت سے عبرت حاصل کریں گے۔۔۔"

"جج صاحب! مجھ پر رحم کیا جائے، کیوں کہ میں یہاں ۔۔۔"

اس نے ایک بار پھر التجا کی۔

"قانون تو قانون ہے، اس لیے اس پر عمل ہو گا، اگر پوری کائنات نے قتل پر موت کی سزا کا قانون ختم کر دیا ہے، تو ہم اس کے ذمہ دار نہیں ہیں۔۔۔ ہم اپنے قانون کے مطابق فیصلے کریں گے۔۔۔ اس سیارے پر آنے سے پہلے تمھیں اس کے قوانین جاننا چاہییں تھے اور یہ بھی جان رکھو کہ میرے اس فیصلے کے خلاف کسی قسم کی اپیل کرنے کی بھی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

جج اس کی ابتر حالت سے متاثر ہوئے بغیر کہہ رہا تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل جھک گیا اور اور دونوں ہاتھوں میں اپنا منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے گھر سے کروڑوں میل دور اس قدر بھیانک انداز میں مرنے جا رہا تھا، لیکن یہاں کوئی اس کا مددگار نہیں تھا۔ وہ بے کسی سے اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے والا تھا۔

چند سپاہیوں نے فوراً ہی اسے گھیر لیا اور پھر اپنے نرغے میں لے کر جیل کی طرف چل پڑے۔ وہاں پہنچ کر اسے ایک ایسی کال کوٹھڑی میں دھکیل دیا گیا، جو ان مجرموں کے لیے مخصوص تھی، جنھیں موت کی سزا ہوتی تھی۔

فیصل جیسے ہی اس کال کوٹھڑی میں داخل ہوا، تو وہ یہ دیکھ کر دھک سے رہ گیا کہ جسے وہ صرف ایک روایتی کال کوٹھڑی سمجھا تھا، وہ در حقیقت اٹھارہ کمروں پر مشتمل ایک شان دار عمارت کا تاریک صحن تھا۔ جس کمرے میں اسے لے جایا گیا تھا، وہاں فیصل نے دیکھا کہ تمام کمرے ضرورت کی اشیاء سے مکمل طور پر بھرے ہوئے تھے اور وہاں کھانے پینے کی اشیاء کی کوئی کمی نہیں تھی۔

وہاں ہر وہ چیز موجود تھی، جس کی کسی شخص کو ضرورت پڑ سکتی ہے یا وہ اس کی خواہش کر سکتا ہے۔ بعد میں اسے جس کمرے میں اسے پہنچایا گیا، وہ سونے

والا کمرا تھا اور ہر لحاظ سے سجا ہوا تھا۔ اس میں دو لڑکے یوں سر جھکائے کھڑے تھے، جیسے وہ غلام ہوں اور اس کا ہی انتظار کر رہے ہوں ۔

"یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں ؟" فیصل ہکا بکا سا بولا ۔

"کیا دیکھ رہے ہیں آپ ؟" اس کے ساتھ آنے والے محافظوں میں سے ایک بولا ۔

"کک ۔۔۔ کک ۔۔۔ کیا یہ حقیقت ہے ؟ یہ کال کوٹھڑی ہے ۔۔۔ یہاں مجرم رات کو ٹھہرائے جاتے ہیں ؟"

"جی ہاں ! یہ بالکل حقیقت ہے ۔۔۔" ایک محافظ نے سر جھکا کر ادب سے جواب دیا ۔

"لیکن میں تو ایک مجرم ہوں اور مجھے اس جرم کے بدلے میں موت کی سزا سنائی گئی ہے ۔۔۔ پھر میرے لیے اتنا کچھ ۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے ؟"

"جناب ! یہ ہمارے سیارے کا رواج ہے ۔۔۔"

"کیا رواج ہے ؟"

"جس رات کو کسی شخص کو سزائے موت دی جاتی ہے ، اس رات اسے ہر طرح سے آرام و آسائش پہنچانے کی کوشش کی جاتی ہیں اور اس کی ہر خواہش کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے ۔"

فیصل نے سرسری طور پر ہر چیز کو دیکھا ، اس کا دل خوشی کے مارے بلیوں اچھلنے لگا، لیکن جب اسے یاد آیا کہ صبح ہوتے ہی اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا ، تو اس کا دل مرجھا گیا ۔

"موت کی سزا پانے والے مجرموں کو تقریباً ہر وہ چیز مہیا کر دی جاتی ہے ، جس کی وہ اپنی زندگی میں خواہش کر سکتا ہے ۔"

محافظ کے یہ الفاظ اس کے لیے خوشی کا سبب نہیں بنے تھے ۔ وہ اداس اداس نظروں سے ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اب وہ کچھ ہی وقت کے لیے زندہ تھا، اس لیے وہ ان سے کیسے لطف اندوز ہو سکتا تھا ۔

اچانک اسے کچھ یاد آیا ، تو وہ بولا ۔

"اوہ ۔۔۔ ! میں نے اپنی گائیڈ بک دیکھے بغیر ہی اپنا خلائی جہاز اس سیارے پر اتار دیا تھا ۔۔۔ یہاں رات بھلا کتنے گھنٹوں کی ہوتی ہے ؟"

"جناب ! کیا مطلب ؟"

"میرا مطلب ہے کہ صبح ہونے میں ابھی کتنے گھنٹے باقی ہیں ؟ میں اس سیارے کی گردش کے گھنٹے جاننا

چاہتا ہوں ۔"

"گھنٹے۔۔۔؟" محافظ نے حیرت سے دہرایا۔ لگتا تھا کہ یہ لفظ اس کے لیے غیر مانوس ہو۔" شاید یہ زمین کے وقت کا پیمانہ ہے، میں شاہی نجومی سے رابطہ کرتا ہوں۔۔۔ آپ کے سیارے اور ہمارے سیارے کے درمیان وقت کے فرق کے بارے میں وہی بتا سکتا ہے ۔"

پھر اس نے فون پر کسی سے رابطہ کیا اور سوال کرنے کے چند لمحوں تک دوسری طرف سے ہونے والی باتیں سنتا رہا۔ پھر وہ فیصل کی طرف پلٹا اور بولا ۔

"آپ کا سیارہ ہمارے سیارے کے ایک چکر کے مقابلے میں ترانوے چکر سورج کے گرد لگاتا ہے۔۔۔"

"کیا مطلب ؟"

"ہمارا سیارہ اندھیرے اور اجالے کے درمیان جس قدر وقت لیتا ہے ، اتنے میں زمین پر ترانوے سال بیت چکے ہوتے ہیں ۔"

"کیا ا ا ا ا ا ا ؟" فیصل چلا اٹھا ۔

"جی ہاں ! یہ سچ ہے ۔"

فیصل نے سکھ کا سانس لیا۔ محافظ جس کی عمر زمین کے باشندوں کی عمر کے حساب سے بیس ہزار سال کے قریب تھی، ادب سے اس کے سامنے جھکا اور پھر قید خانے کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا ۔ فیصل نے اس کے جاتے ہی کھانے پینے اور عیش و عشرت کے ایک ترانوے سالہ طویل پروگرام کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا اور سب خدشے اپنے ذہن سے جھٹک کر آگے بڑھا۔ اب تو لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی فیصل ہے، جو کچھ دیر پہلے موت کی سزا سننے پر گڑگڑا کر اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ اب وہ ایک دم سے بدلا ہوا شخص دکھائی دے رہا تھا ۔ خلا میں سفر کرتے ہوئے فیصل کو کئی سال گزر گئے تھے اور اس دوران وہ ان سب چیزوں سے ترسا ہوا تھا ،اب قسمت نے اسے موقعہ دیا تھا، تو وہ اسے کیسے گنوا دیتا۔

☆☆☆☆

ہمارا حق تو نہیں بنتا پھر بھی تم سے یہ کہتے ہیں
ہماری زندگی لے لو مگر اداس مت رہا کرو
ندیم عباس ڈھکو۔ ساہیوال

مبارک ہو   مبارک ہو   مبارک ہو

داستان دل اپریل سے کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے

اب آپ داستان دل اپنے گھر، ہوسٹل، آفس، کالج کے ساتھ ساتھ دنیا کے کسی بھی کونے میں حاصل کر سکتے ہیں، تو ابھی اپنا نام ممبر شپ میں فائنل کروائیں

معلومات ممبر شپ:

سالانہ بمعہ ڈاک خرچ	:	1200/-
چھ ماہ بمعہ ڈاک خرچ	:	600/-
تین ماہ	:	300/-

(ممبر شپ 03225494228 اس نمبر پر موبی کیش اکاونٹ میں جمع کرواکہ اپنا ایڈریس اسی نمبر پر واٹس اپ یا مسیج میں سینڈ کریں)

مزید معلومات کے لیے: 03225494228 واٹس اپ / موبائل نمبر

محبت فاتحِ عالم !!" تحریر: ثمینہ طاہر بٹ !!۔لاہور !!

۔" میرا پیغام محبت ہے، جہاں تک پہنچے۔" امجد اسلام امجد صاحب نے یہ نظم شائد میرے لیئے ہی کہی تھی۔ انہوں نے تو محبت کو" پیغام" کا نام دیا تھا، مگر مجھے لگتا ہے کہ جیسے میرا سارا وجود ہی "محبت" ہے۔ بابرہ شریف اور غلام محی الدین کا تو صرف" نام ہی محبت " تھا، مگر میرا تو کلام، مقام، صبح و شام سب محبت ہی ہے۔ارے، آپ کو یقین نہیں آرہا۔؟ مان لیں یار۔ اور وہ جو پروین شاکر صاحبہ فرما گئی ہیں کہ "محبت اک شجر ہے"، تو آج کل میں خود کو اس شجر پر بیٹھا ہوا الّو ہی سمجھ رہا ہوں۔ جی ہاں " الّو"۔ ارے، آپ پھر مذاق سمجھ رہے ہیں؟ چلیں کوئی بات نہیں۔ آپکا بھی کیا قصور بھلا۔ جب تک آپکو ساری حقیقتِ حال کا علم نہیں ہو جاتا، آپ کیسے میرے جذبات سمجھ پائیں گے بھلا۔؟ ہیں ناں۔ اور ظاہر ہے کہ میرے جذبات کو صحیح طریقے سے سمجھنے کے لیئے آپکو میرے حالات جاننا پڑیں گے۔ پھر آپ فیلہ کیجیئے گا کہ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں یا غلط۔ میرا نام ارسل ہے۔ ارسل علیم۔ بس عام سی شکل وصورت کا عام سا بندہ ہوں۔ نہ تو خود کو کبھی "ہیرو" سمجھا اور نہ ہی کبھی کسی نے "جانِ جگر پری پیکر" کا درجہ دیا۔ نہ تو "چن کا ٹوٹا" ہوں اور نہ ہی کبھی کسی نے "چن ورگے" کا خطاب دیا۔ سوائے میری پیاری اماں کے، کیونکہ اس بھری دنیا میں شائد صرف اماں ہی تھیں جنہوں نے میرے لاڈ اٹھائے،

مجھے بنا کسی غرض کے پیار دیا،اور بے شمار دیا۔میں اپنے اماں ، ابا کی بڑھاپے کی اولاد ہوں۔ جس وقت میرا انزول اس دنیا میں ہوا میری بڑی آپا اور بڑے بھائی خیر سے شادی شدہ اور صاحب اولاد ہو چکے تھے۔ بھئی ظاہر ہے، دو عدد بھتیجوں اور دو عدد بھانجیوں سے "چھوٹا ماموں اور چاچو" جب اس دنیا میں بن بلائے چلا آئے تو اسکا جیسا استقبال ہو سکتا تھا، بالکل ویسا ہی استقبال میرا بھی ہوا تھا۔میں اپنے بڑے بھائیوں اور بہنوں کے لیئے "d unwante"ہی تھا۔ سو، ان کی طرف سے پروٹوکول بھی ہمیشہ ویسا ہی ملا، ناک بھوں چڑھاتا ہوا۔لیکن مجھے کسی کے رویئے کی ذرا بھی فکر نہ تھی۔ ہوتی بھی کیوں؟میری اماں تھیں ناں میرے لاڈ اٹھانے، مجھ سے پیار جتانے کو۔ میری اماں جیسی مائیں آپ نے بھی کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں ضرور دیکھی ہونگیں۔ نرم ، حلیم طبیعت والی ، چلتی پھرتی مجسم محبت اور شفقت۔۔ہاں، ابا ذرا سخت تھے۔ کڑک۔ اوپر اخروٹ کی طرح، ایکدم ٹھاہ کر کے لگنے والے ،لیکن اندر سے نرم رسیلے اور طاقت بخشنے والے۔ اماں کی محبت بھری آغوش اور ابا کی دھوپ چھاؤں جیسی شفقت کے ساتھ میں بڑا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اور میرے ساتھ ساتھ آپا اور بھیا کے بچے بھی۔ ۔

۔۔ بچپن کہاں گذرا، کیسے گذرا، ٹھیک طرح سے یاد نہیں۔ کیونکہ تب کے کراچی اور آج کے کراچی میں بہت فرق تھا۔نہ لسانی جھگڑے، نہ قومیت کے جھگڑے۔ پنجابی، سندھی، پٹھان، بلوچی، میمن، مہاجر سب پاکستانی تھے۔۔صرف پاکستانی۔ مجھے یاد ہے ابھی تک، ہم سارا سارا دن گلیوں میں کھیلا کودا کرتے تھے۔ پڑھنا اور پڑھنے کے بعد صرف اور صرف کد کڑے لگانا، بس، اتنا ہی تو کام ہوتا تھا ہم بچوں کا۔ ابا ایک بڑی نجی فیکٹری میں سپروائیزر تھے۔بہت اچھی تنخواہ تھی ان کی۔ پھر زمانہ بھی اچھا اور سستا تھا، سو خوب مزے سے زندگی گذر رہی تھی۔ بڑے بھیا کا اپنا ماربل کا کام تھا۔ ابا نے اچھے وقتوں میں منگو پیر کے علاقے میں دو ہزار گز کا پلاٹ لے کر اس وقت کی ضرورت کے مطابق تعمیر کروایا تھا۔ ہم سب اس بڑے سے صحن اور چار کمروں والے خوب کھلے سے گھر میں بڑے

خوش، بڑے مست رہتے تھے۔ محسن بھائی جان نے اپنی ماربل کی مشینیں گھر کے بیرونی کمرے میں لگا رکھی تھیں۔ یہ حصہ رہائیشی حصے سے قدرے ہٹ کر تھا۔ہمارے گھر کے بالکل ساتھ والا گھر میمنوں کا تھا۔ رشید میمن چچا بہت مرنجان مرنج قسم کے آدمی تھے۔ وہ بھی محسن بھائی جان کی طرح ماربل کا ہی کام کرتے تھے، اور انہوں نے بھی اپنی ماربل کی مشینیں گھر کے نچلے پورشن میں لگا رکھی تھیں۔ یوں نیچے والا پورشن انکی ماربل کی فیکٹری بن گیا تھا اور خود ان کی رہائیش اوپر والے حصے میں تھی۔ رشید چچا کے چار بچے تھے۔ سب سے بڑی بیٹی انعم، جو میری آپا کی ہم عمر تھیں اور شادی شدہ بال بچوں والی تھں، پھر ان سے چھوٹے دو بیٹے تھے اور پھر سب سے چھوٹی بیٹی صنم۔ادھر، ہمارے گھر تو اللہ کی خاص رحمت تھی۔ آپا سب سے بڑی تھیں، پھر ان سے چھوٹے محسن بھائی جان تھے، ان سے چھوٹی، چھوٹی آپا تھیں، ان کے بعد مونس بھائی اور انس بھائی تھے اور اسکے بعد میرا نمبر آتا تھا۔ اور ہاں، میں اپنے بھتیجوں اور بھانجیوں کا تعارف تو کروانا ہی بھول گیا۔ ذوہیب اور شہریار میرے بھتیجے تھے جو تقریباً انس بھائی سے کچھ ہی چھوٹے تھے، حمنیٰ اور یمنی میری بھانجیاں تھیں۔ وہ بھی ذوہیب اور شہریار کی ہم عمر ہی تھیں۔۔ صنم رشید چچا کی سب سے چھوٹی بیٹی تھی۔۔لاڈلی میں اسے اس لیئے نہیں کہوں گا کہ میں نے کبھی اُسے اس پوزیشن میں دیکھا ہی نہیں تھا۔ہمیشہ گندے سندے حلیئے میں، الجھے سلجھے بالوں کے ساتھ جانے کہاں سے ہمارا کھیل خراب کرنے کے لیئے آن دھمکتی، اور عین میرے ہی سامنے آکر اس طرح کھڑی ہو جاتی، جیسے واقعی " پتھر کا صنم" ہی ہو۔ایک تو اس کا حلیہ، اور پھر عین اس کا کھیل کے درمیان آنا۔اور سب سے اہم میرے سامنے ہی آکر جم سا جانا۔ میں تو جزبز ہوتا ہی تھا، میرے بھائی، بھتیجے اور تمام دوست جو مل کر میرا ریکارڈ لگاتے، تو اف توبہ۔ میرا ننھا منا مٹھنی سا وجود مارے طیش کے اچھل اچھل جاتا۔اور پھر جو میں پتھر بنی بھتنی کو جما کے کان کے نیچے دور کھتا تو وہ ایکدم عالمِ بالا سے عالمِ ظہور میں واپس آتی، اور پھر جو اپنا بھاڑ سا مُنہ کھول کر رونا شروع کرتی تو اسکی امی کے باہر آنے سے پہلے میری اماں اور چھوٹی آپا افتاں وخیزاں باہر آجاتیں، اور پھر قبل اس

کے میں بھی اپنے دوستوں اور بھائیوں بھتیجوں کی طرح غائب ہو پاتا، وہ بھتنی میری ہی ٹانگوں سے لپٹ جاتی اور " اماں، اماں" چلائے جاتی۔۔بس، پھر میں ہوتا اور چھوٹی آپا کے دھموکے، جو وہ بلا تکلف وہیں گلی میں ہی مجھے جڑ دیتیں۔اور رہیں اماں، تو وہ اس صنم کی بچی کو اٹھا، چمکارتی، پچکارتی گھر لے جاتیں اور پھر اگلے آدھے گھنٹے میں اس کا مُنہ دھلا، چوٹیاں بنا، اسے سجا سنوار گڑیا بنا، اسکی اماں کے حوالے کر آتیں۔مجھے یہ سب دیکھ دیکھ کر بے حد غصہ آتا۔اور تو اور انس بھائی اور مونس بھائی کو بھی اس پر خوب خوب غصہ آتا تھا۔مگر وہ اُس سے زیادہ مجھے قصوروار سمجھتے تھے کہ شاید میں جان بوجھ کر اس چھٹکی چھپکلی کے مُنہ لگتا تھا، جس کے نتیجے میں آپا مجھے سارے محلے کے سامنے ڈانٹ پھٹکار کر میرا اور ان سب کا تماشہ لگا دیتی تھیں۔ حالانکہ اس سارے قصے میں میرا قصور کیا ہوتا تھا بھلا۔؟ میں کوئی خود جا کر اسے دعوت تھوڑی دیتا تھا کہ "صنم بی بی۔!! ہم کھیل شروع کر چکے ہیں اور اس وقت ہمارا کھیل عروج پر پہنچ چکا ہے۔لہذا آپ اپنے اللول جلول حلیئے سمیت باہر آیئے، اور بخوشی ہمارے رنگ میں بھنگ ڈال، مجھے اماں اور آپا سے سرِ عام پٹوایئے اور اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیجئے"۔لو، بھلا مجھے کیا پڑی تھی جو میں اس آفت کی پڑیا کو مُنہ لگاتا۔لیکن، یہ بھی سچ ہی ہے کہ جتنا میں اس سے چڑتا، وہ اتنا ہی میرے راستے میں آجاتی تھی۔ جتنا غصہ اسے دیکھ کر میرے دل میں ابھرتا تھا، وہ اتنا ہی میرے صبر کو آزمانے کی کوشش کرتی تھی۔پھر میں نے دانستہ اسے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔وہ جدھر سے گذرتی میں وہ راستہ ہی چھوڑ دیتا۔ ایسے جیسے، کوئی وہمی کالی بلی کو دیکھ کر راستہ چھوڑ دے۔ اگر وہ ہمارے کھیل کے درمیان آجاتی اور ہمیشہ کی طرح میرے ہی سامنے جم جاتی تو میں کھیل ہی ادھورا چھوڑ کر بھاگ جاتا۔ پھر چاہے پیچھے سے آوازے کسے جاتے، یا سب کے کان پھاڑتے قہقہے میرا تعاقب کرتے۔۔میں بالکل بھی پرواہ نہیں کرتا تھا۔۔" یار ارسل۔!! تم صنم کو دیکھتے ہی میدان چھوڑ کر ایسے بھاگ جاتے ہو، جیسے تم نے اس سے تگڑا قرضہ لے رکھا ہو، یا پھر اس کی کوئی قیمتی چیز چرا لی ہے تم نے؟ یار اصل معاملہ کیا ہے، ہمیں بھی تو کچھ بتاؤ ناں۔؟ یاروں سے بھلا کیا چھپانا۔؟" سمیر نے

میرے کندھے پر ہاتھ اور باقی سب کو آنکھ مارتے ہوئے خباثت بھرے انداز سے کہا تو مجھے اور زیادہ آگ لگ گئی۔ میں نے آپکو بتایا ناں، کہ میں صرف اپنی اماں کا ہی لاڈلا تھا۔ باقی سب بہن بھائیوں کے لیئے تو بس ایویں ہی تھا۔ ٹائم پاس، بھائیوں بھتیجوں کے لیئے انکے کھیل کا پارٹنر تو بہنوں بھابھی کے لیئے صرف چھوٹو۔ جو بازار سے ان کے لیئے بھاگ بھاگ کر سودا سلف لاتا اور بغیر کسی اعتراض کے بھاگ بھاگ کر ان کے سب کام کرتا۔ ان سبکا چھوٹو، مگر میں شاید غلط تھا۔ سمیر کی گھٹیا بات سن کر جس طرح مجھے غصہ آیا تھا، بالکل اسی طرح مونس بھائی کے ماتھے پر بھی بل پڑ چکے تھے۔ اور پھر میرے کسی طرح کا جواب دینے سے پہلے ہی بھائی نے سمیر کی ناک پر ایک گھونسا جڑ دیا۔ لو جی، اب کیسے سوال اور کہاں کے جواب؟ دیکھتے ہی دیکھتے ہم سب دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک طرف میرے بھائی اور بھتیجے اور دو چار ہم سب کے مشترکہ دوست تو دوسری طرف سمیر سمیت باقی کے سارے لڑکے۔ پھر تو خوب گھمسان کا رن پڑا تھا۔ مکوں، ٹھڈوں، لاتوں۔ گھونسوں سے خوب ایک دوسرے کی تواضع کی گئی۔ اور جانے ہم لوگ کب تک " اصیل ککڑوں" کی طرح اچھل اچھل کر ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے رہتے کہ اپنی ماربل فیکٹری سے محسن بھائیجان اور اپنے کارخانے سے رشید چچا اور ان کے بیٹے باہر نکل آئے۔ ان سب نے بڑی مشکل سے ہمیں قابو کیا۔ ہم اس کے باوجود بھی کتنی ہی دیر کھڑے ایک دوسرے کو گھور گھور کر دیکھتے رہے۔ اور پھر بڑوں کے سمجھانے بجھانے پر اپنی اپنی راہ ہو لیئے۔ لیکن بچپن کی لڑائیاں بھی بھلا کوئی لڑائیاں ہوتی ہیں۔ چند روزہ ناراضگیاں اور پھر خود بخود ہی صلح صفائی، سو ہم بھی چند روز لڑ بھڑ کر پھر سے ایک ہو گیئے، پھر وہی ٹیم اور پھر وہی دھما چوکڑی۔۔ وقت اپنے پیچھے کیسے کیسے نشان چھوڑ جاتا ہے، یہ دیکھنے کی فرصت کسے ہوتی ہے، اور ہمیں بھی پیچھے دیکھے بنا آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتا تھا۔ سو، ہم آگے بڑھتے ہی چلے گیئے۔ اور جیسے جیسے ہم بڑے ہوتے چلے گیئے، مسلے مسائل بھی اپنا روپ بدلتے گیئے۔ دوستیاں بھی مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئیں۔ میری بھانجیوں کی طرح دوسری لڑکیاں بھی بلا وجہ باہر نہیں نکلتی

تھیں اب۔ صرف اسکول، کالج یا پھر رشتہ داروں کے گھر۔ اس سارے عرصے میں چھوٹی آپا کیساتھ ساتھ انس بھائی کی بھی شادی ہو چکی تھی۔ ابا ریٹائیر ہو چکے تھے اور ان کی جگہ فیکٹری میں انس بھائی نے لے لی تھی۔ وہ اسی فیکٹری میں انجینئر کی پوسٹ پر فائیز تھے۔ ہمارا گھر بھی اب پہلے والا نہیں رہا تھا۔ گزرتے وقت کی ضرورتوں کیساتھ ساتھ گھر اندر اور باہر سے تبدیل ہو چکا تھا۔ پہلے جہاں بڑا اور کھلا سا صحن تھا اور صحن کے بیچوں بیچ بڑا سا چھتنار پھیلا جامن کا درحت تھا، وہاں اب بڑا سا گیراج اور ہال تعمیر ہو چکا تھا۔ اور اس ہال کے اوپر چار منزلیں بن چکی تھیں۔ ظاہر ہے، نئے دور کے نئے تقاضوں کے مطابق انداز بھی تو نئے ہی ہونے چاہیءں تھے ناں۔۔ اور مزے کی بات، چچا رشید کا گھر بھی ہمارے گھر کے ساتھ ساتھ بلند ہوتا جا رہا تھا۔۔ ظاہر ہے انکے بھی بیٹے تھے اور جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے جا رہے تھے، گھر میں منزلیں اور منزلوں میں کمرے بڑھتے جا رہے تھے۔ ۔

۔ ”ارے۔!! یہ کون ” سید نور “ کا جانشین بنا، لائٹ، کیمرہ، ایکشن کا شور مچاتا پھر رہا ہے۔؟ یہ ہم مونی بھائی کی مہندی میں آئے ہیں یا کسی فلم، ڈرامے کے سیٹ پر۔؟“ میں بڑے فخریہ انداز میں کیمرہ مین اور فوٹو گرافرز کو خاص خاص اینگلز سے مووی اور تصاویر بنانے کی ہدایات دیتا پھر رہا تھا کہ عین اپنے پیچھے سے ابھرتی حیرت اور تحیر سے بھری آواز سن کر چونک اٹھا۔۔ ”ارے۔!! تم نے پہچانا نہیں انہیں؟ یہ اپنے“ ارسل ماموں “ہیں۔ کمال ہے، تم انہیں” بھول “کیسے سکتی ہو۔؟“ ابھی تو میں پہلی آواز کے جھٹکے سے ہی نہیں سنبھل پایا تھا کہ اس پر تجسس سوال کے جواب میں یمنی کی چہکتی آواز میں دیے گئے شرارتی جواب پر سٹپٹا کر پلٹا اور اپنے عین پیچھے کھڑی اس ” زردے کی پلیٹ “ کو دیکھ کر دنگ ہی رہ گیا تھا۔۔ جی ہاں! زردے کی پلیٹ، اور وہ بھی ناکوں ناک بھری ہوئی۔ بالکل زرد، زردے کی رنگ کا گھاگرہ چولی، جس پر ملٹی کلرز کے اسٹونز اور گوٹے کا کام اس طرح کیا گیا تھا، جیسے زردے کو رنگ برنگی اشرفیوں اور بادام، پستہ اور گلاب جامن، رس گلوں سے سجایا گیا ہو۔ اس لڑکی کا لباس بھی اسی طرح ان رنگ برنگے نگوں سے لشک

رہا تھا۔ پیروں میں گولڈن کھسہ اور ہلکے گھنگریالے بالوں میں پیلا، رنگ برنگے موتیوں سے سجا پراندہ ، جسے وہ ایک ہاتھ میں تھامے گول گول گھماتی میرا سر تاپاء جائیزہ لینے میں مصروف تھی۔ اس کا لمبا سا چُنری کا دوپٹہ بینیازی سے اس کے ایک شانے پر جھول رہا تھا۔ تیز میک اپ کی تہیں اور ماتھے پر چمکتی ناگن ڈیزائین کی بندیا۔ دونوں ہاتھ بھر بھر کر پہنی گئیں ملٹی کلر چوڑیاں اور گھاگھرے کے نیچے سے نظر آتی سانولی سلونی پنڈلیوں میں چمکتی گولڈن پازیب۔ اب آپ ہی بتائیں، میں نے اگر ان محرمہ کو "زردے کی پلیٹ اور وہ بھی ناکوں ناک بھری ہوئی" کہہ دیا، تو کیا غلط کیا۔؟۔" ارسل ماموں۔!! پہچانا اسے؟ یا تم بھی اسکی طرح اپنے ماضی سے باغی ہو، اور اچھا برا جیسا بھی ہے، اسے بھولنے میں ہی عافیت سمجھتے ہو۔؟" بڑی آپا کی لاڈو یمنیٰ کی شوخ و شنگ چہکتی (بلکہ میرا ریکارڈ لگاتی آواز) نے مجھے ایکبار پھر چونکا دیا اور میں، جو، ان محترمہ کا لاشعوری طور پر جائیزہ لینے میں مصروف تھا کہ گڑبڑا کر ان دونوں کو سوالیہ انداز سے گھورنے لگا۔ ۔" اچھا۔!! تو یہ ہیں جناب عزت ماب" ارسل، موسل" صاحب۔ ہوں، ارے یمنیٰ آپی! یہ تو بالکل بھی نہیں بدلے۔ ویسے کے ویسے ہی ہیں۔ جل ککڑ اور۔۔۔!!!!" ۔" یمنیٰ۔۔!! کون ہیں یہ محترمہ؟ آج سے پہلے تو انہیں کبھی نہیں دیکھا۔؟" اس "گیندے کے پھول" کے مُنہ سے اپنے لیئے "جل ککڑ" کا خطاب ہی مجھے آگ لگانے کو کافی تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میری رگوں میں خون کی جگہ لاوا بہنے لگا ہو۔ گرم گرم غصے کا ابلتا ہوا لاوا۔ مگر میں خود پر کنٹرول کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا، (بلکہ مجبور تھا) کیونکہ مجھے اس کے حدود اربعہ کا ابھی ٹھیک طرح سے پتا نہیں چل سکا تھا۔ اس لیئے صبر کے بڑے بڑے گھونٹ زبردستی بھرتے ہوئے میں نے یمنی سے بڑے ہی معصوم انداز میں پوچھا تھا لیکن، اس کے جواب دینے سے پہلے ہی وہ حسینہ ایک قدم آگے بڑھی اور مسلسل ایک ہاتھ سے اپنا رنگ برنگا پراندہ جھلاتی، دوسرا ہاتھ ایک ادا سے کولہے پر جمائے، میری آنکھوں میں آنکھیں گاڑے مسکراتے ہوئے گویا ہوئی تھی۔۔" اوہو۔۔!! تو یہ بات ہے؟ یہ حضرت تو لگتا ہے واقعی" فارغ البال" ہونے کے

ساتھ ساتھ " فاطرالعقل" بھی ہوتے جا رہے ہیں۔یعنی کہ ،یہ واقعی اپنے" تابناک ماضی" کو کسی طاق میں رکھ کر بھول چکے ہیں، یا، ابھی بھی میرے سامنے جم کر کھڑے ہونے کی تاب نہیں رکھتے؟ یمنی!! کیا یہ ابھی بھی" کھیل ادھورا" چھوڑ کر میدان سے بھاگ جاتے ہیں۔ جیسے برسوں پہلے بھاگ جایا کرتے تھے۔؟" ایں، یہ کیا۔؟ ابھی تو میں خود کو فارغ البال کہلائے جانے ہی پیچ وتاب کھا رہا تھا کہ میرے بال بھی آج کل کے نوجوانوں کی طرح گر گر کر بے حال ہو چکے تھے کہ، اس کے اگلے جملے نے میرے سامنے ماضی کے کئی مناظر لا کھڑے کیئے تھے۔ میں حیرت کے مارے مُنہہ کھولے، آنکھیں پھاڑے اسے ہی تکتا جا رہا تھا۔ ۔ " یہ۔۔۔یہ۔۔ صنم رشید میمن۔۔۔!!!!" ۔" جی۔۔!! میں صنم۔۔ وہ صنم، جو آپکو دیکھ کر واقعی صنم (بت) میں ڈھل جایا کرتی تھی۔اور آپ، آپ مجھے دیکھتے ہی میدان چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ جل ککڑے ، بھگوڑے کہیں کے۔!!" اک ادا سے لٹک مٹک کر کہتی وہ میری حیرتوں اور حواسوں پر مزید بجلیاں گرا رہی تھی۔

کہاں وہ گندی سندی، الجھے سلجھے بالوں والی ہونق صورت بھتنی بنی چڑیل۔۔۔اور کہاں یہ بااعتماد، سانولی سلونی، درمیانے قد، مناسب سراپے والی صنم رشید۔۔اب کہ میرا حواس باختہ ہونا لازم تھا۔۔اور واقعی، میں حواس باختہ ہو بھی گیا تھا۔۔"کیوں۔؟ یاد آیا کچھ ، یا ابھی بھی کچھ باقی ہے یاد کروانے کو۔؟" اک ادا سے موتیوں اور گھنگروں والا پراندہ میرے سینے پر مارتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ۔" کک۔کیا۔کیا یاد کروں۔؟ اور کیا یاد کروانا چاہتی ہیں آپ۔؟" اس کی اس حرکت پر میں مزید بوکھلاہٹ کے ساتھ ساتھ ہکلاہٹ کا بھی شکار ہو چلا تھا۔ ۔" ارے!!وہ ہی، وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ وہ جو لطف مجھ پر تھے بیشتر، وہ کرم کہ تھا میرے حال پر۔ مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔۔ سنو ذکر ہے کئی سال کا، کیا آپ نے ایک وعدہ تھا۔ سو بنھانے کا تو ذکر کیا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔ اور اس "وہی" کے بعد اس نے بیچارے" مومن خان مومن صاحب" کی روح اور ان کے کلام پر ستم کے پہاڑ توڑتے ہوئے، ان کی مشہورِ زمانہ غزل

بالکل اقبال کی ''لب پہ آتی ہے دعا'' کے اسٹائل میں گنگنانے کی کوشش فرمائی تو مجھے اپنے ساتھ ساتھ اسکے بھی فاطر العقل ہونے کا گمان ہونے لگا۔ اس پر یمنی کی قلقل کرتی ہنسی، وہ اپنے اردگرد کے ماحول اور افراد کی وجہ سے دوپٹہ مُنہ میں ٹھونس کر روکنے کی کوشش میں بے حال ہوئی جارہی تھی۔ میرے دماغ کا میٹر ایکدم گھوما اور گمان غالب تھا کہ میں بچپن کی طرح ہی جما کے دوہاتھ اس '' زردے کی پلیٹ'' کے کان کے نیچے دھر ہی دیتا کہ حمنیٰ مجھے بازو سے پکڑ، کھینچتی ہوئی وہاں سے دور لے گئی۔ پیچھے یمنی کے ساتھ ساتھ اس کے قہقہے بھی میرے تعاقب میں بھاگتے چلے آرہے تھے۔۔جی جناب، تو یہ تھا عرصہ دراز کے بعد اس ''بھتنی'' سے ایکبار پھر میرا پہلا باضابطہ ٹاکرہ۔۔اب صورتِ حال یہ تھی کہ میں جدھر بھی جاتا وہ ''کالی بلی'' میرا راستہ کاٹنے کو سامنے ہی کھڑی ملتی۔ مہمانوں کے ہجوم اور ڈھیروں ڈھیر کاموں کے باوجود مجھے بارہا ایسے لگا جیسے میں کسی کی نظروں کے حصار میں ہوں۔ کسی کی سلگتی نگاہیں میری پشت کو چھیدتی ہوئی محسوس ہوتیں، اور ان نگاہوں کی حدت سے میرا تن من سلگ اٹھتا۔ میں گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا، مگر کوئی سرا ہاتھ نہ آتا۔ میں تو کنفیوز ہوا پھر رہا تھا۔اور وہ میسنی، شادی کے تمام فنکشنز میں آگے آگے نظر آرہی تھی۔ بڑی آپا کی حمنہ، یمنی تو ایک طرف، چھوٹی آپا کی اکلوتی سپتری ارفع، اور بڑے بھیا کی مریم کے ساتھ بھی اس کی خوب گاڑھی چھننے لگی تھی۔شادی کی تقریبات کے دوران بھی اور اس کے بعد بھی صنم کے ڈیرے زیادہ تر ہمارے گھر میں ہی لگے رہتے تھے۔ میں پہلے پہل تو بہت جز بز ہوا، مجھے لگا کہ اس کی یہ دخل در اندازی میرے ساتھ ساتھ میرے گھر والوں کو بھی عجیب لگ رہی ہوگی۔ مگر مجھے یہ دیکھ کر بہت حیرت ہو رہی تھی کہ وہ تو اب بھی میرے گھر والوں کی خاص الخاص لاڈلی ہستی بنی پھر رہی تھی۔ خاص طور سے اماں اور چھوٹی آپا، وہ تو ان کی اب بھی ایسی ہی لاڈلی تھی جیسے کہ بچپن میں ہوتی تھی۔ وہ سارا سارا دن ہمارے ہی گھر میں ڈولتی پھرتی پائی جاتی تھی۔ بھئی ظاہر ہے، اسے کون سا رکشہ ٹیکسی کروا کر آنا پڑتا تھا۔ دیوار سے دیوار ملی تھی اور چھت سے چھت۔ جب دل چاہتا چھت سے ٹپک پڑتی اور

جب دل چاہتا دروازے کے راستے آن دھمکتی۔ شاید اسے روکنے ٹوکنے والا کوئی تھا ہی نہیں۔۔ میرا تو پہلے ہی زیادہ وقت گھر سے باہر ہی گذرتا تھا۔ میں ماس کمیونیکشن کا اسٹوڈنٹ تھا، اور میری پوری دلچسپی اور لگن ڈائیرکشن، پروڈکشن میں تھی۔ اور اب تو میرا زیادہ تر وقت واقعی لائٹ، کیمرہ، ایکشن کہتے ہی گذرتا تھا۔ گو کہ شروع شروع میں میرے اس شوق سے ابا بہت نالاں تھے۔ وہ برملا بھری محفل میں ہی مجھے ''ناچا'' کا اعلی شان خطاب دے ڈالتے۔ مگر میں جانتا تھا، یہ شعبہ ہی ایسا تھا کہ اس میں شروع شروع میں سب کی مخالفت مول لینا پڑتی ہے۔ اس فیلڈ میں نام کمانے، عزت بنانے اور پھر مقام پانے کے لیئے پتھروں کی راہوں پر بچھے کانٹوں کے اوپر سے ننگے پاؤں گذرنا پڑتا ہے، چاہے مرد ہو یا عورت۔ ایسی ہزیمتیں سب کو سہنا پڑتی ہیں۔ ایسی قربانیاں سب کو دینی پڑتی ہیں، اسی لیئے میں نے ابا کی باتوں کو کبھی دل پر نہیں لیا تھا۔ کبھی پلٹ کر انہیں جواب نہیں دیا تھااور نہ ہی کبھی کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ ہاں، اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی سچ تھا کہ میں نے کبھی بھی اس راہ کو چھوڑنے کا ارادہ بھی نہیں کیا تھا۔ یعنی، اگر ابا، اماں خفا تھے، تو میں بھی پر امید تھا کہ کبھی نہ کبھی تو میں انہیں منا ہی لوں گا ناں۔ اور انہیں اپنے شوق کے حق میں قائل کر کے ہی رہوں گا۔ بالکل ایسے ہی جیسے محسن بھائی اور انس بھائی نے انہیں قائل کر ہی لیا تھا کہ وہ گراؤنڈ فلور پر بنے ہال کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان میں ماربل کی مشینیں لگا لیں۔ اور اب لگ رہا تھا کہ واقعی میں گھر والوں کو قائل کرنے منانے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔ کیونکہ بھائی کی شادی میں کی گئی میری ایونٹ مینجمنٹ، میری ڈائیرکشن میں اوپر تلے سپر ہٹ ہونے والے دو ڈرامہ سیریلز، ٹاک شوز، اور مارننگ شو۔ سب نے مل جل کر میرا مورال کافی حد تک بلند کر دیا تھا۔ وہ سب اب سمجھ چکے تھے کہ میں شاید اسی فیلڈ میں نام روشن کرنے کے لیئے اماں ابا کی آخری عمر میں انہیں عطا کیا گیا تھا۔ مگر نہیں، مجھ سمیت کسی کو بھی شائد اس بات کا علم نہ تھا کہ میں کس ''شعبے میں نام روشن ''کرنے کے لیئے دنیا میں وارد ہوا تھا۔

۔پرواسنگ نکل جاتے ہیں،لوگ محبت کرنے والے۔
تتلی تتلی لہراتے ہیں، پھولوں کی امید لیئے۔ اک دن
خوشبو ہو جاتے ہیں، لوگ محبت کرنے والے۔۔
جی۔۔امجد اسلام امجد صاحب نے بالکل ٹھیک ہی فرمایا
ہے۔ واقعی، محبت کا جذبہ جب کسی دل میں گھر کرتا
ہے تو۔بس۔ پھر وہ" عشق نے کہیں کا نہ چھوڑا ورنہ،
آدمی ہم بھی تھے بہت کام کے۔"گنگناتا پھرتا ہے۔
اور ضروری تو نہیں کہ اس وارداتِ قلبی کا شکار ہونے
والے کسی خاص رنگ، خاص نسل، خاص عمر اور خاص
مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے ہوں۔جی نہیں، ایسا تو ہرگز
نہیں ہوتا ناں۔ اور یہ تو میں بھی نہیں جانتی کہ محترم
کیوپڈ صاحب نے میرے معصوم اور نادان دل کو ہی
کیوں نشانہ مشق بنایا؟ اور کب بنایا؟ اس کے بارے
میں میں وثوق سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی۔ مگر ہاں،
مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں جیسے ہی گلی میں
بچوں کے کرکٹ کھیلنے اور دوڑنے بھاگنے کی آواز
میرے کانوں میں پڑتی، تو میں نہ چاہتے ہوئے بھی خود
بخود ہی باہر کی سمت چل پڑتی۔یہ دیکھے بغیر کہ میرا
حلیہ کیا ہے، میرے پاؤں میں جوتی ہے کہ نہیں،

میرے بال بندھے ہوئے ہیں یا جھاڑ جھنکار کی مانند
بکھرے پڑے ہیں، میرا مُنہ دھلا ہوا ہے یا بلیوں کا چاٹا
ہوا۔ میں تو بس، جیسے نیند کی کیفیت میں چلتی ہوئی گلی
میں جا نکلتی اور ہوش تو اس وقت آتا جب لال بھبھوکا
چہرہ لیئے غصے سے بھڑکتے ہوئے ارسل علیم کے
ہاتھوں بری طرح پٹ چکی ہوتی۔اور ایسا ہمیشہ ہی ہوتا
تھا۔ جتنا وہ مجھے جھٹکتا، مجھے دھتکارنے کی کوشش کرتا،
دھکے دھکے مار مار کر اپنے سامنے سے ہٹاتا، اتنا ہی میں
اس سے لپٹ لپٹ جاتی۔اس سے چار چوٹ کی کھا کر
بھی اسی کی پناہ میں جانا چاہتی۔ جانے کیوں؟؟ اور پھر
روتے ہوئے بھی میرے مُنہ سے صرف اماں ہی
نکلتا۔ حالنکہ ہم سارے بہن بھائی تو اپنی امی جان کو"
امی" ہی کہتے تھے۔۔مگر ارسل کے سامنے میں تب
تک گلا پھاڑے"اماں اماں" کی دہائی دیئے جاتی، جب
تک اس کی اماں اور آپا آکر مجھے اس کی گرفت سے بچا
نہیں لیتیں۔اور یہ تو روز کا ہی معمول تھا۔ میں روز اس
کے ہاتھوں پٹتی، اور پھر وہ میری وجہ سے اپنی آپا کے
ہاتھوں بھرے محلے میں ذلیل ہوتا۔۔ میں جان بوجھ
کر ایسا ہرگز نہیں کرتی تھی۔یہ سب کچھ نہ چاہتے

ہوئے بھی خود بخود ہی ہوتا چلا جاتا۔ پھر یوں ہوا کہ وہ مجھ سے کترانے لگا۔ جہاں میری ایک جھلک بھی دکھائی دے جاتی، وہ سر پر پیر رکھ کر ایسے بھاگتا جیسے بھوت دیکھ لیا ہو۔ ویسے تو اس نے مجھے "بھتنی اور چڑیل" جیسے عظیم الشان القابات سے نواز ہی رکھا تھا، مگر اب تو یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے میں حقیقت میں ہی اس کے لیئے کسی چڑیل کا روپ دھار چکی تھی۔ مجھے سامنے دیکھتے ہی اس کا اس طرح سے کھیل ادھورا چھوڑ، میدان سے بھاگ جانے یا پھر سر راہ ٹاکرہ ہونے کی صورت اسکا راستہ بدل لینے سے میرے نازک دل کو بہت ٹھیس پہنچتی تھی، مگر میں اس ظالم کو کچھ کہہ بھی تو نہیں سکتی تھی ناں۔ پھر ایک دن اپنی اسی کیفیت کی وجہ سے مجھے اپنے گھر والوں کے سامنے بھی جی بھر کے ذلیل ہونا پڑا۔ امی اور باجی نے تو میری اچھی خاصی کلاس ہی لے ڈالی تھی۔ اور بڑے بھیا۔ باپ رے باپ۔ بڑے بھیا کا غصہ تو ویسے بھی برا خطرناک تصور کیا جاتا تھا، اور اس دن تو انہوں نے غصے میں مجھے دو جھانپڑ بھی رسید کر ڈالے تھے۔ بات ہی کچھ ایسی ہو گئی تھی کہ کسی کو خود پر

کنٹرول رہا ہی نہیں۔ اس دن بھی محلے بھر کے لڑکے اپنے روزمرہ کے کھیل میں مشغول تھے۔ میں اپنے دھیان بیٹھی اسکول کا کام کر رہی تھی کہ اچانک میرے کانوں میں اسی "ارسل موسل" کے پرجوش نعرے کی آواز آئی۔ بس، پھر اس کے بعد کیا ہوا، مجھے کچھ یاد۔ میں ہمیشہ کی طرح اندھی بنی ایک ٹرانس کے عالم میں چلتی اسکے سامنے جا کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے غصے سے دانت کچکچا کر میری طرف دیکھا اور ہاتھ میں پکڑا بیٹ گھما کر میرے پیروں میں پٹختا ہوا وہاں سے واک آؤٹ کر گیا۔ میں آنکھوں میں آنسو لیئے وحشت بھری نگاہوں سے اسے خود سے دور ہوتا دیکھتی رہ گئی۔ اسی وقت حمنی اپنے گیٹ سے باہر آئی اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے میرے گھر کے گیٹ تک چھوڑ گئی۔ میں ڈبڈبائی نگاہوں سے سب کو دیکھتی ہوئی وہیں بیٹھتی چلی گئی۔ اسی وقت انس بھائی اور ان کے دوست جانے کس گلی سے ارسل کو گھیر گھار کر واپس لیئے چلے آئے۔ ارسل نے زہر میں بجھی تیز نگاہ مجھ پر ڈالی اور سر جھٹک کر دوبارہ اپنا بیٹ تھام لیا۔ اور پھر قبل اس کے کہ ان کا کھیل دوبارہ شروع ہو پاتا، ان لڑکوں میں

سے کسی نے جانے اسے کیا کہا کہ ایکدم سے سارا ماحول ہی بدل گیا۔ وہی لڑکے جو تھوڑی دیر پہلے تک مل جل کر کھیل رہے تھے، ایکدم آگ بگولہ ہو گئے۔ ارسل کے بھائی اور بھتیجے دوسرے لڑکوں پر چڑھ دوڑے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے گلی میں وہ غدر مچا کہ خدا کی پناہ۔ گرد کے بادل تھے اور ''ہوہا'' کی آوازیں۔ وہ لوگ خود کو ''بروسلی'' کا جانشین ثابت کرنے پر تلے۔ ایکدوسرے پر بڑھ چڑھ کو وار کر رہے تھے۔ اتنا بے ہنگم شور اور چیخ چہاڑہ سن کر میرے گھر سے ابو اور بھیا ڈورے چلے آئے۔ ادھر محسن بھائی اور ان کے ورکر بھی اپنا سارا کام وام چھوڑ کر باہر آ چکے تھے۔ ان سب نے مل کر بمشکل ان لڑتے بھڑتے'' ککڑوں'' کو چھڑوایا۔ اور جب تحقیقات کی گئیں تو قرعہ فال میرے نام کا نکلا۔ ان سب نے فرد جرم مجھ پر عائد کر دی تھی۔۔اور اس میں بھی اس ارسل موسل کا ہاتھ سب سے زیادہ تھا۔ ابو تو شائد در گذر کر ہی گیئے کہ ابھی میری عمر ہی کیا تھی، اور وہ ارسل۔ وہ بھی کونسا کہیں کا شہزادہ ''گلفام'' تھا، کہ پریاں اور لڑکیاں اسکی ایک جھلک دیکھ کر ہی ڈھیر ہو جاتیں۔ یہ تو میرے ہی سر میں جانے خدا جانے کیسا سودا آن سمایا تھا کہ اس سڑے سوکھے، کالے، لمبے بینگن جیسے ارسل'' موسل ''کو دیکھ کر اپنا آپ ہی بھول جاتی۔ ایسی بت بن جاتی کہ دیکھنے والے دیکھتے ہی رہ جاتے۔ جانے کیوں۔؟۔'' ناک کٹوا کر رکھ دی اس لڑکی نے ہماری سارے محلے میں۔ وہ ٹانگ برابر چھوکرے، جو کل تک میری شکل دیکھ کر راستہ بدل لیتے تھے، آج کیسے تن تن کر اور اچھل اچھل کر میرے ہی سامنے میری ہی بہن کی شان میں قصیدہ گو تھے۔ اور میں، اس کی وجہ سے، صرف اس کی بے وقوفی کی وجہ سے انکی ٹکے ٹکے کی باتیں سننے پر مجبور ہو گیا۔ چپ چاپ کھڑا انکی بک بک سنتا چلا گیا۔ اور یہ۔۔یہ میسنی، گھنی، اب کس طرح مُنہ اٹھائے، آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہی ہے جیسے میں اس کی نہیں کسی اور کی بات کر رہا ہوں۔ بیوقوف، نالائق کہیں کی۔!!'' " بھیا کا جلال لمحہ بہ لمحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اور میں واقعی ہونقوں کی طرح انہیں غصے کے مارے کف اڑاتے دیکھ رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بھیا کو آخر ہوا کیا۔؟۔'' باجی۔!! میں

نے تو کچھ بھی نہیں کیا، پھر بھیا مجھے کیوں ڈانٹتے جا رہے ہیں۔؟ میں تو کب سے آپکے پاس ہی بیٹھ کر اپنا ہوم ورک کر رہی ہوں اور بھیا ہیں کہ آتے ہی سب کو ڈانٹنا شروع ہو گیئے ہیں۔!!" بھیا سے نظر بچا کر میں نے اپنے پاس ہی سر جھکا کر بیٹھی باجی کے کان میں گھس کر ہولے سے پوچھا تو جواب میں انہوں نے ایک زبردست گھوری کے ساتھ ساتھ زوردار دھموکے سے بھی نواز ڈالا تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو میں اپنی کمر ہی سہلا کر رہ گئی۔۔" امی جان۔!! بس، بہت ہو گیا۔ آج سے اس بیوقوف لڑکی کا گھر سے باہر نکلنا بند۔ اسے اسکول میں خود چھوڑنے جاؤں گا اور لینے بھی خود ہی جاؤں گا۔ دیکھتا ہوں، اب یہ کیسے رکتی ہے کہیں۔ جہاں یہ رکی، وہیں اسے زندہ گاڑ کر واپس آ جاؤں گا۔ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھوں گا۔ سمجھا دیں اسے اچھی طرح سے۔!!" میرے ساتھ ساتھ سب کو کڑی نگاہوں سے گھورتے ہوئے بھیا نے زبردست انداز سے سکوّوارننگ دی اور غصے سے تن فن کرتے نیچے چلے گیئے۔ اور پیچھے رہ گئیں امی، باجی اور ان کے نرغے میں پھنسی میں، معصوم اور مظلوم سی صنم رشید میمن۔ پھر ہوا یوں کہ بھیا کی نگرانی کا سلسلہ کچھ عرصہ تو بہت اچھی طرح چلتا رہا۔ مگر کب تک؟ اب بھیا کو دنیا میں اور بھی تو کام تھے ناں اس صنم نامی ذمہ داری کی نگرانی کے سوا۔ سو، آہستہ آہستہ ان کے غصے کے ساتھ ساتھ ان کی حفاظت کا گراف بھی کم ہوتا چلا گیا۔ اب ایکبار پھر میں تھی، اور میری خود فراموشی۔ پھر جیسے ہی میری طرف سے انہیں چند بار شکایات موصول ہوئیں، انہوں نے مجھے کالا پانی کی سزا سنا دی۔ جی ہاں!! میرے لیئے حیدرآباد کسی کالے پانی سے کم تھوڑی تھا، جہاں مجھے ماموں ممانی کی بیٹی بنا کر بھجوا دیا گیا۔ اور میں معصوم، کسی سے کچھ کہہ بھی نہ پائی کہ میرا تو کوئی قصور بھی نہیں تھا۔ یہ ستم تو مجھ معصوم پر محبت کے شہنشاہ نے ڈھایا تھا۔ کیوپڈ کے ظالم تیر کا نشانہ میرے دل ناتواں کو اس طرح گھائل کر گیا کہ پھر نہ دل کسی کام کا رہا اور نہ ہی میں۔۔

-------۔ ہزاروں دکھ پڑیں سہنا، محبت مر نہیں سکتی۔۔ ہے تم سے بس یہی کہنا، محبت مر نہیں سکتی۔ پرانے رابطوں کو پھر نئے وعدوں کی خواہش ہے۔ ذرا

اکبار تو کہنا، محبت مر نہیں سکتی۔۔ میں نے کامیابیوں کی طرف سفر شروع کر دیا تھا، اور یہ سفر میرے اپنوں کی دعاؤں کے ساتھ بہت تیزی سے جاری تھا۔ اپنی ان کامیابیوں سے میں بے حد خوش تھا، اور کیوں نہ ہوتا۔ آخر کار میں نے اپنی پیاری اماں اور ابا کے دل سے سارے واہمے ختم کر ہی دیئے تھے۔ خاص طور سے ان کا یہ وہم کہ شوبز کی چکاچوند میں گم ہو کر میں کہیں انہیں بھول ہی نہ جاؤں، کہیں اتنا مشہور، اتنا مغرور ہی نہ ہو جاؤں کہ ان سے اپنے تعلق پر، اپنے متوسط طبقے کا فرد ہونے پر شرمندگی محسوس کرتے ہوئے انہیں disown ہی نہ کر دوں۔ حالانکہ مجھے تو اپنے ابا کا فیورٹ شعر اپنی پوری جزیات اور گہرائی کے ساتھ ہمیشہ یاد رہا تھا۔ کیونکہ بہت چھوٹی عمر میں ابا نے یہ شعر جیسے ہمارے دماغوں میں بٹھا دیا تھا، کچھ اس طرح کے اب کبھی بھول ہی نہیں سکتا تھا۔۔ ہم ایسی کل کتابوں کو قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں۔ جنہیں پڑھ کے بچے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں۔۔ اور ابا کا دیا پیغام میں تو کبھی نہیں بھولا تھا، مگر اس کا کیا علاج کہ ان کے دل میں جانے کیوں وہم سے بیٹھ گیئے تھے، شائد اس لیئے کہ میں ان کی آخری عمر کی اولاد تھا، سو ان دونوں کو دل شائد میرے لیئے کچھ زیادہ ہی دھڑکتا تھا۔ اور جناب، دل تو میرا ابھی دھڑک رہا تھا۔ نئی لے پر، نئی تال پر۔ اپنے ہی گھر میں ایک خاص قسم کے استحکاک کے ساتھ دن رات اسے چلتے پھرتے، بلاکہ سب کے ساتھ خوب گھلتے ملتے دیکھ دیکھ کر میں حیرت زدہ ہو جاتا۔ اور اس پر وہ میرے پاس سے گذرتے ہوئے کوئی نہ کوئی ایسی بات یا حرکت ضرور کر جاتی کہ میں اندر ہی اندر جلتا بھنتا رہ جاتا اور وہ بڑے مزے سے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے اماں، بھابھی یا آپا کے ساتھ گپیں لڑانے میں یوں مگن ہو جاتی جیسے میرے وجود سے قطعی طور پر لاعلم ہو۔۔ " ارفع۔!! یہ صنم آج کل کچھ زیادہ ہی ادھر نہیں پائی جا رہی۔؟ کیا اس کے گھر والوں نے اسے نکال باہر کیا ہے جو یہ لوگوں کے گھروں میں جھانکتی پھرتی ہے۔ چڑیل کہیں کی، اپنے گھر میں دل نہیں لگتا اس کا اور دوسروں کو کے گھروں پر قبضہ جمانے چلی ہے۔ اونہہ۔!!" " چھوٹی آپا کی بیٹی ارفع کے ہاتھ سے چائے کا مگ پکڑتے ہوئے میں نے کچھ فاصلے پر بیٹھی مزے سے پاؤں

جھلاتی صنم کو کھا جانے والی نگاہوں سے گھورتے ہوئے پوچھا تو اس کے جواب دینے سے پہلے ہی ادھر سے جوابی حملہ ہو گیا۔۔" رافی۔۔!! اپنے ماموں سے کہہ دو، اگر ان سے میرا اور میری پیاری اماں کا پیار دیکھا نہیں جاتا تو اپنا بوریا بستر اپنے پروڈکشن ہاؤس ہی لے جائیں، کیونکہ مجھے میرے گھر والے نکالیں یا نہ نکالیں،، مگر میں تو ان کے سینے پر مونگ دلنے کے لیئے انہیں ہمیشہ یہیں نظر آؤں گی۔ چلتی پھرتی، کھاتی پیتی، ہنستی ہنساتی اور باتیں بگھارتی۔ چاہے ان کا کلیجہ جلے یا یہ پھر یہ خود جل جل کوئیلہ بنیں اور پھر کوئلے سے راکھ۔۔who care۔!!" ۔" ارفع ۔!! یہ چڑیل، یہ۔۔یہ بھتنی، پہلے تو کبھی نظر نہیں آئی تھی یہاں؟ مونی بھائی کی شادی میں ہی جانے کہاں سے ٹپک پڑی، اور میری پر سکون زندگی میں زلزلے لے آئی ہے۔ کیا اس کے ابو، اس کے بھائیوں نے اسے زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، جو یہ اب آزاد ہوئی ہے تو لگتا ہے، جیسے صدیوں کی قید کے بعد کسی چڑیل کا کھلا چھوڑ دیا گیا ہو، شریف انسانوں کو تنگ کرنے، ان کا خون چوسنے کے لیئے۔۔!!" میں غصے سے جلا بھنا تو ہوا ہی تھا، اور نہ جانے کیا کیا کہتا چلا گیا اور اپنے جوشِ خطابت میں یہ بھی نہ دیکھ سکا کہ اس کا سانولا سلونا رنگ کیسے پھیکا پڑ گیا تھا۔اس کی چھوٹی چھوٹی کاجل بھری آنکھیں اس وقت ایسے تالاب کا منظر پیش کر رہی تھیں جو پانیوں سے بھرا ہو اور اس کے کنارے اگی گھاس جل جل کر سیاہ ہو گئی ہو۔ وہ اپنے باریک کٹاؤ والے لبوں پر ظلم کرتی انہیں بری طرح کچلتی ایکدم اٹھی اور میرے نزدیک سے گذرتی ہوئی تیزی سے لاؤنج کا دروازہ پار کرتی، سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ ہاں، البتہ جانے سے پہلے وہ ہاتھ مار کر میرے ہاتھ میں پکڑا بھاپ اڑاتی گرم چائے سے بھرا مگ مجھ پر الٹانا نہیں بھولی تھی۔۔ میں، جو بڑے مزے سے زندگی میں پہلی بار اسے واک آؤٹ کرتے دیکھ کر اپنے دل میں بڑی کمینی سی خوشی پھیلتی محسوس کر رہا تھا اس افتاد پر ایکدم گھبرا کر، بلکہ جلبلا کر صوفے سے اٹھا تھا۔ میرے اس طرح ایکدم چھلانگ مار کر اٹھنے اور پھر اٹھتے ہی اچھل کود مچانے کی وجہ سے میرے ہاتھ میں پکڑا مگ بمعہ گرم گرم چائے پاس کھڑی ارفع کے پاؤں پر جا پڑا تھا اور اب میرے ساتھ ساتھ وہ

غریب بھی اچھل رہی تھی۔ میں تو صرف اپنے کپڑے جھاڑنے اور خود کو اس جلن سے بچنے کی کوشش میں ”بندر“ بن گیا تھا، مگر بے چاری ارفع خواہ مخواہ ہی لپیٹے میں آگئی تھی۔ وہ تو باقایدہ رو رہی تھی اور ساتھ ساتھ مجھے کوس بھی رہی تھی کہ میری وجہ سے اس کے پاؤں پر چوٹ بھی لگی اور اس کا فیورٹ مگ بھی ٹوٹا۔ اور پھر اس کے ساتھ ساتھ اس کے دن رات کی محنت سے بڑھائے گئے ہاتھوں اور پیروں کے ناخنوں میں سے اس کے پاؤں کے انگوٹھے کا ناخن بھی دو لخت ہو گیا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر اس کی نئی نئی بنی دوست صنم بھی روٹھ کر جا چکی تھی۔ یعنی کہ میرے کھاتے میں ایک ساتھ ہی کئی جرم آن پڑے تھے اور میں، بیچارہ ملک کا مایہ ناز ڈائیرکٹر، پروڈیوسر اپنے آدھے جلے جسم کے ساتھ اب اماں، بڑی آپا اور بڑی بھابھی کی ڈانٹ کھا کھا کر اپنی جان بھی جلا رہا تھا۔۔ ”ارسل۔!! تمہیں ضرورت کیا تھی صنم کو چھیڑنے کی۔؟ یار ایک بات تو بتاؤ ذرا، تمہیں آخر چڑ کیا ہے اس بیچاری سے۔ اتنی سیدھی سی تو ہے۔!!“ (جی جلیبی کی طرح سیدھی۔)۔ انس بھائی کا لیکچر جاری تھا اور میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔۔ ”یار۔۔!! تم بچپن کی باتیں بھول نہیں سکتے۔؟ وہ زمانہ تو کب کا گذر چکا، اب نہ تو تم بچے ہو اور نہ ہی وہ ”بھتنی“، میرا مطلب ہے بچی۔ دونوں ہی بڑے ہو چکے ہو، تو اب اپنے کام سے کام رکھا کرو ناں۔ ضرورت کیا ہے تمہیں ایک دوسرے سے الجھنے کی۔ ایویں ہی فضول میں اس کا دل بھی دکھایا، اماں کو بھی ناراض کیا، ارفع کو بھی رلایا اور پھر سب سے بڑھ کر خود کو بھی جلایا۔ بھلا ملا کیا تمہیں یہ سب کر کے۔ بتاؤ ذرا؟“ انس بھائی میرے زخموں پر مرحم لگاتے ہوئے ساتھ ساتھ بولتے بھی جا رہے تھے اور میں برے برے مُنہ بناتا، چپ چاپ انہیں سنے جا رہا تھا۔۔ ”تو اور کیا۔!! سمجھائیں اسے انس۔ کم از کم مجھے تو اس سے طرح کی کسی بھی بے وقوفی کی قطعی توقع نہ تھی!!“ روبی بھابھی نے میری طرف پانی کا گلاس اور پین کلر بڑھاتے ہوئے خفگی بھرے انداز میں کہا تو میں بے بسی سے انہیں دیکھ کر رہ گیا۔۔ ”اب ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے روبی۔ کمال ہے، اتنا کچھ کہہ گیئے تم گھر آئی مہمان سے۔ نہ اس کا لحاظ کیا اور نہ ہی

کسی اور کا۔ اور اب اتنے برے برے مُنہ بنا کر ہمیں ایسے دکھا رہے ہو جیسے سارا قصور ہمارا ہی ہے۔؟ چھوڑو یار۔ کیا رکھا ہے لڑائی جھگڑے میں۔ چھوڑ دو ان لڑکیوں کو ان کے حال پر۔ چاہے وہ صنم ہو یا حمنی، یمنی، ارفع ہو یا مریم۔ تم بس ان کے معاملات میں ٹانگ مت اڑانا اب، سمجھے۔!" انس بھائی نے شرارت سے کہا تو بھابی کے ساتھ ساتھ میں بھی مسکرا دیا۔ اور پھر میں نے ایکبار پھر اس صنم نامی کالی بلی سے بچ بچا کر رہنے کا پکا ارادہ کر لیا، اور پھر میں اپنے اس فیصلے پر کافی حد تک عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی کرتا رہا، مگر وہ بھی صنم تھی۔ میرا راستہ کاٹنے سے باز کیسے رہ سکتی تھے۔۔ اور پھر اسی "چوہے بلی" کے کھیل میں کب یہ "چوہا" ارسل علیم اس "کالی بلی" صنم رشید کا شکار ہو گیا، خود اسے بھی علم نہ ہوا۔ ۔

۔ میری آنکھوں کے سمندر میں جلن کیسی ہے۔ آج بھی دل کو تڑپنے کی لگن کیسی ہے؟۔ برف کے روپ میں ڈھل جائیں گے رشتے سارے۔ مجھ سے پوچھو کہ محبت کی اگن کیسی ہے۔ مجھے معصوم سی لڑکی پہ ترس آتا ہے۔ اُسے دیکھو، محبت میں مگن کیسی ہے۔ ۔

میری محبت نے مجھے زیادہ دن تک اس سے دور رہنے نہیں دیا۔ جس قدر غصہ کھا کر اور جتنی ذلت اٹھانے کے بعد میں اس روز وہاں سے نکلی تھی، ان سب کے ساتھ ساتھ مجھے بھی پورا یقین تھا کہ میں شاید اب دوبارہ کبھی بھی ادھر کا رخ نہیں کر پاؤں گی۔۔ مگر کیا کرتی اس دل کا کہ جس پر میرا اختیار شروع دن سے ہی نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ جو غلام محمد قاصر صاحب نے کہا ہے کہ۔ کروں گا کیا جو محبت میں ہو گیا ناکام۔ مجھے تو اور کوئی کام بھی نہیں آتا۔ تو اسی محبت نے بہت جلد مجھے پسپا کر کے رکھ دیا۔ غصہ تو شام تک ہی کہیں مُنہ چھپا کر جا سویا تھا اور رہا ذلت کا احساس، تو اس کی کسک کو محبت کی کسک نے پچھاڑ ڈالا۔ اور پھر جیسے ہی روبی بھابی، یمنی اور چھوٹی آپا کے ہمراہ مجھ سے ملنے، اور در پردہ مجھے منانے آئیں تو میں سب کچھ بھول بھال، ان سے ایسے ملی جیسے ڈار سے بچھڑی کونج۔ اور پھر جب آپا کی زبانی مجھے ارفع کی چوٹ اور اس ستم گر کے جھلس جانے کا پتا چلا تو اس قدر بے چین ہوئی کہ اسی وقت ان کے ساتھ ارفع کو دیکھنے کے بہانے اور اصل

میں اس دشمنِ جان کا دیدار کرنے انکے گھر جا پہنچی۔ مگر وہ ظالم تو ویسے کا ویسے ہی تھا۔ ایکبار پھر بچپن کی طرح میدان چھوڑ کا بھاگ گیا۔ مگر وہ بچپن کا دور تھا۔ تب تو میں کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی، مگر اب، اب میں اس بھگوڑے کو کیسے بھاگنے دیتی بھلا، نکیل تو اسے ڈالنی ہی پڑنی تھی۔ اور پھر میں نے ایسے ہی کیا۔ وہ جو انگریزی کا مشہور معقولہ ہے every thing is fair in love and war۔(محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔) تو میں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور اس محبت کی جنگ کو جیتنے کے لیئے اس وادیِ پر خار میں کود پڑی۔ ساری کشتیاں جلا کر، do and dieوالی کیفیت اپنے اوپر طاری کیئے میں نے سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ مجھے اب ہر حالت میں ارسل اور اس کی محبت کو جیتنا ہی تھا۔ اور اس کے لیئے مجھے سب سے پہلے اس کی اماں اور ابا کو اپنی مٹھی میں کرنا تھا، کیونکہ میں اچھی طرح جان چکی تھی کہ ارسل اگر دنیا میں کسی کے سامنے کھڑا ہونے سے گھبراتا تھا تو وہ اس کے ابا تھے، اور اگر دنیا میں کوئی ایسی ہستی تھی، جسکی بات وہ کبھی بھی نہیں ٹال سکتا تھا تو وہ اس کی اماں تھیں۔

اور سچ کہوں تو اس کی اماں اتنی سویٹ، اتنی محبت کرنے والی تھیں کہ ان کا دل جیتنا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اور رہے ابا، تو وہ بھی ایسے ہی تھے، بہت پیار کرنے والے، بہت پیارے انسان۔ سو میں اس مشن پر چل نکلی، اور بہت جلد میں اس میں کامیاب بھی ہو گئی۔ اماں اور ابا تو پہلے سے ہی میرے ہمنوا تھے، پھر جب سے ارسل نے اپنی تیئں میری بے عزتی کر کے مجھے اپنے گھر سے نکالا تھا، تب سے تو میں ان سب کی نظر میں پہلے سے بھی زیادہ اچھی بن چکی تھی۔ وہ سب مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ میں نے بھی ان سب کی محبت کا خوب خوب فایدہ اٹھایا اور اپنی چکنی چپڑی باتوں میں الجھا کر ان سب کو اچھی طرح سے اپنے دام میں پھنسا لیا تھا۔ سوائے بڑی بھابھی، بڑی آپا اور خود اس ارسل موسل کے۔۔ مگر کب تک، آخر کب تک وہ مجھ سے بچ سکتا تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ اس کے گرد اپنا دائرہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔ نا محسوس انداز سے اس کے کئی ایسے کام اس طرح اپنے ذمے لے لیئے کہ کسی کو شک بھی نہیں ہوا اور اعتراض بھی نہیں۔ میں روبی بھابھی اور ارفع کی مدد کروانے کے

بہانے ارسل کے دھلے کپڑے استری کر دیتی۔ کبھی اسکے کمرے کی صفائی اپنی نگرانی میں کرواتی تو کبھی اسکی پسند کی ڈشز بنا بنا کر اس سمیت سب کو حیران کر دیتی۔ میں اپنے ہر ہنر کو آزما رہی تھی۔ وہ سب معصوم لوگ اپنے بیٹے کی غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لیئے مسلسل میرا دل رکھ رہے تھے، اور ان کا معصوم بیٹا ان کی خوشی کی خاطر نہ صرف میرے ساتھ اچھا سلوک کرنے پر مجبور ہو جاتا بلکہ، سب کے سامنے میرے الٹے سیدھے بنائے کھانوں کی دل کھول کر تعریف بھی کر دیتا۔ میں اچھی طرح سمجھ رہی تھی کہ وہ مجھ سے جان چھڑوانے کی کوششوں میں مصروف تھا، مگر یہ صنم کا شکنجہ تھا" صنم رشید میمن کا" اور وہ پنجابی منڈا بھلا کیسے نکل سکتا تھا میرے کسے شکنجے سے۔ لہذا آہستہ آہستہ میں نے اسے قابو کر ہی لیا۔ ۔

۔۔۔۔۔ ہم نے تمہارے نام کی تتلی دبوچ لی۔ سب رنگ کائینات کے مٹھی میں آگیئے۔" ارسل۔!! اور کتنا انتظار کرواؤ گے۔ آخر کب لاؤ گے تم اپنے گھر والوں کو ہمارے گھر ہمارے رشتے کی بات کرنے کے لیئے۔؟ اب تو ہمارے اس سو کالڈ بندھن کو بندھے بھی ایک عرصہ بیت چکا ہے۔ اور دیکھو، میں تمہیں پھر بتا رہی ہوں، ابو اور بڑے بھیا پر آج کل پھر میری شادی کا جنون سوار ہو چلا ہے۔ ادھر چچا کریم بھی اپنے بیٹے تابش کے لیئے بہت اصرار کر رہے ہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں خاندان والوں کے پرزور اصرار پر ابو ان کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور نہ ہو جائیں۔ انہیں کہیں کوئی مشکل فیصلہ نہ کرنا پڑ جائے، اسی لیئے تم سے کہہ رہی ہوں۔ ابھی بھی وقت ہے، سوچ لو اچھی طرح سے۔ پھر نہ کہنا کہ صنم بے وفا نکلی۔!!" کلفٹن کے نسبتاً سنسان اور نیم تاریک گوشے میں میرے سامنے بیٹھی وہ ایک ادا سے کہہ رہی تھی۔ میں اس کے عشوہ غمزہ میں بری طرح الجھا ہوا اسے بس تکے ہی جا رہا تھا۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ جھنجھلا سی گئی۔ ۔" بولو ناں ارسل۔!! کیا جواب دوں میں امی جان اور باجی کو۔ وہ روز میری جان کھاتی ہیں کہ دل دیا بھی تو گھونچو بزدل کو۔ عشق کیا بھی تو کس مٹی کے مادھو سے کہ جسے اپنے حق کے لیئے آواز اٹھانا بھی نہیں آتا۔ اب میں کیا کہوں ان سے۔؟ تم ہی بتاؤ ناں۔!!

"۔" بس تھوڑا سا انتظار اور صنم۔! مجھے چند دن اور دے دو پلیز۔ دیکھو، بھائی تو سارے ہی میرے ساتھ ہیں، رہ گئیں بھابھیاں، تو جب بھائیوں کو کوئی اعتراض نہیں ہمارے رشتے پر تو بھابھیاں بھلا کتنی دیر اور مُنہ پھلائیں گی۔۔ اصل مسلۂ تو آپاؤں کا ہے۔ جانے کیوں وہ مان کر ہی نہیں دے رہیں۔ ایسے ایسے اعتراض اور ایسے ایسے جواز ڈھونڈ کر لاتی ہیں کہ میں تو میں، بے چارے بھائی بھی لاجواب ہو کر رہ جاتے ہیں۔ کاش کہ اماں اور ابا یوں میری نیا بیچ منجدھار ڈولتی چھوڑ، اتنی جلدی راہی ملک عدم نہ ہو جاتے تو، سچ کہتا ہوں اب تک ہمارے سہرے کے پھول کھل چکے ہونے تھے۔ مگر افسوس، شائد ان کی قسمت میں اپنے چھوٹے کی خوشی دیکھنی لکھی ہی نہیں تھی۔ تم بس مجھے تھوڑا سا وقت اور دے دو۔ میں کسی نہ کسی طرح آپا اور بھابھی کو منانے کی کوشش کرتا ہوں۔ بس، تب تک تم اپنے گھر والوں کو ٹالو۔" میں نے اپنا وہی پرانا راگ الاپنے کی کوشش کی تو وہ ایکبار پھر بری طرح سے چڑ گئی۔۔ "دیکھو ارسل۔!! تمہارے ان پرانے گھسے پٹے بہانوں سے کام چلنے والا نہیں۔ اب تو تمہیں کوئی ٹھوس قدم اٹھانا ہی پڑے گا۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ ابو اور بھیا اب مزید انتظار کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔ پہلے ہی تمہاری بھابھیوں اور باجیوں کی لگائی آگ بجھنے میں نہیں آ رہی، اور اس پر وہ اُلّو کا پٹھا تابش ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا ہے۔ اور تم۔ تم ہو کہ تمہیں کوئی فرق ہی نہیں پڑتا۔ مہینے میں دو چار بار بہانے سے ڈیٹ مار کر ہی بڑے طرم خان بنے پھرتے ہو۔ لے گیا ناں جس دن وہ میری ڈولی، کرتے رہنا پھر کرسیاں سیدھی 60 کے ہیرو کی طرح اور آہیں بھرتے، آنسو پونچھتے ہوئے باراتیوں کو کولڈ ڈرنک سرو کرتے پھرنا۔!!" اس نے آگ لگانے والے انداز میں کہا تو میں واقعی سر تا پاء سلگ کر رہ گیا۔ یہ میری اور اس کی کوئی پہلی ملاقات (ڈیٹ) تو نہیں تھی۔ ہم نے تو کراچی کا کوئی گوشہ نہ چھوڑا تھا جہاں اپنی محبت کی نشانیاں اور ثبوت نہ ثبت کیئے تھے۔۔ وہ بھی اسی طرز کی ایک ملاقات تھی۔ مگر اس روز شائد ہمارے ستارے گردش میں تھے، اسی لیئے ہماری اس "خفیہ ترین ڈیٹ" پر یمنی، ارفع، اعظم اور معظم کا چھاپا پڑ گیا۔ اب یہ آپا لوگوں کی C.I.D تھی، یا اسکے پیچھے

بھی کسی " نادیدہ قوت " کا " خفیہ ہاتھ " ملوث تھا، کچھ کہا نہیں جا سکتا، مگر اس کامیاب ترین چھاپے نے ہمارے رومانس کے غبارے سے ہوا ضرور نکال دی تھی۔ اعظم نے اسی وقت فون کر کے بڑی آپا اور بڑی بھابھی کے ساتھ ساتھ محن بھائی اور انس بھائی کو بھی موقع واردات پر بلا لیا۔ اور وہ بھی ایسے " ویلے اور گرم جوش" کہ دیکھتے ہی دیکھتے "جائے واردات" پر آن پہنچے۔ بس جی، پھر کیا تھا۔ وہ تمام "خدائی فوجدار" ہمیں اپنے گھیرے میں لیئے جیسے تیسے گھر پہنچے، اور پھر وہاں جو عدالت لگائی گئی، جس طرح فرد جرم ہمارے نام لگی اور جس طرح ہم دونوں کو " قابلِ گردن زنی" قرار دیتے ہوئے سخت ترین سزا، "تاحیات جدائی" سنادی گئی، اس نے کم از کم مجھ پر وہی مصرعہ" بدلتا ہے رنگ آسمان کیسے کیسے۔" اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ میں ان سب کو رنگ بدلتے دیکھ کر دنگ ہی رہ گیا تھا۔ کہاں تو صنم ان سب کی "لاڈلی، چہیتی، معصوم اور بہت اچھی بچی" تھی۔ اور کہاں دیکھتے ہی دیکھتے وہ ایکدم" چالاک، گھنی، میسنی، جادوگرنی" اور جانے کیا کیا ہو گئی۔ اماں بیچاری تو دبے الفاظ میں ہماری ہی طرفداری کر رہی تھیں، مگر اس نقار خانے میں ان کی سن کون رہا تھا۔ اماں کو صرف ہماری خوشی عزیز تھی۔ میں اگر ان کا چھوٹا تھا تو، صنم بھی ان کی لاڈلی تھی جسے انہوں نے گودوں کھلایا تھا۔ لیکن اب اس کا کیا کیا جا سکتا تھا کہ باقی سب گھر والے ہمارے خلاف محاذ ہی کھول کر بیٹھ گیئے تھے۔ لیکن وہ شائد جانتے نہیں تھے کہ ان کے سامنے بھی ہم تھے۔۔ اب ہمارے لیئے مشکلوں کے پہاڑ کھڑے ہو چکے تھے۔ ہم پر نظر رکھی جانے لگی تھی۔ اب ہم پہلے کی طرح کھل کر نہیں مل سکتے تھے۔ باہر کہیں ملنا تو دور کی بات، اب تو ہمارا گھر میں ملنا بھی ناممکن ہو چکا تھا۔ کیونکہ صنم کا ہماری طرف اور میرا انکی طرف داخلہ مکمل طور پر بند تھا۔ اس کے علاوہ بھی ہمیں بہت سے پابندیوں کا سامنا تھا، اور شائد اس کی ہی وجہ تھی کہ میں ذہنی طور پر باغی ہوتا جا رہا تھا۔ چھوٹی آپا اور بڑی بھابھی کے طعنے میرے دماغ کی چولیں ہلا گیئے تھے، اور پھر اسی ذہنی کیفیت میں مبتلا ہو کر میں نے وہ کر ڈالا، جو شائد میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ صنم کی سالگرہ نزدیک آ رہی تھی اور انہیں

دنوں میرا ایک پراجیکٹ بہت کامیاب ہوا تھا۔ میری جیب میں اچھی خاصی رقم بھی تھی اور دل میں موجزن ڈھیروں جذبات بھی۔ اسی لیئے میں صنم کو اس کی پسند کا گفٹ دلوانے کے لیئے طارق روڈ لے گیا۔ کیسے؟ یہ ایک الگ داستان ہے۔ بہر حال، ہم نے پہلے خوب ونڈو شاپنگ کی، پھر میں نے اس کی پسند سے ہی اس کے لیئے گولڈ کی خوبصورت اور نفیس سی رنگ خریدی۔ میں تو اسے وہیں دے رہا تھا، مگر وہ پگلی بضد ہوگئی کہ سالگرہ والے دن ہی لے گی (شاید اس کے ذہن میں ہوگا کہ اس دن ہم پھر ڈیٹ ماریں گے۔) خیر، ہم شاپنگ سے فارغ ہوئے تو وہیں قریب بنے ایک فوڈ کورٹ میں چلے گیئے۔ ہم دنیا مافیہا سے بیگانہ ہوئے ایک دوسرے میں گم سرگوشیوں میں باتیں کر رہے کہ ایک بار پھر C.I.D کی زد میں آ گیئے۔ جی ہاں، سی آئی ڈی۔ اور اس بار روبی بھابھی اور چھوٹی آپا نے ہمیں رنگے ہاتھوں "رنگ رلیاں مناتے" دھر لیا تھا۔ ان دو خطرناک قسم کی خواتین کو کڑے تیور لیئے اپنے سر پر کھڑے دیکھ کر ہمارے اوسان ہی خطا ہو گیئے تھے، اور ابھی ہم اس جھٹکے سے سنبھل ہی نہیں پائے تھے کہ صنم کی بھابھی اور باجی بھی ہاتھوں میں ڈھیروں شاپنگ بیگز تھامے فوڈ کورٹ میں داخل ہوتی دکھائی دیں۔ اب تو ہمارا وہ حال تھا کہ بس پوچھیں ہی مت۔۔ "اماں۔!! سمجھائیں اسے۔ اور کتنی ذلت کروائے گا یہ ہماری۔ ارے، اس کی ان حرکتوں کا کیا اثر پڑے گا ہمارے بچوں پر، کبھی سوچا ہے اس نے۔؟ ابا ٹھیک ہی کہتے تھے، یہ شوبز کی دنیا ہے ہی ایسی۔ سب کے سب مادر پدر آزاد ہیں کمبخت۔ کوئی شرم کوئی حیا باقی نہیں رہی اس میں۔ اس کے تو دیدوں کا پانی ہی مر گیا ہے۔ غضب خدا کا، سارے زمانے میں اسے وہ بھتنی ہی ملی تھے عشق لڑانے کو۔ ارے اماں، میں کہہ رہی ہوں، سنبھال لیں اسے۔ ابھی بھی وقت ہے، ورنہ خاندان میں ہماری رہی سہی عزت کا بھی جنازہ نکال دے گا یہ چھوٹا کھوٹا آپکا۔!!" آپا کا غصہ لحہ بہ لحہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ گھر آتے کے ساتھ ہی پہلے تو انہوں نے خوب جی بھر کے میری "خاطر تواضع" کی تھی، پھر ان کی توپوں کا رخ صنم کی طرف ہو گیا۔ غائبانہ طور پر اسے کوس کر بھی جب ان کا دل نہ بھرا تو خم ٹھونک کر ان کے گھر لڑنے جا پہنچیں۔

اب ادھر بھی سب دانت تیز کیئے تیار بیٹھے تھے، سو خوب گھمسان کا رن پڑا۔ آپا اور بھابھی کے زبانی حملوں کے جواب میں صنم کی امی اور بھابھی نے بھی جم کر جوابی کاروائی کی۔ بات بڑھتے بڑھتے اتنی بڑھ گئی کہ ان کے لڑنے کی آوازیں گلی میں سنائی دینے لگیں۔ اب معاملہ ہاتھوں سے نکلتا جا رہا تھا، اس لیئے انس بھائی بیچ بچاؤ کرنے وہاں جا پہنچے۔ میں بھی دیوانوں کی طرح اڑتا ہوا انکے پیچھے لپکا تھا، مگر وہاں کی صورتِ حال دیکھ کر ایک دم ہی میرا دماغ گھوم گیا۔۔ ” آپا، بھیا!! کان کھول کر سن لیں آپ سب۔ میں شادی کروں گا تو صرف صنم کے ساتھ۔ وہ جیسی بھی ہے، میری محبت ہے۔ مجھے نہ اس کی ذات سے کوئی مطلب ہے اور نہ ہی اپنی برادری سے۔ دنیا کی کوئی طاقت مجھے میری محبت سے جدا نہیں کر سکتی۔ سنا آپ نے۔ اس لیئے مہربانی کر کے بند کریں یہ تماشہ، اور جائیں یہاں سے۔ اب میں صنم اور اس کے گھر والوں کی مزید بے عزتی برداشت نہیں کروں گا کیونکہ یہ گھر اب میرا سسرال ہے۔ اور مجھے ان کی عزت کا بھی اتنا ہی خیال ہے جتنا کہ آپکی عزت کا۔“ میں جوش اور غصے کو عالم میں ایک کونے میں کھڑی بری طرح سے روتی ہوئی صنم کا ہاتھ پکڑا اور اسے وہی رنگ پہناتے ہوئے بھری محفل میں اپنا پابند کر لیا۔ میرے اس عمل سے وہاں ایک دم جیسے سناٹا سا چھا گیا۔ دونوں آپاؤں کے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ وہ وہیں نڈھال ہو کر صوفے پر ڈھے ہی گئیں۔ صنم کی امی اور بھابھی کا حال بھی کچھ مختلف نہیں تھا۔ میں نے بری طرح سے روتی اور کانپتی ہوئی صنم کا ہاتھ دبا کر جیسے اسے حوصلہ دیا تھا۔ انس بھائی اس دوران خاموشی سے میرے برابر آ کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی صنم کے سر پر ہاتھ رکھ کر جیسے میرے فیصلے کی تائد کی تھی۔ میرے اس جذباتی فیصلے کا باقی لوگوں پر جو اثر ہوا، سو ہوا مگر اماں بالکل خاموش ہو چکی تھیں۔۔ ” نہیں چھوٹے۔!! میں تجھ سے ناراض نہیں ہوں بیٹا۔ مجھے تو صنم بچی بھی اسی طرح پیاری ہے جس طرح سے تم ہو، مگر کیا کروں۔؟ تمہاری بہنیں اور بھائی، انہیں منانا کوئی آسان کام نہیں ہے میرے لیئے۔ اور اب تو تمہاری بہنوں نے تمہارے ابا کو بھی اپنی طرف کر لیا ہے۔ مجھے تم دونوں کی بڑی فکر ہے بیٹا۔ اور اب تو میری

طبیعت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ جانے میں تم دونوں کی خوشی دیکھ پاؤں گی بھی نہیں۔" میں نے اپنے گلٹ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اماں سے لپٹ کر معافی مانگنی چاہی، تو وہ میرا ماتھا چوم کر الٹا مجھے ہی دلاسے دینے لگیں۔ شوگر اور بلڈ پریشر کے امراض نے انہیں بری طرح سے جکڑ رکھا تھا۔ وہ اندر ہی اندر گھلتی جا رہی تھیں، مگر ظاہر نہیں ہونے دیتی تھیں۔ اور اس پر ان کو لاحق ہونے والی یہ نئی فکریں۔ وہ ایک رات اچانک بلڈ پریشر بڑھ جانے کی وجہ سے بیہوش ہو گئیں۔ انہیں اسی عالم میں فوری ہاسپٹل پہنچایا گیا، مگر وہ جانبر نہ ہو سکیں۔ اماں کی اس اچانک وفات نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ میں تو یکدم جیسے ٹوٹ کر ہی رہ گیا، اور ابھی ہم اس صدمے سے ابھر بھی نہیں پائے تھے کہ ابا بھی ان کے پیچھے پیچھے راہی ملک عدم ہوئے۔ یہ دہرا صدمہ ہمارے لیئے ناقابل برداشت تھا۔ ساری زندگی اماں نے ابا کے پیچھے پیچھے چلتے گذاری تھی، اور اب ابا کو اس طرح اماں کے نقش پاء پے چلتے دیکھ کر ہم سراسیمہ ہو گیئے تھے۔ یہ دو صدمات ہماری پوری زندگیوں کو الٹ پلٹ کر رکھ گیئے۔ اماں نے سچ ہی کہا

تھا۔ ان کی آنکھ بند ہونے کی دیر تھی کہ میری طرف کھلنے والی خوشیوں کے سارے در ایک ایک کر کے بند ہوتے چلے گیئے۔ گھر والوں نے واضح طور پر ان دونوں کی موت کا ذمہ دار مجھے قرار دے دیا تھا۔ ان سب کا دباؤ مجھ پر بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ میں صنم کے ساتھ کی جانے والی منگنی توڑ دوں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ "پھونکوں سے یہ چراغ، بجھایا نہ جائے گا" ۔ سو، میں اپنے فیصلے پر پوری طرح ڈٹا ہوا تھا۔ اور میری یہ ضد ابھی تک قائم تھی۔ مگر اب یہ صنم، مجھے نئی کہانی سنا رہی تھی۔ میں سچ مچ الجھ کر رہ گیا تھا۔۔

آسان نہیں ٹوٹے ہوئے دل کا جوڑنا۔ پچھتاؤ گے خوابوں کی بستی اجاڑ کر۔ میرے دن رات اب اس کی یادوں کے سہارے گذرنے لگے۔ میں نے کبھی خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا کہ مجھے اس کے بغیر رہنا پڑے گا۔ میں نے تو اپنے سارے پتے بڑی احتیاط، بڑی مہارت کے ساتھ کھیلے تھے۔ میں تو اسے اپنے سحر میں پوری طرح جکڑ چکی تھی۔ لاکھ مخالفتوں، لاکھ دشواریوں اور لاکھ سب کی "نہیں، نہیں" کی

گردان کے باوجود مجھے پورا یقین تھا کہ ارسل میرا ہو کر ہی رہے گا۔اور پھر میرے اس یقین کو مستحکم کرنے کے لیئے وہ اپنی اکلوتی خالہ کو بھی گواہ بنالا یا تھا۔ اس کی ایک ہی خالہ تھیں اور وہ لاہور میں رہتی تھیں۔ خالہ کے بیٹے کی شادی میں شرکت کے لیئے وہ بھی لاہور گیا تو وہاں اس نے خالہ سے میرا بھی ذکر کر دیا۔ خالہ اسے بہت چاہتی تھیں انہیں اس سارے معاملے کی کچھ سن گن تو پہلے سے ہی تھی، اس پر جب آپاؤں نے اپنے انداز سے انہیں تفصیلات بتائیں تو وہ بھی پریشان ہو گئیں۔اب جو ارسل لاہور گیا تو انہوں نے اس سے بھی پوچھا۔اس نے بھی انہیں سب کچھ بتا دیا، اپنی فیلنگز بھی اور ہمارے راستے میں آنے والی رکاوٹوں کے بارے میں بھی۔خالہ دل کی بہت اچھی تھیں۔ بالکل اماں کی طرح۔ وہ اگلے ماہ ہی کراچی آ گئیں۔ ارسل نے ان کی آمد کے بارے میں ہمیں پہلے سے بتا رکھا تھا، اس لیئے میرے ساتھ ساتھ میرے گھر والے بھی ان کی راہ میں دیدہِ دل فرشِ راہ کیئے ہوئے تھے۔امی نے ان کے اعزاز میں پر تکلف ڈنر کا اہتمام کیا تھا۔بلایا تو انہوں نے سب گھر والوں کو تھا، مگر خالہ کے ساتھ انس بھائی، مونس بھائی اور ان کی بیگمات ہی آئی تھیں۔ہاں ارسل بھی ان کے ساتھ ہی تھا۔۔خالہ سے مل کر ہم سب بہت خوش ہوئے۔ وہ بھی خوش تھیں۔وہ میرے لیئے بہت سے تحائف لائی تھیں۔ مٹھائیاں ، ہار پھول اس کے علاوہ تھے۔ میں بہت خوش تھی۔ مجھے اپنی منزل بہت قریب دکھائی دینے لگی تھی۔میں جیسے ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ آخر اتنی دیر کے بعد ہمارے رشتے کو معتبر سمجھ ہی لیا گیا تھا۔ مجھے اس گھر کی ہونے والی چھوٹی بہو کا خطاب مل ہی گیا تھا۔خالہ ایک ڈیڑھ ماہ کراچی رہیں تھیں اور اس عرصے کے دوران انہوں نے کئی چکر ہماری طرف لگائے تھے۔سب ٹھیک چل رہا تھا۔ہم دونوں بہت خوش تھے۔ ہم نے جاگتی آنکھوں سے اپنے حسین مستقبل کے کئی خوب دیکھ ڈالے تھے، یہ سوچے بغیر کہ خواب تو خواب ہی ہوتے ہیں۔ اور ضروری بھی نہیں کہ ہر خواب کی قسمت میں کوئی تعبیر بھی لکھ دی جائے۔۔ وہ ایک خوبصورت شام تھی۔ میں اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑی ارسل کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ میرا روز کا معمول تھا۔ میں صبح

شام اسے آفس جاتے اور پھر واپس آتے دیکھا کرتی تھی۔ وہ بھی اپنی گاڑی کے پاس رک کر مجھے دیکھتا، مسکرا کر ہاتھ ہلاتا تھا۔ میرے لیئے یہ ہی بہت تھا۔ اس روز بھی میں اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔ وہ آفس سے واپس آیا، گھر کے سامنے گاڑی کھڑی کی اور روز کی طرح میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر ہاتھ ہلاتا گھر کے اندر چلا گیا۔ میں وہیں کھڑی اس کی گاڑی کو دیکھ رہی تھی کہ مجھے عجیب سا احساس ہوا۔ میں بے اختیار آگے کو جھک کر گلی میں دیکھنے لگی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ارسل کے گھر سے سب لوگ افتاں وخیزاں باہر نکلتے دکھائی دیئے۔ اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سب گاڑیوں میں بیٹھ، افراتفری کے عالم میں کہیں چلے گیئے۔ میں اس منظر کو دیکھ کر بری طرح گھبرا گئی اور ساری احتیاط بھول بھال سرپٹ اس کے گھر کی طرف دوڑی۔ گھر میں صرف فاریہ بھابھی ہی تھیں یا پھر بچے۔ بھابھی کی بھی ہوائیاں اڑی ہوئی تھی۔ میں اور زیادہ گھبرا گئی۔۔" دعا کرو صنم۔ چھوٹی آپا کے لیئے دعا کرو۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور وہ بھی سوئیر قسم کا۔!!"۔ میرے استفسار پر بھابھی نے جو روح فرسا خبر مجھے سنائی، وہ مجھ پر بجلی بن کر گری تھی۔"آپا کا ہارٹ اٹیک۔؟" مطلب، ہمارے ملن کے بیچ ایک اور رکاوٹ۔ ایک بار پھر انتظار، اور وہ بھی جانے کتنا لمبا۔ میرے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ میں بمشکل خود کو گھسیٹتی ہوئی واپس اپنے گھر تک آپائی تھی۔ میری حالت نے امی اور بھابھی کو بھی ہراساں کر دیا تھا۔ جانے کیوں، اس خبر نے مجھے بری طرح دہلا دیا تھا۔ میری چھٹی حس کچھ غلط، بہت ہی غلط ہو جانے کا عندیہ دے رہی تھی۔ میں جلے پیر کی بلی کی طرح اندر باہر چکراتی پھر رہی تھی، اور وہ ارسل۔ وہ تو میرا فون بھی نہیں اٹھا رہا تھا۔ نہ ہی کسی میسج کا جواب دے رہا تھا۔ آپا کے اٹیک کی خبر سنتے ہیں امی، ابو، بھائی بھابھی سب ان کے پیچھے ہاسپٹل بھاگے تھے۔ جو بھی تھا، اتنے عرصے ہمسائیگی رہی تھی، دکھ تو انہیں بھی بہت ہوا تھا۔ گو کہ بھابھی نے وہاں جاتے ہی مجھے سارے حالات بتا دئے تھے، اور یہ بھی کہ آپا کی حالت اب پہلے سے بہتر تھی۔ مگر میرا وجدان مجھے کچھ اور ہی کہانیاں سنا رہا تھا۔ میری جب تک اس سے بات نہ ہو جاتی، مجھے چین آنے والا نہیں تھا۔ یہ بات وہ خود

بھی اچھی طرح سے جانتا تھا مگر جانے کیوں وہ مجھ سے چھپ رہا تھا، بچ رہا تھا، اور اس کی یہ حرکت میرا ماتھا ٹھنکا رہی تھی۔۔ " صنم۔!! میں تم سے معذرت چاہتا ہوں۔ ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ میں اس سے زیادہ، مزید اس رشتے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ میری طرف سے تم آزاد ہو۔ جہاں چاہو، جس سے چاہے شادی کر لو۔ مگر میں اب اس سے زیادہ اپنے پیاروں کو تکلیف نہیں دے سکتا۔ اب اس سے زیادہ مجھ میں ہمت نہیں ان کا دکھ دیکھنے کی۔ اور آپ سب سے بھی گذارش ہے کہ ہو سکے تو مجھے معاف کر دیجئے گا۔ میری طرف سے یہ منگنی ختم سمجھیں۔!!" اور آخر کار میرے تمام ترین خدشات اپنے بدترین روپ میں سچ ثابت ہو گیئے۔ آپا کے اسپتال سے گھر آنے کے بعد بھی اس سے میرا کوئی رابطہ نہیں ہو پایا تھا۔ میں تو امی اور بھابھی کے ساتھ آپا کی عیادت کے لیئے بھی گئی تھی کہ شائد وہ دشمنِ جان وہاں دکھائی دے جائے، مگر میری آنکھیں اسے ڈھونڈتی ہی رہ گئیں اور وہ ستم گر جانے کہاں جا چھپا۔ اب تو میرے ساتھ ساتھ امی اور باجی کو بھی عجیب و غریب وہم ستانے لگے تھے مگر

ہم صرف انتظار ہی کر سکتے تھے۔ اور پھر دو ماہ بعد ہمارا یہ انتظار بھی تمام ہوا۔ وہ عجیب اجڑی بکھری حالت میں اچانک آیا، اور ہمارے سروں پر بم پھوڑ، میری انگلی سے "سو کالڈ منگنی" کی انگوٹھی اتار جیسے آیا تھا، ویسے ہی واپس بھی چلا گیا۔ میں اس صدمے کو سہار ہی نہ پائی، اور جیسے ہی اس کے نام کی انگوٹھی میری انگلی سے نکلی، میں کھڑے قد سے گری اور ہوش و خرد سے بیگانہ ہو گئی۔۔ ارسل کا یوں سب کے سامنے مجھے ٹھکرانا، میرے بھائیوں کو جوتے کی طرح لگا تھا۔ ان کی برداشت کی حد بھی جیسے ختم ہو گئی تھی۔ وہ فوراً محسن بھائی جان کے پاس شکائت لے گیئے۔ مگر وہاں سے بھی انہیں ناکامی کے سوا کچھ نہ ملا کہ اماں، ابا کے انتقال کے بعد سے ہی محسن بھائی اور بھابھی الگ ہو چکے تھے۔ ان کا اب اس گھر میں عمل دخل نہ ہونے کے برابر ہی رہ گیا تھا کیونکہ اب گھر کی اصل بڑی تو چھوٹی آپا بن چکی تھیں۔ ان کے شوہر ایک عرصہ سے بیرونِ ملک سیٹلڈ تھے اور آپا کا مستقل ٹھکانہ اب یہیں تھا۔ محسن بھائی کی طرف سے ناکام ہونے کے بعد بھیا نے انس بھائی سے رابطہ کیا۔ بلکہ انس بھائی خود ہی

چل کر ہمارے گھر آ گیئے۔ انہوں نے ابو سمیت سب سے ارسل کی حماقتوں کی معافی مانگی اور سر جھکا کر شرمندہ سے واپس چلے گیئے، کیونکہ آپا اب بھی نہیں مان رہی تھیں۔ اور یہ تو طے تھا کہ جب تک آپا نہیں مانیںتی ہماری نیا پار لگنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اب اس کے بعد باقی کیا رہ گیا تھا۔ سو اب گھر والوں کا زور مجھ پر چلنے لگا۔ بھیا نے اپنی ہزیمت کا بدلہ مجھ سے لیا۔ مجھے خوب مارا پیٹا گیا، اور شائد بھائی مجھے مار ہی ڈالتے جو بھابھی اور باجی ان کے پاؤں نہ پڑ جاتیں تو۔ امی کا زور صرف رونے پر ہی چل سکتا تھا، وہ رو رو کر بے حال ہوئی جا رہی تھیں۔ اور ابو، تو مجھ سے اس قدر ناراض تھے کہ میری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ۔" جب تک اس کو بیاہ کر اس گھر سے دفع نہیں کر دیتے، اسے کہہ دو، اپنی منحوس صورت لے کر میرے سامنے مت آیا کرے۔ میرا خون کھول جاتا ہے اس کی شکل دیکھ کر۔ ایسا نہ ہو کہ میں غیرت کے نام پر اس کا قتل کر بیٹھوں۔ اس لیئے اسے سمجھا دو اچھی طرح سے۔ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلا کرے یہ۔!!" ابو کی نفرت کا یہ عالم دیکھ کر میں اپنی ہی نظروں میں گر کر رہ گئی۔ بھائیوں کا بھی یہی حال تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مُنہ پھیر لیتے۔ میں اس صورتِ حال میں تل تل مرتی، قطرہ قطرہ گھلتی جا رہی تھی۔ ۔" امی جان!! آپ بالکل بھی پریشان مت ہوں۔ میں نے سب انتظامات کر لیئے ہیں۔ ابو اور کریم چچا کی بات بھی ہو گئی ہے اگلے جمعہ کو وہ لوگ آ جائیں گے۔ عصر کے بعد اس کا اور تابش کا نکاح ٹیلیفون پر ہی کروا دیا جائے گا۔ چچا کہہ رہے تھے کہ وہ نکاح کے پیپرز تابش کو بجھوا دیں گے تاکہ وہ جب رخصتی کے لیئے آئے تو اس کے پیپرز بھی بنوا کر لائے۔ پھر یہ بھی اس کے ساتھ ہی آسٹریلیا چلی جائے گی۔ امی، ہم بھی اس ارسل موسل کو بتا دیں گے کہ ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔ ہماری بہن کے لیئے ابھی بھی ایک سے بڑھ کر ایک رشتہ ہماری ہی برادری میں موجود ہے۔ یہ تو اس کی ضد نے ہمیں مجبور کر دیا تھا، ورنہ تھا ہی کیا اس کھڑوس میں۔ اونہہ، نہ شکل نہ عقل، کاٹھ کا اُلّو۔ بیوقوف، گدھا کہیں کا۔ مرد ہو کر بھی بہن بھائیوں سے ایسے ڈرتا ہے، جیسے ان کا زر خرید غلام ہو۔ ارے، یہ تو ہماری لڑکی کے ہی دماغ میں کوئی خناس سما

گیا تھا، جس کی وجہ سے ہم مجبور ہو گیئے۔ ورنہ ایسے ایسوں کو تو ہم اپنی سیڑھی بھی نہ چڑھنے دیں۔ !!

" بھیا امی کو سارا پروگرام تفصیل سے بتا رہے تھے۔ مگر میں جانتی تھی کہ وہ درپردہ مجھے ہی سنا رہے تھے۔ میرے دل میں ددرد کا ایک جہان آباد تھا۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ مجھے اپنے سے زیادہ اب اپنے گھر والوں کی ہو نے والی ذلت نے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں تو اس" ارسل موسل" کی دھتکار، پھٹکار کی بچپن سے ہی عادی تھی، مگر اس بار بات میرے اپنوں کی، میرے پیاروں کی تھی۔ اس نے جس طرح میرے گھر والوں کی بے عزتی کی تھی، جس طرح اپنے پیاروں کی تکلیف کا باعث میرے گھر والوں کو ٹھہرایا تھا میری برداشت سے باہر ہو رہا تھا۔ میری برسوں کی سوئی انا ایکدم بیدار ہوئی تھی، اور اب مجھے اپنی انا کے ساتھ ساتھ اپنے بھائیوں، اپنے باپ کی عزت کا علم بھی بلند کر کے دکھانا تھا۔ ۔ اور پھر وہ جمعہ بھی آ ہی گیا۔ میری بھابھیوں اور باجی نے بہت دن پہلے سے ڈھولک رکھ لی تھی۔ میں بھی ان کی خوشی کے لیئے ان کے ساتھ بیٹھ جاتی تھی۔ وہ گانے گاتیں تو میں تالیاں پیٹ پیٹ کر اپنی ہتھیلیاں سرخ کر لیتی۔ وہ ہنستیں تو میں ان سے زیادہ اونچے قہقھے لگاتی۔ میں نے اپنی آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا۔ میں تو تدبیریں کر کر کے ہار گئی تھی، اس لیئے اب میں نے خود کو تقدیر کے حوالے کر دیا تھا اور چپ چاپ ویسے ہی کرتی چلی گئی، جیسا مجھ سے کہا گیا۔ خاندان کے علاوہ محلے سے بھی کافی لوگ اس تقریب میں مدعو تھے اس لیئے اچھی خاصی رونق ہو گئی تھی۔ جیسے ہی میں نے نکاح نامے پر سائن کیئے، میرے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ میں امی کے گلے لگ کر کچھ اس طرح ٹوٹ کر روئی کہ وہاں موجود ہر فرد کی آنکھ نم ہو گئی۔ میرا دل میرے ہاتھوں سے نکل نکل جا رہا تھا، حالانکہ ابھی تو صرف نکاح ہوا تھا۔ مگر مجھے لگ رہا تھا جیسے میرے جسم سے جان ہی نکل گئی ہو، اور اب صرف خالی بت رہ گیا تھا۔ صنم نام کا "بت"۔ ۔

---------------------۔ درد سے ہم رہ رہ کر الجھتے ہیں۔ کس مصیبت میں کوئی ڈال گیا۔ درد اٹھا کچھ اس طرح صنم۔ دل کی سب حسرتیں نکال گیا۔ ۔ میری دیوانگی انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔ آپا کی اچانک

آنے والی بیماری نے مجھے اس قدر خوفزدہ اور حواس باختہ کر دیا کہ میں بالکل ڈھے کر رہ گیا۔ اب گھر میں کوئی مجھے کچھ نہیں کہتا تھا۔ شوبز میں میرا ایک نام، ایک مقام، ایک پہچان بن چکی تھی۔ گھر سے باہر میں چاہے کتنا ہی معزز، کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جاتا، گھر کے اندر میں آج بھی "چھوٹو" ہی تھا۔ وہی چھوٹو، جو آج بھی اپنے بڑے بھائی بہنوں کی محبت، ان کے مان کے لیئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ اور میں نے وہ ہی کیا۔ اپنوں کی خوشی، ان کے مان کے لیئے میں نے اپنی خوشی، اپنی زندگی کی قربانی دے دی۔ میں نے اپنے دل پر پاؤں رکھتے ہوئے، صنم کا دل ہمیشہ کے لیئے توڑ دیا۔ اپنی زندگی، اپنی خوشی سے مُنہ موڑتے ہوئے اپنوں کو دائمی خوشیاں دینے کی ٹھان لی، اور اسی سوچ کے زیر اثر میں نے صنم سے ہر ناطہ، ہر رشتہ توڑ لیا۔ میرے اس اقدام کے بعد ایک بار پھر طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اس بار یہ طوفان صنم کے بھائیوں نے اٹھایا تھا۔ وہ مرے خون کے پیاسے بنے مجھے ہر جگہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ میں اگر غلطی سے بھی ان کے ہاتھ لگ جاتا تو شائد وہ مجھے جان سے مار ڈالتے۔ اتنا ہی غصہ، اتنی ہی نفرت ان کے دلوں میں میرے لیئے بھر چکی تھی، مگر میری قسمت کہ میں آپا کی بیماری میں الجھا، ان کے ارد گرد ہی منڈلاتا رہ گیا۔ پھر انہوں نے اپنی رہی سہی عزت بچانے کے لیئے آناً فاناً صنم کا نکاح کر دیا۔ اسی تابش کے ساتھ، جسے وہ "اُلّو کا پٹھا" کہتی تھی۔ جیسے ہی مجھے اس کے نکاح کی خبر ملی، میرے اندر سناٹے پھیل گیئے۔ میں جیسے اندر سے بالکل خالی ہو گیا۔ ویران کھنڈر کی طرح۔ میرے دل کا سکون تو پہلے ہی رخصت ہو چکا تھا، اب تو لگتا تھا کہ حواس بھی ساتھ چھوڑتے جا رہے تھے۔ میں اس قدر مینٹلی ڈسٹرب رہنے لگا کہ میری توجہ اپنے کام پر نہ ہونے کے برابر رہ گئی جبکہ میرے پروفیشن میں تو حاضر دماغی اور ذہانت ہی سب کچھ تھی۔ ایسے میں میرا وہ ہی بنا، جو بن سکتا تھا۔ میرے ہاتھ سے کئی اہم پراجیکٹس نکل گیئے۔ پروڈیوسر میری طرح پاگل اور عشق کے ڈسے ہوئے تو نہیں تھے کہ اپنا پیسہ مجھ پر برباد کرتے۔ آہستہ آہستہ میری ذہنی حالت اتنی ابتر ہو گئی کہ مجھے کام ہی ملنا بند ہو گیا۔ لوگ میری پیٹھ پیچھے مجھے "ارسل پاگل"،" میاں مجنوں" اور جانے کیا کیا کہنے لگے۔

میرے کولیگز، ورکرز، حتیٰ کہ میرے دوست بھی ایک ایک کر کے میرا ساتھ چھوڑ گئیے۔ کوئی مجھ پر ترس کھاتا تو کسی کو میری حالت پر غصہ آتا۔۔ مگر میں پاگل نہیں تھا۔ میں تو اپنے ضمیر کا قیدی تھا۔ دن رات ضمیر کے کوڑے کھاتا، اسی سے نظریں چراتا زندگی کے ایام کاٹ رہاتھا۔ میری حالت اس سارے عرصے میں اتنی خراب ہو چکی تھی، کہ اب میرے اپنے، میرے پیارے میری حالت دیکھ دیکھ کر روتے تھے۔ بھائی نے تو مجھے خوب ڈانٹا بھی تھا کہ میں نے اپنے دل کی سنے بغیر کیوں اتنا بڑا فیصلہ کیا۔؟ کیوں اپنی زندگی کے ساتھ اتنا برا کھیل کھیل گیا۔؟ مگر میں انہیں کیا جواب دیتا، میری تو بچپن سے ہی عادت تھی، "کھیل ادھورا چھوڑ"، میدان سے بھاگ جانے کی۔ تو بھلا، اب کیسے میں اس محبت کے کھیل کو پورا کر سکتا تھا۔؟ بھاگنا تو مجھے تھا ہی، مگر میری اس بھاگ دوڑ نے چچا رشید کے گھر والوں کی صیح معنوں میں داڑیں لگوادیں تھیں۔ پہلے میری تلاش میں، پھر صنم کا رشتہ ڈھونڈنے کے چکر میں۔ اور اب، جیسے ہی مجھے اس کے نکاح کی خبر ملی، میری دیوانگی اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ میں نے خود کو اپنے کمرے میں بند کر لیا اور اس کے ساتھ ہی شائد اپنی خوشیوں کے در کو بھی۔۔ ہم اس لمبے چوڑے گھر میں شب کو تنہا ہوتے ہیں۔۔ دیکھ، کسی دن آمل ہم سے، ہم کو تم سے کام ہے چاند۔ میرے سیل پر آنے والا یہ برقی پیغام صنم کے نمبر سے آیا تھا۔ ایک عرصے کے بعد اس کے نمبر سے آنے والی اس پیغام نے مجھے چونکا دیا۔ اس کے نکاح کو بھی چھ ماہ ہو چکے تھے، اور میں ابھی تک اپنے حواسوں میں نہیں آیا تھا۔ اس دوران دونوں طرف بڑی بھید بھری خاموشی چھائی رہی تھی۔ نہ اس نے کوئی رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی، اور نہ ہی میں اپنے اندر اتنی ہمت پیدا کر پایا تھا۔ اس پر آپا اور بھابھیاں بڑی شدومد کے ساتھ میرے رشتے ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ ان کی یہ "رشتہ تلاش مہم" روز بروز زور پکڑتی جا رہی تھی، مگر میری طرف سے انہیں ہمیشہ انکار ہی سننے کو ملتا۔ ۔ " یہ اسی صنم چڑیل نے کوئی جادوٹونہ کروایا ہے ہمارے چھوٹے پر، جو اسے ابھی بھی اس کلو کے سوا کوئی اور دکھائی نہیں دیتی۔ آپا آپ بھی کسی عامل سے ملیں، ورنہ وہ تو شادی کروا کر اسٹریلیا بھاگ جائے گی،

اور ہمارا بچہ یہاں جوگی بنا بیٹھا رہ جائے گا۔!!" چھوٹی آپا اور بھابھی اب اکثر بڑی آپا کے کان کھاتی دکھائی دیتی تھیں۔ میں ان کی باتیں سنتا، اور بس سر جھٹک کر رہ جاتا۔ کیونکہ میں انہیں یہ نہیں سمجھا سکتا تھا کہ یہ کوئی "جادو ٹونہ" نہیں تھا۔ یہ عشق تھا۔ اور "عشق کبھی بھی آسان نہیں ہوتا۔ یہ آگ کا دریا تیر کر پار کرنا صرف عشق کے بس کا ہی کام ہوتا ہے"۔ اور آج ایک عرصے کے بعد ملنے والے اس کے میسج نے میری ساری سوئی ہوئی حسیات بیدار کر دیں تھیں۔ میں نے فوراً اس کے نمبر پر کال ملائی تھی۔۔ " صنم۔!! کیسی ہو تم۔؟ جواب کیوں نہیں دے رہیں۔؟ کچھ تو بولو صنم، بات کرو مجھ سے۔ پلیز صنم۔!!" اس نے جیسے ہی کال رسیو کی میں دیوانوں کی طرح بولتا چلا گیا۔ لیکن ادھر سے سوائے سسکیوں کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس یہ سسکیاں میرے دل پر تیر کی طرح لگ رہی تھیں۔ میں خود کو شدید اذیت میں محسوس کر رہا تھا۔ " صنم۔!! پلیز، اس طرح رو نہیں۔ بات کرو میرے ساتھ۔ مجھے گالیاں دو، کوسنے، بددعائیں دو۔ لڑو میرے ساتھ، مگر خدا کے لیئے، مجھے اس طرح چپ کی مار مت مارو۔ مجھے اپنے آنسوؤں کے سمندر غرق مت کرو صنم۔ پلیز یار، کچھ تو بولو۔ میرے کان ترس گیئے ہیں تمہاری آواز سننے کے لیئے، آنکھیں ترس گیئں ہیں تمہاری صورت دیکھنے کے لیئے۔ خدا کے لیئے، صنم اس قدر ظالم مت بنو۔ خدا کے لیئے"۔ میں اسے روتا سن کر خود بھی سسک اٹھا تھا۔ مگر اس نے کوئی بھی جواب دیئے بغیر ہی فون بند کر دیا۔ میں نے بیتابی سے پھر کال ملائی، لیکن اس نے فون ہی نہیں اٹھایا۔ میں نے ہمت نہیں ہاری اور اسے مسلسل کال کرتا چلا گیا حتیٰ کہ تنگ آ کر اس نے فون اٹھا ہی لیا۔۔ " کیوں تنگ کر رہے ہو تم مجھے۔؟ اب کیا رہ گیا ہے باقی۔؟ سب کچھ تو ختم ہو گیا۔ ختم کر دیا تم نے سب کچھ اپنی جذباتیت کے ہاتھوں۔ آگ لگا دی میرے ارمانوں میں۔ جھلسا کر رکھ دیئے میرے خواب سارے۔ بکھر گیئے ارمان میرے اور تمہیں پھر بھی چین نہیں۔؟ اب کیا چاہتے ہو تم مجھ سے۔؟ میں تو راکھ کا ڈھیر ہوں اب۔ اب بھلا کیا ملے گا تمہیں اس ڈھیر سے۔ جاؤ ارسل میاں جاؤ۔ اب اپنی زندگی کو خوشگوار بناؤ۔ جس سے چاہو، جیسے چاہو شادی کر لو۔

میری طرف سے تم آزاد ہو۔ بالکل آزاد۔ مجھے اب نہ تو تمہاری بات سننی ہے، اور نہ ہی تمہاری باتوں میں آنا ہے۔!!" اس نے بری طرح سے روتے ہوئے کہا تو میں تڑپ کر رہ گیا۔ ۔ " صنم۔!! میں مانتا ہوں کہ غلطی میری ہی ہے۔ مگر میں کیا کروں۔؟ تم تو جانتی ہو ناں کہ میں بچپن سے ہی ایسا ہی ہوں۔ تم ایک بار، صرف ایکبار مجھے معاف کر دو۔ میں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اب کبھی بھی تمہارا دل نہیں دکھاؤں گا۔ پکا وعدہ۔ بس، ایکبار مجھے موقع دو۔ رانی بنا کر رکھوں گا تمہیں۔ کبھی کوئی تکلیف نہیں ہونے دونگا۔ پلیز صنم۔!! " ۔ " تم پاگل ہو گیا۔؟ اب کیسے بناؤ گے رانی۔؟ سب ختم ہو چکا ہے۔ میرا نکاح ہو چکا ہے ارسل۔ "نکاح"۔ اب میں کسی اور کی منکوحہ ہوں، اور اگلے چند ماہ میں وہ آ کر لے جائے گا مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے۔ کہا تھا ناں۔ میں نے کہا تھا ناں کہ بہت پچھتاؤ گے، بہت روؤ گے تم اس دن، جس دن کوئی اور میری ڈولی لے جائے گا۔ تم بس ہاتھ ہی ملتے رہ جاؤ گے۔ اور اب۔ تم دیکھ لینا، وہ لے جائے گا مجھے ہمیشہ کے لیئے۔ اور تم ادھر ہی مجنوں بنے بیٹھے رہ جانا۔!!" وہ ایک دم میری بات کاٹ کر ہسٹیریکل انداز سے چلائی تھی اور اس کی باتوں سے ٹپکتی بے بسی، لاچاری اور غصے نے مجھے بھی بے بس کر کے رکھ دیا تھا۔ میں نے شدت جذبات سے بے قابو ہوتے ہوئے اپنا سیل پوری قوت سے دیوار میں دے مارا تھا، اور خود وہیں زمین پر گرتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ لیکن اگر رونے سے مسلے حل ہو جائیں اور بگڑی باتیں بننے لگیں تو پھر کیا ہی کہنے۔ ظاہر ہے رونے سے تو کوئی حل نکلتا نہیں، اس کے لیئے تو عقل ہی لڑانی پڑتی ہے اور میں نے بھی جیسے تیسے عقل لڑائی تھی۔ پھر میری عقل نے جو راستہ مجھے دکھایا، میں اندھا دھند اس پر چل پڑا۔ اب میں اس سے پھر رابطے استوار کرنے لگا۔ کبھی فون کرتا تو کبھی میسج۔ میرے بار بار اس کی طرف لپکنے سے یہ ہوا کہ وہ بھی مجھ سے بات کرنے لگی۔ چند دن روپیٹ کر، لڑ جھگڑ کر ہم پھر پہلے کی طرح ہی ہو گیئے تھے۔ اب ہم نے یہ احتیاط ضرور کی کہ اپنے گھر والوں کو اس "تجدید تعلق" کی ہوا بھی نہیں لگنے دی۔ ہم ابھی بھی ملتے تھے، مگر گھر سے باہر۔ وہ شاپنگ کے بہانے آ جاتی اور میں کام کے۔ اپنے اپنے

گھر والوں کی طرف سے اب ہم شکوک و شبہات سے بری ہو چکے تھے۔ وہ ان کی نظر میں شادی شدہ تھی، اور میں بیکار۔۔" ارسل۔!! میں نے تمہارے بغیر یہ وقت جیسے کاٹا ہے، میں جانتی ہوں یا میرا خدا۔ مگر اب میں تم سے کہے دے رہی ہوں، اب میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کچھ بھی ہو جائے، مجھے ہر حال میں بس تمہارا ہی ساتھ چاہئے اور کسی کا نہیں۔ اور دیکھو، اب میں تمہارے لیئے، صرف تمہاری خاطر اپنی زندگی کا سب سے بڑا رسک لینے جا رہی ہوں۔ اب کی بار مجھے دھوکہ مت دینا۔ پلیز ارسل۔ وعدہ کرو مجھ سے کہ تم اس بار میرا ساتھ نبھاؤ گے۔!!" اس روز بھی ہم اسی طرح چھپ کر ملے تھے۔ میں اسے اپنی محبتوں کا یقین دلا رہا تھا کہ میری بیتابیوں کے جواب میں وہ میرا ہاتھ تھام کر کچھ اس بیقراری سے گویا ہوئی کہ میں اس کی محبت کی شدت کے سامنے دنگ ہی رہ گیا۔ میرے لاکھ پوچھنے کے باوجود بھی اس نے مجھے نہیں بتایا کہ وہ کیا کرنے جا رہی تھی۔ میں دل ہی دل میں خوفزدہ بھی ہو رہا تھا کہ اب جانے یہ دیوانی لڑکی کیا گل کھلا بیٹھے۔ اور پھر واقعی، جو گل و گلزار اس نے کھلائے اس کے بارے میں تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔۔

۔ بیان ہر ایک سے ہجر و وصال کرتے ہو۔ کیوں اپنا شہر میں جینا محال کرتے ہو۔ بچھڑ کے بھی بھلا ملے ہیں کبھی چاہنے والے؟۔ کیوں اپنے آپ کو یونہی نڈھال کرتے ہو۔ سنا ہے وہ تمہیں پوچھتا ہے ایسے ہی،۔ تم اس کے بارے میں جیسے سوال کرتے ہو۔ وہ آشنائی اسے یاد ہی نہ ہو شاید۔ تم جس کے نام پر ماہ و سال کرتے ہو۔ بہت عزیز تھا وہ شائد اس لیئے محسن۔ بچھڑنے والے کا اب تک ملال کرتے ہو۔۔ اس سے بچھڑنے، اور کسی اور کی ہونے کے باوجود بھی اس سے بچھڑنے کا ملال مجھے دم بدم مار رہا تھا۔ میں اندر سے ختم ہوئی جا رہی تھی۔ اور پھر شائد میں بالکل ہی ختم ہو جاتی کہ اس دشمنِ جان کی یاد نے مجھے اس قدر بے کل کیا کہ بے خودی کے عالم میں میں اس کے جانے پہچانے نمبر پر میسج کر بیٹھی۔ بس، پھر مجھے یوں لگا جیسے میری زندگی، میری بچھڑی خوشیاں مجھے واپس مل گئی ہوں۔ میں ایک بار پھر اندھوں کی طرح چلتی ہوئی اسی راہ پر چل پڑی، جس پر میرا دل میری انگلی پکڑ کر مجھے

چلائے جا رہا تھا۔ ارسل سے ایک بار پھر رابطے کیا استوار ہوئے میں ہر طرف سے بیگانہ ہوتی چلی گئی۔ میری انا، عزت، وقار سب دانتوں تلے انگلیاں دبائے حیرت بھری نگاہوں سے مجھے اور میری دیوانگی تو تکتے رہ گیئے۔ میں نے بہت سوچنے کے بعد ایک فیصلہ کیا، اور پھر اس پر عمل کرنے کا پروگرام بھی بنا ڈالا۔ مگر اس سے پہلے مجھے اس بات کا بھی اچھی طرح اطمیان کرنا تھا کہ وہ میرا ساتھ کہاں تک دئے گا۔ میں اسے پانے کے لیئے" آخری داؤ" کھیلنے جا رہی تھی۔ اس میں جیت بھی ہو سکتی تھی اور مات بھی۔ اگر میرا یہ پلان کامیاب ہو جاتا تو پھر اس سے ملن کی صورت جیت میرا مقدر بنتی۔ اور اگر وہ مجھے نہ مل پاتا تو پھر موت تو تھی ہی ناں مات کی صورت۔ میں نے اسے اعتماد میں لیا، اور اس نے بھی پکا وعدہ کر لیا کہ اب" بھاگے" گا نہیں۔ ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کرے گا۔۔ میں نے امی اور باجی کے سامنے رخصتی سے انکار کر دیا۔ امی تو مارے حیرت اور صدمے کے گنگ ہو کر رہ گیئں، مگر باجی سے میرا انکار برداشت نہیں ہوا۔ میرے انکار نے گھر بھر میں ایکبار پھر ہنگامہ کھڑا کر دیا

تھا۔ تابش چند روز میں واپس آنے والا تھا، اور ہماری رخصتی کی تاریخ بھی طے ہو چکی تھی۔ ایسے میں میرا انکار سب کو طیش دلا گیا۔ امی، باجی، بھابھی سب نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی، مگر میری سوئی اب انکار پر اٹک چکی تھی، اس لیئے وہ سب سر پکڑ کر بیٹھ گیئں۔ اب یہ بات ایسی تھی کہ گھر کے مردوں کو بتائی بھی نہیں جا سکتی تھی، اور ان سے چھپانا بھی محال تھا۔ میری ضد سے سب ہی واقف تھے، اور کسی حد تک عاجز بھی۔ مگر کیا کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ میں تو شروع سے ایسی ہی تھی۔ ادھر شادی کی تیاریاں زور شور سے چل رہی تھیں، اور ادھر میری وجہ سے ایک نئ مصیبت میرے گھر والوں پر ٹوٹ پڑی تھی۔ سارے کا سارا گھر ایکبار پھر میرے خلاف ہو چکا تھا۔ مگر مجھ پر کسی بات کا کوئی بھی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ نہ امی کے رونے کا، نہ بھابھی، باجی کے سمجھانے کا۔ حتیٰ کہ بھائیوں کی مار اور ابو کی ڈانٹ کا بھی۔ مجھ پر اب واقعی کسی چیز کا کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔ میری بے حسی اپنے عروج پر تھی۔ دن پر دن گذرتے جا رہے تھے۔ گھر والے اپنے سارے حربے آزما کر تھک چکے تھے، مگر

میری ناں، ہاں میں نہیں بدلی تھی۔ آخر کار انہوں نے مجھے میرے حال پر چھوڑا دیا اور وہ پھر سے شادی کی تیاریوں میں مصروف ہوگیئے۔ میں بھی انہیں مصروف دیکھ کر خاموش ہوچکی تھی۔۔" امی جان۔!! آپ نے بھی مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔؟ میں نہیں رہ سکتی ارسل کے بغیر، آپ اچھی طرح سے جانتی تھیں، ماں ہیں آپ میری، مگر پھر بھی میری فیلنگز کو نہیں جان پائیں۔ کوئی بات نہیں امی۔ آپ لوگ کرلیں اپنی ضد پوری۔ مگر میں بھی آپکی ہی بیٹی ہوں، اپنی مرضی تو میں بھی کر کے رہوں گی۔ آپ اگر میری بات مان لیتی ناں، میری جان چھڑوا دیتیں، اس الّو کے پٹھے تابش سے تو کیا تھا بھلا۔؟ میں نے کہا ناں کہ میں نہیں رہ سکتی اس ڈفر کے ساتھ۔ وہ دو اور دو پانچ کرنے والا حسابی کتابی بندہ، بھلا کیا سمجھ پاتا میرے نازک احساسات اور جذبات کو۔ بس امی۔ میرا دل نہیں مانتا ناں اس کے ساتھ کے لیئے۔ میں کبھی خوش نہیں رہ پاؤں گی اس کے ساتھ۔ اور اس طرح گھٹ گھٹ کر روز روز مرنے سے اچھا ہے کہ میں ایکبار ہی مر جاؤں۔ پھر تو آپکی عزت بھی رہ جائے گی اور بات بھی۔ ہوسکے تو مجھے معاف کر دیجیئے گا امی۔ میں نے اپنے دل کی خوشی کے لیئے آپ کے دل کو تکلیف پہنچائی۔ مگر کیا کروں امی، میں بھی اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہوں۔!!" شادی میں صرف چند روز ہی رہ گیئے تھے۔ گھر میں مہمانوں کی آمد آج کل میں شروع ہونے ہی والی تھی، میہری اس طویل خاموشی کو میری رضامندی سمجھتے ہوئے، سب میری طرف سے قدرے بے فکر ہو چکے تھے، جب میں نے اپنا آخری داؤ بڑی ہوشیاری سے چل دیا۔ امی کے نام چند بے ربط سے لائینیں کھینچیں، جن میں اپنی بے بسی کا کھل کے اظہار کیا اور پھر رات کے پچھلے پہر، امی کی ہی سلیپنگ پلز ایک مناسب مقدار میں پھانک، وہیں امی کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی۔ (گولیاں میں نے اتنی ہی کھائی تھیں کہ بچ جاؤں۔ مجھے سچ مچ تھوڑی مرنا تھا) میرے پلان اور توقع کے عین مطابق تھوڑی دیر کے بعد ہی امی تہجد کے لیئے بیدار ہو گئیں۔ انہوں نے جیسے ہی مجھے قدموں میں اس طرح آڑھا ترچھا پڑے دیکھا تو انکے خلق سے بے ساختہ ایک چیخ برامد ہوئی۔ امی کی چیخ سنتے ہی، سب گھر والے ان کے

کمرے میں بھاگے چلے آئے، اور پھر میری توقع کے عین مطابق مجھے فوری طور پر ہاسپٹل لے جایا گیا۔ یہ ایک چھوٹا سا پرائیویٹ ہاسپٹل تھا اور اس کے اونر بھائیجان کے بہت اچھے دوست تھے، سو بغیر کسی مشکل کے مجھے فوری ایڈمٹ کر لیا گیا اور میرا علاج معالجہ شروع ہو گیا۔ ادھر گھر میں امی اور بھابھی کو میرا خط بھی مل چکا تھا۔ وہ دونوں بہت پریشان تھیں۔ لیکن میں جانتی تھی کہ اب نتیجہ میرے حسب منشاء ہی نکلنے والا تھا، سو ایسے ہی ہوا۔۔ میرے لکھے گیئے آخری خط کو میری طرف سے آخری وارننگ سمجھا گیا، اور یہ تو میں جانتی ہی تھی کہ میرے گھر والے مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ اظہار چاہے نہ کرتے ہوں، مگر انہیں میری خوشیوں کی پرواہ تھی۔ اسی لیئے ابو اور بھیا نے چچا کریم سے ہاتھ جوڑ کر معذرت کر لی۔ چچی عورت ہونے کے ناطے اس بے عزتی پر بری طرح سے بھڑک گئی تھیں، انہوں نے چچا سمیت اپنی دوسری اولادوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور ہر صورت رخصتی کا مطالبہ کر دیا تھا۔ ظاہر ہے، یہ ان کی بھی عزت اور بے عزتی کا سوال تھا۔ مگر یہاں میں تابش کے حوصلے کی تعریف کیئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس نے بہت خوبصورتی سے میرا مقدمہ لڑا تھا۔ اور اپنے گھر والوں کو اچھی طرح باور کروا دیا تھا کہ ایسے تعلق کا کیا فائدہ جو ہمیشہ کے لیئے بوجھ بن جائے، ایسا تعلق جوڑنے سے بہتر ہے کہ انسان اپنے پہلے رشتے ہی اچھی طرح سے نبھائے۔ تابش کا مجھ پر یہ احسان ہی تھا کہ اس نے میرے دل کی بات سمجھتے ہوئے مجھے خود ہی طلاق بھجوا دی۔۔ میں شائد دنیا کی واحد لڑکی تھی جو اس داغ (طلاق) کے لگنے سے اس طرح خوش ہو رہی تھی جیسے کہ ہفتِ اکلیم کی دولت میرے ہاتھ لگ گئی ہو۔ میرے روم روم سے چھلکنے والی مسرت اور میرے بے ساختہ امڈنے والے قہقہوں نے سب کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔ لیکن مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں تھی۔ میں نے جو چاہا تھا، پا لیا تھا۔ ادھر تابش کے نام کا دم چھلہ میرے نام سے ہٹا، ادھر ارسل ایکبار پھر سوالی بن کر میری دہلیز پر آن کھڑا ہوا۔ اس نے ابو، امی، بھیا سب سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اور پھر ابو کے سامنے گھٹنوں پر گر کر میرا ہاتھ ان سے مانگا۔ اس کی یہ دگر گوں حالت اور میری خوشی کو دیکھتے ہوئے آخر کار

وہ مان ہی گیئے۔ ابو اور بھیا نے امجھے ایک بار پھر اس کے ساتھ منسوب کر دیا، مگر اب کی بار انہوں نے ایسی شرائط رکھی تھیں کہ ایکبار تو میں بھی سوچ میں پڑ گئی۔

--------------۔ ہم تم سے ملے، پھر جدا ہو گیئے۔ اور جدا ہو کے ہم، دیکھو پھر مل گیئے۔ اب ہو کہ جدا پھر ملیں نہ ملیں۔ تو کیوں نہ ایسا کریں، مل جائیں چلو ہم صدا کے لیئے۔ ایک عرصے کے بعد میں دل سے خوش ہوا تھا، اور اسی خوشی میں ہم لانگ ڈرائیو پے نکلے تھے۔ کچھ موسم بھی بہت سہانہ ہو رہا تھا اور کچھ گاڑی میں گونجنے والے ان رومینٹک بولوں کا اثر تھا کہ میں بھی مستی کے عالم میں گنگناتا ہوا، اس کی طرف شوخی سے جھکا تھا۔ وہ پہلے ہی میری طرف دیکھ رہی تھی، مگر بہت سنجیدہ اور سوالیہ نگاہوں سے۔۔" ارسل صاحب۔!! اگر آپ سدا کے لیئے مجھ سے ملنا چاہتے ہیں، اور دوبارہ جدائی کا زہر نہیں پینا چاہتے، تو اس کے لیئے کچھ عملی اقدام بھی اٹھائے۔ یوں گانے گا کر، اور لانگ ڈرائیو پر لے جا کر آپ مجھے حاصل نہیں کر سکتے۔ سمجھے آپ۔!! " میں اس کے اس جذباتی حملے کے لیئے تیار نہیں تھا، اس لیئے گڑبڑا کر رہ گیا۔۔" ارے، تو میں کب انکار کر رہا ہوں۔ میں نے تو تمہیں کئی بار کہا ہے کہ چلو، کورٹ میرج کر لیتے ہیں۔ بعد میں جو ہو گا، دیکھا جائے گا۔ کیونکہ میرے گھر والے تو شائد کبھی بھی اس رشتے کے لیئے نہیں مانئیں گے۔ ویسے بھی سارے حالات تمہارے سامنے ہی ہیں۔ پہلے بھی جب میں نے تم سے شادی پر زور ڈالا تھا تو آپا کو ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا اور انکی وجہ سے سب کو ہائپر ٹینشن۔ اور پھر اسی ٹینشن کے عالم میں ہم جدا ہو گئے تھے، اور سچ پوچھو تو حالات اب بھی ویسے ہی ہیں۔ ایک کو مناتا ہوں تو دوسرا روٹھ جاتا ہے۔ عجیب گورکھ دھندے میں جان پھنسا بیٹھا ہوں، اس پر تمہارے ابو کی شرطیں۔ اب ان سب سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تم میرا ساتھ دو۔ تو ہم آج اور ابھی کورٹ میرج۔۔۔!!! " ۔ " نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ارسل صاحب، اب تو آپ کو اپنے گھر والوں کو منا کر ہی لانا ہو گا۔ یہ اب میرے گھر والوں کی شرط سے زیادہ میری ضد بن چکی ہے۔ یاد ہے، جب میں نے کہا

تھا کہ کورٹ میرج کر لیتے ہیں تو تمہیں کیسے آگ لگی تھی۔؟ کس طرح لیکچر دیا تھا تم نے مجھے۔؟ ہوں، کیسے سینہ ٹھونک کر غرائے تھے تم کہ "بھگا کر نہیں لے جاؤں گا تمہیں، سب کی موجودگی میں، سب کی رضا کے ساتھ، انکی دعاؤں اور گوہی کے ساتھ بیاہ کر لے جاؤں گا تمہیں۔ ہمارے خاندان میں کورٹ میرج نہیں ہوتی، ہم اسے اچھا نہیں سمجھتے۔" تو، اب کیا ہوا، کیوں کروں میں تم سے اب کورٹ میرج تاکہ تمہارے خاندان والے مجھے "گھر سے بھاگی ہوئی" کے طعنے دیتے رہیں ہمیشہ۔؟ نہیں۔ ارسل صاحب، نہیں، اب تو آپکو سب کی موجودگی میں سب کی رضا کے ساتھ ہی مجھے بیاہ کر لے جانا ہو گا۔ سمجھے آپ۔!! :: میری بات پوری ہونے سے پہلے ہی وہ تیزی سے مجھے کاٹ کھانے کو دوڑی تھی۔۔ " تو پھر تم ہی بتاؤ کہ میں کیا کروں۔ ان سب کو مناتے مناتے تو میرے سارے بال جھڑ گیئے۔ اور اب جو بچے کھچے رہ گیئے ہیں، وہ یوں ہی سفید ہو جائیں گے مگر وہ نہیں مانیں گے۔ میں جانتا ہوں، انہیں اچھی طرح سے۔ اسی لیئے تو کہہ۔۔۔!!!" ۔" تو۔؟ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کوئی ناراض ہے یا نہیں۔ تمہیں کون سا پوری "جنج" ہی اٹھا کر لانی ہے۔؟ کون کہتا ہے کہ تم ہر ایک کے "ترلے" کرتے پھرو۔؟ یہ زندگی ہماری ہے، اس پر حق بھی ہمارا ہی ہونا ہی ہے۔ اپنی زندگی کے بارے میں اچھا، برا جو بھی فیصلہ ہو گا، ہم ہی کریں گے۔ اور رہی بات، ابو کی شرط کی، تو انہوں نے تمہیں اپنے کسی بڑے کو لانے کا کہا ہے ناں، تو محسن بھائی اور بڑی بھابھی ہی تو سب سے بڑے ہیں ناں تمہاری فیملی میں۔ اور ان کے ساتھ تمہارے تعلقات بھی بہت اچھے ہیں، تو پھر تمہیں کسی اور کی منتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔؟ سیدھی طرح بھیا کی فیملی کو ساتھ لاؤ، اپنے دوستوں کو باراتی بناؤ۔ اور ویسے بھی سائین کرنے کے لیئے صرف دو گواہوں کی ہی تو ضرورت ہوتی ہے۔ سو۔ انہیں ساتھ لاؤ اور مجھے بیاہ کر لے جاؤ۔ سمپل۔!!" میری بات کو ایک بار پھر کاٹتے ہوئے اس نے مجھے نئی راہ سجھائی تو میں بھی اسے دیکھتا چلا گیا۔۔" ارسل علیم صاحب۔!! صنم رشید میمن کو بعوضِ پچاس لاکھ سکہ رائج الوقت، حق مہر موجل آپکے نکاح میں دیا جاتا ہے۔ کیا آپ کو قبول ہے۔؟

" قاضی صاحب کے الفاظ کچھ مجھے سمجھ میں آئے، کچھ نہیں۔ مگر میں نے میکانکی انداز میں سر ہلانے کے ساتھ ساتھ، جہاں جہاں وہ کہتے چلے گیئے، سائین کرتا چلا گیا۔ میرے حواس میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ میں بہت کوشش اور چاہنے کے باوجود بھی سوائے محسن بھائی اور ان کی فیملی کے اور کسی کو ساتھ نہیں لا پایا تھا۔ حتیٰ کہ میں ان سے بات بھی نہیں کر پایا تھا۔ صنم نے جو پٹی مجھے پڑھائی تھی، میں نے آنکھ بند کر کے اس پر عمل کر ڈالا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ میں نے صرف محن بھائی اور بڑی بھابھی کو ہی اعتماد میں لیا تھا۔ آپاؤں کے خوف کی وجہ سے میری ہمت ہی نہیں ہوئی تھی کہ انس بھائی اور مونس بھائی سے بات بھی کر پاتا۔ اور اسی ڈر، اس خوف کا نتیجہ یہ تھا کہ میں چند افراد پر مشتمل بارات لیئے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی پانے چلا آیا تھا۔ نکاح کے بعد جانے کون کون سی رسومات ادا کی گئیں، مجھے کچھ ہوش نہ تھا۔ میری غائب دماغی کو دیکھتے ہوئے بھابھی نے کھانے کے فوراً بعد رخصتی کی جلدی مچادی۔۔ خدا گواہ ہے کہ یہ وقت مجھ پر سب سے زیادہ بھاری تھا۔ صنم کا تو مجھے پتا نہیں مگر، میرے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ میری نگاہوں کے سامنے میرا بچپن، میری اماں، ابا، بہنیں بھائی سب کسی فلم کی طرح گھوم رہے تھے۔ میں بوجھل دل اور جھکے سر کے ساتھ اپنی دلہن کا ہاتھ تھامے اپنے گھر، اپنی جنت کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ بھیا، بھابھی کی حد یہیں تک ہی تھی۔ وہ ہمیں دروازے میں چھوڑ کر ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے اپنے گھر جا چکے تھے۔ اور اب مجھے رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا کہ مجھ سے کیا غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ یہ کس طرح کی "دیوانگی" تھی، کیسا "عشق" تھا کہ جس نے مجھے ہر طرح کے سود وزیاں سے بے پرواہ کر دیا تھا۔ میں نہ چاہتے ہی اس موڑ پر آ کھڑا ہوا تھا کہ اب آگے کنواں، پیچھے کھائی والی سچوئیشن صاف دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے بھائیوں کی شادیاں یاد آ رہی تھیں۔ جس طرح بھابھیوں کو پورے پروٹوکول، پورے احترام کے ساتھ اس گھر میں ویلکم کیا گیا تھا، وہ کوئی بھولنے بات تو نہیں تھی۔ جو مان، محبت اور خوشی بھابھیوں کے حصے میں بڑے بزرگوں کی دعاؤں اور رضامندی کی وجہ سے آئی تھی، ہمیں تو اس کا سایہ

بھی ملتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرا سر خود بخود ہی شرم سے جھکا جا رہا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو جھڑی کی طرح برس رہے تھے۔ صنم نے میری یہ حالت دیکھی تو وہ بھی رونے لگی۔ پھر ہم نے روتے ہوئے ہی گھر کی دہلیز پار کی، اور میں صنم کو لیئے اوپر آ گیا۔۔ لاؤنج میں قدم رکھتے ہی ایک اور دل چیر دینے والا نظارہ ہمارا منتظر تھا۔ انس بھائی مین گیٹ کے پاس اسٹول پر چڑھے لاؤنج کے دروازے کے سامنے بیڈ شیٹ کو پردے کی طرح ٹانگنے کی کوشش میں مصروف تھے (تاکہ ہم انہیں اپنی شکل دکھائے بغیر ہی اوپر اپنے پورشن میں چلے جائیں۔)، مگر لرزتے ہاتھوں اور بہتے آنسوؤں کی وجہ سے پردہ بار بار ان کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتا، جیسے روبی بھابھی روتے ہوئے پھر انہیں تھما دیتیں۔ سامنے ہی مونس بھائی، فاریہ بھابھی، دونوں آپائیں اور ان کے بچے سب کے سب حالت سوگ میں بیٹھے رو رہے تھے۔ میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے ہی رہ گیا۔ مجھے اپنا تو پتا نہیں لیکن صنم ایک دم چیخ مار کر آگے بڑھی اور روبی بھابھی سے لپٹ کر دھواں دھار رونے لگی۔ بھابھی نے بے ساختہ اسے بانہوں میں بھر لیا اور پھر وہ دونوں زور زور سے رونے لگیں۔ ان دونوں کو اس طرح روتے دیکھ سب نے ہی زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ میری برداشت بھی بس یہیں تک تھی۔ میں بھی روتا ہوا آگے بڑھا اور انس بھائی سے لپٹ گیا۔۔ " چھوٹو!! تم بڑے بھیا اور بھابھی کو تو ساتھ لے گیئے، مگر ہم سے تم نے ذکر کرنا بھی گوارا نہیں کیا۔؟ کیا ہم تمہاری خوشیوں کی راہ میں اتنی ہی بڑی رکاوٹ بن چکے تھے کہ تم نے ہم سے اپنی خوشی میں شامل ہونے کا حق بھی چھین لیا۔؟ بولو چھوٹو، بولو۔ تم نے ایسا کیوں کیا۔؟ کیا تمہیں ہمارا ذرا بھی خیال نہیں آیا۔؟" انس بھائی نے میرا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لیتے ہوئے کچھ اس طرح گلہ کیا کہ مجھ پر گڑھوں پانی پڑ گیا۔ میں نے شرمندگی سے سر جھکا دیا۔ بھیا مجھے ساتھ لگائے ہوئے آگے بڑھے اور آپا کے پاس لے گیئے۔ آپا رو رو کر بے حال ہو چکی تھیں۔ میں بے ساختہ ان کے قدموں میں بیٹھتا چلا گیا۔ ۔ " آپا۔!! مجھے معاف کر دیں۔ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ میں شاید آپ کو اپنی بات سمجھا ہی نہیں پایا تھا، اس لیئے اس حد تک چلا گیا۔ بھیا، بھابھی، آپ آپاؤں

سے کہیں ناں کہ مجھے معاف کر دیں۔۔!!" میں نے روتے ہوئے آپا کے پاؤں پکڑ لیئے تھے، اور بس، اس سے زیادہ شاید وہ بھی سہہ نہیں سکتیں تھیں اس لیئے چیخ چیخ کر روتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئیں۔ ایک عجیب طرح کا ماحول بن چکا تھا، یہ گھر "شادی والا گھر" کہیں سے بھی نہیں لگ رہا تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس گھر میں نئی دلہن نے قدم رکھا تھا۔۔" آپا، بھیا، ہمیں معاف کر دیں۔ ہم سے بہت بڑی بھول ہو گئی آپا۔ ہم واقعی جذبات میں اندھے ہو گیئے تھے۔ اس لیئے صرف اور صرف اپنے ہی "دل" کی سنی، اور آج اسی دل نے ہمیں کسی کے سامنے نظر اٹھانے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔ آپ ہماری خطاؤں کو معاف کر دیں، اور ہمیں اپنے دل میں تھوڑی سی جگہ دے دیں۔ میں وعدہ کرتی ہوں کہ آپ سب کو کبھی بھی شکایت کا موقع نہیں دونگی۔ پلیز، ایکبار ہمیں معاف کر دیں۔!!" ۔مجھے تو ان سب سے معافی مانگنی ہی تھی، مگر صنم بھی پیچھے نہیں رہی تھی۔ اس نے بھی روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر سب سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگی تو میرے کھلے دل والے بہن بھائیوں نے ہمیں سینے سے لگا لیا۔ ۔

۔۔۔۔۔۔ تو جناب۔ اب آپکو یقین آیا کہ میں، جو خود کو " محبت کے شجر" پر بیٹھا" الّو" تصور کر رہا ہوں تو کیا غلط کر رہا ہوں۔ اس دل، اور دل میں چھپے محبت کے ٹھاٹھیں مارتے سمندر میں ڈبکیاں کھاتے کھاتے اب تو میں حال سے بے حال ہو چکا تھا۔ اور وہ "محبت کی فاختہ" صنم جو خود کو "پیار کی بلبل" کہتی تھی، اب کسی خونخوار عقاب کا روپ دھار چکی ہے۔ وہ جب تک " محبوبہ " تھی، میرے حواسوں پر کسی نشے کی چھائی، مجھے اپنے ارد گرد ہی دوڑاتی رہی۔ اور اب، جبکہ وہ خیر سے میری گھر والی بن چکی، میرے بچوں کی ماں بن چکی تو آپ خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اب میری دوڑ کا عالم کیا ہو گا۔؟۔ کہتے ہیں ناں کہ " ملا کی دوڑ مسجد تک "تو اسی طرح میری دوڑ بھی اب صرف اس "کالی بلی" صنم رشید میمن تک ہی رہ گئی تھی، اور شائد اب ساری عمر میرا یہ ہی عالم رہنے والا ہے کیونکہ میرے سر سے " محبت کا بھوت " تو بہت پہلے کا اتر چکا کہ عملی زندگی میں آنے کے بعد آٹے دال کا بھاؤ تو

بہت اچھی طرح سے پتا چل چکا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ آنکھوں پر پڑے بہت سے پردے بھی خود بخود ہی اٹھتے چلے گیئے جو اس " نامراد " ۔دل نے میری نگاہوں کے سامنے تان رکھے تھے۔لیکن اب میں کچھ نہیں کر سکتا سوائے جھٹپٹانے کے۔کیونکہ اڑنے کی اب نہ تو طاقت رہی اور نہ ہی ہمت۔ صنم نام کی "بیڑی" میں نے خود بڑے شوق سے اپنے گلے میں ڈالی تھی،اور اب تو اس بیڑی کے ساتھ ساتھ دو" ہتھکڑیاں" میرے بیٹوں کی صورت بھی مجھے جکڑ چکی ہیں۔۔وصالِ یار سے دونا ہوا عشق۔مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی۔۔لیکن،یہ عشق کا مرض اس قدر بڑھ جائے گا، کبھی سوچا نہ تھا۔اگر جو کبھی بھول کر بھی اس کے مضمرات کے بارے میں جان لیتے تو شائد آج ہم بھی اپنے دل کے ہاتھوں کھلونا نہ بنے پھر رہے ہوتے۔ہماری زندگی بھی عام انسانون کی طرح سکون اور اطمیان سے گذر رہی ہوتی،خاص طور سے میری کہ میں آج تک اس دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس دلربا کے اشاروں پر" بندروں" کی طرح ناچ رہا ہوں۔مگر گلہ کس سے کروں،یہ" ڈکڈگی" تو میری اپنی پسند کی ہوئی ہے،اور اس کی تال پر اب مجھے ہی تو دیوانہ وار رقص کرنا ہے کیونکہ یہی میرا مقدر ہے۔ اور ویسے بھی یہ "دل کا معاملہ " ہے۔میرے اس دل کا جس کی انگلی تھامے،میں آج بھی بڑے فخر و انبساط سے اپنی محبوبہ کے اشاروں پر چلتا چلا جاتا ہوں۔صنم نے میرے گرد اپنی محبت کا" شکنجہ" بہت سختی سے کس رکھا ہے،اور اب وہ مجھے میدان سے بھاگنے نہیں دے گی،آخر کو وہ مجھے مجھ سے زیادہ اچھی طرح جانتی ہے۔تو،اب تو آپ کو یقین آ ہی گیا ہو گا کہ میں وہ" الّو" ہوں جو" محبت کے شجر" پر الٹا لٹکا" محبت، محبت" کا راگ الاپتا، حال سے بے حال ہوا جا رہا ہوں۔

---------------------- ۔ ثمینہ طاہر بٹ۔ ۔ لاہور

مبارک ہو مبارک ہو مبارک ہو

داستان دل اپریل سے کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے

اب آپ داستان دل اپنے گھر، ہوسٹل، آفس، کالج کے ساتھ ساتھ دنیا کے کسی بھی کونے میں حاصل کر سکتے ہیں، تو ابھی اپنا نام ممبر شپ میں فائنل کروائیں

معلومات ممبر شپ:

سالانہ بمعہ ڈاک خرچ	:	1200/-
چھ ماہ بمعہ ڈاک خرچ	:	600/-
تین ماہ	:	300/-

(ممبر شپ 03225494228 اس نمبر پر موبی کیش اکاونٹ میں جمع کروا کہ اپنا ایڈریس اسی نمبر پر واٹس اپ یا مسیج میں سینڈ کریں)

مزید معلومات کے لیے: 03225494228 واٹس اپ / موبائل نمبر

ہجر رتوں کے عذاب مت پوچھو
مجھ سے میرا خیال مت پوچھو
اسے جانا تھا چلا گیا وہ
دل تار تار کا حال مت پوچھو

الوینہ کتنی دیر سے اسی تحریر کو بار بار پڑھے جا رہی تھی جیسے وہ خود کو کچھ باور کرانا چاہتی ہو۔ یا اللہ میری مدد فرما اور مجھے حوصلہ دے الوینہ کے یہ کہتے ہوئے تھک کر اپنی آنکھیں موند لیں۔

الوینہ ایک تعلیم یافتہ اور خوبصورت لڑکی تھی۔۔ چند سال اس کی منگنی اپنے کزن عاشر سے ہوئی تھی۔ عاشر الوینہ کی خالہ کا بیٹا تھا وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا۔ کو برو تھا لیکن نجانے کیوں اس پر ایک دھن سوار رہتی تھی کہ اس نے باہر کے ملک جانا ہے۔ اس کی ضد کے آگے عالیہ بیگم (اس کی والدہ) کو بالآخر ہامانا پڑی۔ تب انہوں نے ایک شرط پہ اس باہر جانے کی اجازت دے دی کہ وہ الوینہ سے منگنی کرلے عاشر نے بہت کوشش کی کہ وہ اس منگنی سے انکار کر دے۔

لیکن اسے یہ منگنی کرنی پڑی۔ عاشر نے سوچا کہ جب وہ واپس آئے گا تو یہ منگنی توڑ دے گا۔ یہ سوچ کر وہ مطمن ہو گیا۔ چند دن بعد اس کی منگنی الونیہ سے ہو گئی۔ عاشر نے دیکھا کہ الوینہ بہت لگ رہی تھی اور کچھ گھبرائی ہوئی تھی۔۔ عاشر نے بے ساختہ اپنی ماں کی پسند کو سراہا کہ انہوں نے سارے خاندان میں دیکھ بھال کر اس کے لیے ہیرا لڑکی تلاش کی۔ منگنی کے

چند دن بعد ہی عاشر لندن چلا گیا۔۔ وہاں جا کر اس نے اپنی خیریت کی اطلاع دی۔ اسی طرح وہ وقفے وقفے سے گھر فون کرتا رہتا تھا عاشر وہاں جا کر اتنا مصروف ہو گیا کہ اسے یاد ہی نہ رہا کہ دور کہیں کوئی اس کا منتظر ہے اسی طرح خاموشی سے دو سال گزر گئے۔

اُدھر الونیہ بہت خوش تھی کہ عاشر جیسا شخص اس کا شریک حیات بننے جا رہا ہے لیکن یہ خوشی اسے صرف چند دن ہی راس آئیل، عاشر نے نہ تو اسے کبھی فون کیا اور نہ ہی اس سے کوئی وعدہ کیا الوینہ پہلے تو بہت پریشان ہوئی کہ کہیں خالہ نے زبردستی تو نہ کی تھی۔ لیکن پھر عاشر کا پر سکون چہرہ سامنے آتا تو وہ اس خیال کی تردید کر دیت۔ بے چینی تھی کہ بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ماسٹرز کر چکی تھی۔۔ لہذا اس نے وقت کو گزارنے کے لے کالج میں پڑھانا شروع کر دیا۔۔

وقت آہستگی سے گزرنے لگا۔ وہ اللہ سے ہر دعا میں صرف اسے ہی مانگا کرتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کے بغیر سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں۔ اسی طرح موسم بدلتے رہے اور دو سال بیت گئے۔ الوینہ کو لگتا تھا کہ ہر چیز نے اداسی کی دادر اوڑھ رکھی ہو۔ صبح حسب معمول جب الوینہ کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو اس کو امی نے بتایا کہ عاشر کل صبح واپس آ رہا ہے۔ ان کے لہجے میں کوشی نمایا تھی۔ چہرے پہ ایک انوکھی مسکراہٹ تھی وہ بہت پر سکون لگ رہی تھیں۔ الوینہ کے چہرے پر لمحہ بھر کو چمک ابھری لیکن اگلے ہی پلل معدوم ہو گئی۔ اچھا امی اللہ حافظ میں جا رہی ہو۔ لیکن بیٹا ناشتہ تو کرتی جاؤ نہیں امی مجھے بھوک نہیں ہے۔ یہ کہتے ہوئے الوینہ کالج کے لیے روانہ ہو گئی۔۔

عاشر واپس آ چکا تھا خالہ نے اس کے واپس آنے کی کوشی میں سب خاندان والوں کو رات کے کھانے پر بلایا تھا انہوں نے کاص طور پر الوینہ سے کہا کہ وہ اچھا سا تیار ہو کر آئے۔ الوینہ بے دلی سے مسکرا دی اور سوچنے لگی کہ عاشر کو تو اس کی پرواہ نہیں اور وہ صرف اتنا ہی سوچ سکی۔

رت کو نہ چاہتے ہو بھی خالہ کی خوشی کی کاطر وہ اچھا سا تیار ہو گئی اور صالحہ بیگم (الوینہ کی امی) کے ساتھ روانہ ہو گئی۔ جب وہ وہاں پہنچے تو پورا گھر روشن تھا۔۔ سب ہی بہت خوش تھے اور باتوں میں مشغول تھے۔ وہ بھی

جا کر اپنی سب کزنز سے ملنے لگی۔ تب ہی اسکی نظر عاشر پر اٹھا گئی اسی لمحلے عاشر نے بھی اس کو چیکھا لیکن وہ لمحلہ بھر کو دیکھنے کے بعد دوبارہ باتوں میں مشغول ہو گیا۔۔ بات صرف ایک لمحے کی تھی۔ الوینہ اپنا دل سو س کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اپنی نا قدرہی پر عاشر کا اسے اس طرح نظر انداز کر دینا اسے بہت برا لگا تھا۔ وہ کاموشی سے وہاں سے اُٹھ کر گھر کی دوسری جانب آگئی۔۔

وہ وہاں بیٹھ کر رونے لگی۔ جب دل کا غبار چھٹا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ یہ رشتہ ہی ختم کر دے گی۔ جب وہ عاشر کو پسند ہی نہیں تو وہ کیوں زبردستی اس کے ساتھ رشتہ رکھے فیصلہ کرتے ہی وہ ایک ددم اٹھی اور جانے کو مڑی تو وہ ساکت رہ گئی۔۔۔ عاشر سینے پہ ہاتھ باندھے نجانے اسے کتنی دیر سے دیکھ رہے تھا۔ وہ چند قدم آگے بڑھ کر اس کے مقابل آگیا اور بولا۔۔

الوینہ کیا تم رو رہی تھی اس نے اس کی سرخ آنکھوں کی طرف اشارہ کیا وہ کچھ نہ بولی اور سر جھکا لیا۔۔ سنو میں تم سے ایک بات کرنے آیا ہوں الوینہ نے جھٹ سر اٹھایا۔ اسے دیکھ اور سوچا کر وہ اسے کہنے لگا ہے کہ وہ منگنی توڑ ڈالے کیوں کہ میں اسے پسند نہیں یہ سوچ کر وہ فوراً بولی دیکھو عاشر میں بھی اب یہ بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ تم کچھ نہ کہو۔۔ جو فیصلہ مجھے بہت پہلے (کینا چاہیے تھا وہ میں نے آج کر لیا ہے میں یہ رشتہ توڑ رہی ہوں یہ کہتے ہوئے اس نے انگوٹھی اتار کر اسے تھما دی عاشر تو پریشان ہو گیا۔ تو وہ خود یہی چاہتا تھا لیکن نجانے کیسے اسے الوینہ اچھی لگنے لگی تھی اور یہ پسند نہ جانے کب محبت میں بدلی اسے کبر ہی نہ ہوئی۔ آج تو وہ اس سے معافی مانگنے آیا تھا۔۔ وہ گھبرا کر بولا۔۔ الوینہ میں تو یہ کہنے آیا تھا کہ تم مجھے معاف کر دو۔۔ میری طرف سے بہت کوتاہی ہوئی لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ شادی کے بعد ایسا نہ ہو گا۔ اس نے حیران نظروں سے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھا ہاں یقین کرو الوینہ میں سچ کہہ رہا ہوں آج میں نے تمہیں اس طرح اداس دیکھا تو ضبط نہ ہوا۔ آج میں تم سے کو د معافی مانگ رہا ہوں اور ہاں بتاؤ کہ امی کو کب بھیجوں شادی کی تاریخ لینے لیے لیے عاشر نے مسکرا کر کہا تو اس نے سر جھکا لیا اب تو کوئی لشکوہ شکایت نہ رہی تھی۔ عاشر کی بات نے اسے زندگی کی نوید دی

تھی۔ اس نے کہا جب آپ کا دل چاہے تب بھیج دیں اور آگے بڑھنے لگی۔ اچانک عاشر نے اسکا ہاتھ پکڑ لیا اور انگوٹھی پہنا دی اور بولا یہ تمہیں یاد دلاتی رہے گی کہ تم صرف میری ہو الوینہ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ یا اللہ تیرا شکر ہے تو نے میری لاج رکھ لی وہ دل ہی دل میں رب باری تعالیٰ کا شکر بجا لائی۔ جب گھر آئی تو کود کو بہت ہلکا پھلا محسوس کر رہی تھی۔۔

اس نے اپنی ڈائری نکالی۔ وہ شکایات سے بھری ہوئی تھی جو اسے عاشر سے تھیں۔ ان کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک آسودہ سی مسکراہٹ آ گئی۔۔ پھر اس نے ڈائری میں نظم لکھی جو اس کے جذبات کو احساسات کو بیان کر رہی تھی۔۔

خوشیوں کے موسم میں
گئی رُتوں کا حساب
کیا کرنا
ملن کی گھڑی میں
جدائیوں کا شمار
کیا کرنا
وہ رت جگوں میں لہو کے بے کل وہ اپنی بے چینوں کا
حساب
کیا کرنا
وصل کی گھڑی میں
ہجر کی رُتوں کا شمار
کیا کرنا
پلکوں پہ سجے سہانے خوابوں کی
تعبیر جو ملی
جھوم جھوم کر خوشی میں
وہ اپنے رب کے حضور میں
سجدہ شکر ادا کرنا۔۔

اور واقعی وہ بھی اپنے رب کے حضور سجدہ شکر بجا لانے کو کھڑی ہو گئی۔۔

تحریر کردہ۔ ندا رفیق بلوچ

☆☆☆☆

میں درد و غم کو بُھلانے کی سوچ رکھتا ہوں
بے وفا زمانے میں وفا نبھانے کی سوچ رکھتا ہوں
کون دیتا ہے وفا اس زمانے میں
میں پھر بھی سب کو آزمانے کی سوچ رکھتا ہوں

شاعر: ندیم عباس ڈھکو ساہیوال

مبارک ہو مبارک ہو مبارک ہو

داستان دل اپریل سے کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے

اب آپ داستان دل اپنے گھر، ہوسٹل، آفس، کالج کے ساتھ ساتھ دنیا کے کسی بھی کونے میں حاصل کر سکتے ہیں، تو ابھی اپنا نام ممبر شپ میں فائنل کروائیں

معلومات ممبر شپ:

سالانہ بمعہ ڈاک خرچ	:	1200/-
چھ ماہ بمعہ ڈاک خرچ	:	600/-
تین ماہ	:	300/-

(ممبر شپ 03225494228 اس نمبر پر موبی کیش اکاونٹ میں جمع کروا کہ اپنا ایڈریس اسی نمبر پر واٹس اپ یا مسیج میں سینڈ کریں)

مزید معلومات کے لیے: 03225494228 واٹس اپ / موبائل نمبر

بولتی تصویر

تحریر: ملک این اے کاوش۔ سلانوالی، سرگودہا

"رک جاؤ شاہان۔" بنا آواز نکالے زینہ عبور کرتے کاوش کو پیچھے سے اس کی ماں نے پکارا۔

"آخر تم نے اس گھر کو سمجھ کیا لیا ہے۔ یہ گھر ہے کوئی کباڑ خانہ نہیں کہ تمہیں جو چیز بھی ملے اٹھا کر یہاں لے آتے ہو۔"

شاہان کو بچپن سے ہی پرانی چیزیں اکٹھی کرنے کا اشتیاق تھا۔ پورے گھر میں جگہ جگہ اس کی اکٹھی ہوئی چیزیں ملتی تھیں۔ کاوش کا تعلق ایک اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے تھا۔ شاہان کے والد صاحب اپنا بزنس کرتے تھے۔ اس کے دو بھائی تھے۔ دونوں ہی اپنے اپنے کام میں مشغول تھا۔ ایک وہ تھا کہ اسے صرف ایک ہی کام پسند تھا۔ اور وہ تھا پرانی اشیاء کو اٹھا کر گھر میں لانا۔

اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں قد آدم پرانی تصویر تھی۔ یہ تصویر کسی نہایت ہی حسین و جمیل دوشیزہ کی تھی۔ جو مسہری پر ٹیک لگائے براجمان تھی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کا ایک کپ بھی تھا۔ مسہری کے ایک طرف چھوٹا سا ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ جبکہ اس کے ساتھ ہی پانی کا ایک جگ اور ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔ مسہری کے عین اوپر ایک چھوٹی سی تصویر تھی جس میں ایک چھوٹا سا تلاب دکھایا گیا تھا۔ اس تلاب میں ایک کشتی جسے ایک نوجوان چپوؤں کے سہارے چلا رہا تھا۔ دکھایا گیا تھا۔ اس تصویر کو بنانے والے نے ہر وہ رنگ بھر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے یہ تصویر اپنے وقت کی ایک

نایاب تصویر جانی گئی ہو گی۔ لیکن آج یہ تصویر شاہان کو اس کے ایک دوست کے کباڑ خانے سے ملی تھی۔ شاہان نے اپنے شوق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنے شہر کے تین چار بڑے بڑے کباڑیوں سے مراسم بنا لیے تھے۔ جب بھی کوئی پرانی اور نایاب چیز ان کے پاس آتی تو فوراً سے بھی پیشتر شاہان کو کال کر کے مطلع کرتے تھے۔ اور شاہان دیوانہ وار ان کے پاس جا پہنچتا۔

''ماں دیکھئے تو کتنی پیاری تصویر ہے یہ۔'' شاہان نے دونوں ہاتھوں سے جکڑی اس تصویر کا رخ ماں کی طرف کرتے ہوئے کہا۔

''تمہارے کمرے میں ایسی کاٹھ کباڑ کی چیزیں رکھنی کی مزید کوئی گنجائش ہے کیا؟'' شاہان کی ماں نے سر تھام کر صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''ماں جگہ ہویانہ ہو۔ اس نے کونسا جگہ گھیرنی ہے۔ اسے تو دیوار پر لگا دوں گا۔'' شاہان نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''آنے دو ایک بار آج تمہارے ابو کو اگر سارا کاٹھ کباڑ نہ نکلوا کر پھینکا تو پھر کہنا۔'' شاہان کی ماں نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

جواباً شاہان مسکراتا ہوا تصویر لیے اپنے کمرے میں آ گیا۔ گھر کے سارے ہی افراد اس کی ان حرکتوں سے تنگ آ چکے تھے۔ اس کے والد اور بھائیوں نے بارہا چاہا کہ اسے کسی کام پر لگا دیں لیکن مجال ہے اس کے کانوں پر جوں تک رینگ جاتی۔ ایک بار تو اس کے بڑے بھائی اللہ بخش اسے زبردستی اپنے آفس میں لے گئے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد خود ہی اسے گھر چھوڑ گئے۔

شاہان کے بھائی اللہ بخش کا کنسٹرکشن کا کام تھا۔ ہوا یوں کہ وہ اسے آفس میں بٹھا کر اپنے جاری پروجیکٹس کو دیکھنے گیا۔ پیچھے سے کسی ٹھیکیدار کی کال آئی اور اس نے بتایا کہ مزدور لوگ اسے بہت تنگ کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کو معاوضہ کم دیا جاتا ہے۔ ان کے معاوضے میں بڑھوتری کی جائے۔ شاہان نے فوراً لہجہ بدلا اور بھائی کی آواز نکالتے ہوئے بولا:

''تو تم ان کے معاوضے میں بڑھوتری کیوں نہیں کر رہے ہو؟''

شاہان کے سوال پر ٹھیکیدار کلبلا کر رہ گیا۔ ''سر آپ

نے خود ہی تو ان کے معاوضے کی لسٹ تیار کر کے بھجوائی تھی۔ بھلا میں کہاں ان میں کمی بیشی کر سکتا ہوں۔"

ٹھیکیدار نے اضطرابیت سے جواب دیا۔ اسے شاہان کی بات پر شدید غصہ آرہا تھا۔ اس کا اندازہ شاہان کو اس کے بولنے سے ہی ہو گیا تھا۔

"اچھا اچھا ٹھیک ہے۔ زیادہ وضاحتیں نہ دو مزدور لوگ جتنی کہتے ہیں ان کے معاوضے میں اتنی بڑھوتری کر دو۔" شاہان نے تحکمانہ لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن سر اس طرح تو۔" ٹھیکیدار ہکلاتے ہوئے بولا۔ لیکن اس کے جملہ پورا کرنے سے پہلے ہی شاہان نے اسے ٹوک دیا۔

"کیا لیکن ویکن کیے جارہے ہو۔ سمجھ نہیں آرہی کیا تمہیں۔ لگتا ہے ٹھیکیداری سے ہٹانا پڑے گا۔ جو کہا ہے وہ کرو۔"

اس کا جواب سنے بنا ہی شاہان نے کال منقطع کر دی۔ عین اس وقت جب وہ کریڈل پر ہاتھ دھرے زیر لب مسکرائے جارہا تھا۔ اس کے بھائی اللہ بخش کی سیکرٹری اس کے روم میں داخل ہوئی۔

شاہان نے اسے نگاہ بھر کر دیکھنا شروع کر دیا۔ سیکرٹری اس کے دیکھنے کے انداز سے جھینپ سی گئی تھی۔ وہ کسی کام سے آئی تھی لیکن اس کی تو جیسے زبان ہی گنگ رہ گئی تھی۔ اس کے مائنڈ میں یہی تھا کہ اندر آفس میں شاہان کا بھائی براجمان ہو گا لیکن شاہان کو دیکھ کر اس کی حیرت ہویدا ہو گئی تھی۔

"آیئے بیٹھئے نہ۔" شاہان نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نہ چاہتے بھی سیکرٹری کو اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھنا پڑ گیا۔

"فرمایئے۔ کیسے آنا ہوا میرے آفس میں؟"

"سر میں اللہ بخش صاحب کی سیکرٹری ہوں۔" سیکرٹری نے اپنا تعارف کرواتے ہوئے کہا اور ہاتھ میں پکڑی فائل ٹیبل پر رکھ دی۔

"سر میرا نام رخسانہ ہے۔"

"ارے واہ۔ اتنی خوبصورت دوشیزہ اور وہ بھی میرے بھائی کی سیکرٹری۔" شاہان زیر لب بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"سر آپ نے کچھ کہا؟" سیکرٹری نے پوچھا۔

”ہاں۔ نہیں وہ میں کہہ رہا تھا کہ اگر آپ میرے بھائی کی سیکرٹری ہیں تو میری بھی سیکرٹری ہوئی ناں۔“ شاہان کی وہیل چیئر سے ٹیک لگا کر جھولتے ہوئے کہا۔

”آف کورس سر۔“ سیکرٹری نے تھوک نگلتے ہوئے جواب دیا۔

”تو آپ کے ذمہ اس کمپنی کے کون کون سے کام ہیں؟“ شاہان نے آگے ہو کر دونوں ہاتھوں کی کہنیاں ٹیبل پر ٹکا کر اپنی ٹھوڑی دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں جماتے ہوئے پوچھا۔

”سر میں ایک ضروری کام سے آئی ہوں۔ اگر فوراً اس پر عمل درآمد نہ کیا گیا تو کوئی مسئلہ پیدا ہو سکتا ہے۔“ سیکرٹری نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے اپنے آنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہا۔

”ایسا بھی کونسا کام ہے۔ کیا کوئی عفریت نازل ہو گئی ہے؟“ شاہان غصے سے پیچ و تاب کھا کر بولا اور دوبارہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آگے پیچھے جھولنے لگا۔

”اللہ بخش صاحب نے جس پروجیکٹ کو پایہ' تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ہے۔ اس پروجیکٹ پر کام کرنے والے ملازموں نے ہڑتال کر دی ہے۔ یہی نہیں انہوں نے ٹھیکیدار کی بھی اچھی خاصی درگت لگائی ہے۔ اللہ بخش صاحب کال پک نہیں کر رہے۔ ایسا نہ ہو کوئی بڑی مصیبت سامنے آ جائے۔“ سیکرٹری نے پریشان کن لہجے میں جواب دیا۔

”ارے تم اتنی چنتا کیوں کر رہی ہو۔ یہ کام میرے بھائی کا ہے وہ خود ہی سنبھال لے گا۔ تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم ابھی تک سنگل ہو یا سنگل ہی ہو؟“ شاہان نے اس سے پوچھا۔

شاہان کے سوال پر سیکرٹری حیران و ششدر رہ گئی۔ ایک طرف اس کے بھائی کا سب کچھ داؤ پر لگا ہوا تھا اور دوسری طرف یہ صاحب بہادر اس کا بائیو ڈیٹا پوچھنے پر تلا ہوا تھا۔

عین اسی وقت دروازہ کھلا اور شاہان کا بھائی اللہ بخش غصے سے پیچ و تاب کھاتا اندر داخل ہوا۔

”مجھے یہ بتاؤ ٹھیکیدار انعام کو تم نے کہا ہے کہ مزدوروں کے معاوضے میں بڑھوتری کر دو؟“ اللہ بخش نے اندر داخل ہوتے ساتھ پوچھا۔

اس سے قبل کہ شاہان اس کی بات کا کوئی جواب دیتا اس کا بھائی سیکرٹری کی طرف متوجہ ہوا۔
"اور تم یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو۔ تمہیں پتہ ہے کہ کتنی پرابلم پیدا ہو چکی ہے۔ مزدوں نے نہ صرف ہڑتال کر دی ہے بلکہ ٹھیکیدار انعام کو بری طرح سے زدوکوب بھی کیا ہے؟"
اللہ بخش کی بات سن کر اس سے قبل سیکرٹری کوئی جواب دیتی۔ شاہان بول پڑا۔
"ارے بھائی جان کیا اتنی خوبصورت دوشیزہ سے ایسے بات کرتے ہیں۔ دیکھیئے تو اس کے چہرے کی سرخی ماند پڑنے لگی ہے۔"
شاہان کی بات سن کر جہاں سیکرٹری حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر رہ گئی وہیں اس کا بھائی بھی اسے کھا جانے والی آنکھوں سے گھورنے لگا۔
"تم جانتے ہو تم نے کیا کیا ہے؟" شاہان کے بھائی نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔
"تمہاری کال پر اس نے مزدوروں کو کچھ بتائے بنا میرے سیل فون پر رابطہ کر کے دوبارہ کنفرم کیا اور جب ساری بات اس نے مجھے بتائی تو میں نے اسے منع کر دیا۔ اس سے قبل کہ وہ مزدوروں کو کوئی جواب دیتا انہوں نے اس پر دھاوا بول دیا۔"
"تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ جب میں نے اسے آرڈر دے دیا ہے کہ وہ ان کے معاوضے میں بڑھوتری کر دے تو آپ نے منع کیوں کیا۔ اس کی موت کے یا اس پر ڈھائے گئے مظالم کے ذمہ دار تو آپ ٹھہرے۔" شاہان نے بھائی کی بات کا جواب دیا۔ پھر سیکرٹری کی طرف متوجہ ہوا۔
کیا نام بتایا تھا تم نے (ذہن پر زور دیتے ہوئے) ہاں رخسانہ۔ تم چپ کیوں بیٹھی ہو۔ بتاؤ اب قصور میرا ہے یا میرے بھائی کا۔ ارے تم چنتا مت کرنا آج سے میں بھی تمہارا باس ہوں۔"
"جسٹ شٹ اپ۔" اس کا بھائی غصے سے تلملا کر بولا۔
"ابھی اٹھو اور چلو میں تمہیں گھر پہنچا کے آؤں تم ایک منٹ بھی مزید یہاں بیٹھنے کے قابل نہیں ہو۔"
"اتنی بھی کیا جلدی ہے۔ ابھی تو ہماری گفتگو کا آغاز ہوا تھا۔" شاہان نے جواباً نرم لہجے میں کہا اور ایک بار پھر سیکرٹری کی طرف متوجہ ہوا۔

”اچھا آپ کے پاس موبائل تو ہو گا۔ کس کمپنی کا نیٹ ورک یوز کر رہی ہیں آپ۔ آئی مین کہ جاز، ٹیلی نار، یوفون، وارد یا پھر زونگ۔ چلیے اپنا نمبر دے دیجیے جو بھی نیٹ ورک ہوا کام چلالیں گے۔“

سیکرٹری اس کی بات سن کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا من کر رہا تھا کہ کوئی چیز اٹھا کر اس کے سر میں دے مارے لیکن پھر غصے سے پیر پٹختی ہوئی آفس سے باہر نکل گئی۔ جبکہ اس کے بھائی نے اس کے بازو سے پکڑا اور تقریباً دھکیلتا ہوا آفس سے باہر لے آیا۔

اس کے بھائی کے آفس کے ساتھ ہی سیکرٹری کا کمرہ تھا۔ جاتے جاتے اس نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا اور زور سے بولا:

”میں پھر آؤں گا انتظار کرنا۔“

اس کے بھائی نے اور زور سے اس کا بازو تھاما سرعت سے اسے گاڑی میں لا بٹھایا۔ جلد ہی وہ اسے گھر چھوڑ کر چلتا بنا۔ جاتے جاتے اس نے ماں کو ساری بات سے آشنا کیا اور بتایا کہ اس کی وجہ سے اسے ایک وقت میں کیسے دو دو پریشانیوں سے نبرد آزما ہونا پڑ رہا ہے۔

------*

شاہان نے اس تصویر کو اپنے بیڈ کے بالکل اوپر لگا دیا تھا۔ تصویر والی لڑکی اتنی خوبصورت تھی کہ شاہان کی نگاہیں اسی پر ٹکی کی ٹکی رہ گئیں۔ یوں اسے کمرے میں لیٹے ہوئے تقریباً دن بیت گیا۔ اور یہ اس کی زندگی کا پہلا واقعہ تھا جب وہ یوں اتنی دیر تک اپنے کمرے میں موجود تھا۔

اس کے بھائیوں اور والد صاحب کے آنے کا وقت ہونے والا تھا۔ اس کی والدہ کو اس کی چنتا ہونے لگی تھی کہ اس سے پہلے تو اس نے اتنا وقت کبھی بھی اپنے کمرے میں نہ گزارا تھا۔ یہی سوچ کر اس کی والدہ کچن سے باہر نکلی اور زینہ عبور کرتی ہوئی اس کے کمرے میں جا پہنچی۔

اگلا منظر دیکھ کر اس کی والدہ حیران و ششدر رہ گئی تھی۔ شاہان ٹکٹکی باندھے بیڈ کے اوپر لگی تصویر کو دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی والدہ نے ایک سرسری نگاہ اس تصویر پر ڈالی لیکن اسے اس تصویر میں سوائے اس بات کے کہ ایک لڑکی مسہری پر چائے کا کپ پکڑے

پاؤں پھیلائے براجمان تھی کوئی خاص بات دکھائی نہ دی۔

شاہان کی والدہ نے حیرت سے اپنے پسر کو دیکھا اور سوچا کہ کہیں یہ اس تصویر والی لڑکی کو جانتا تو نہیں اور ایسا تو نہیں کہ یہ تصویر اس نے خود بنوا کر اپنے کمرے میں لگائی ہو۔ اس خیال کا ذہن میں آنا تھا کہ وہ ٹھٹکی اور آگے بڑھ کر شاہان کو زور سے ہلایا۔ شاہان جو مجنوں کی سی حالت میں دنیا و مافیا سے بے خبر اس تصویر کو تکے جا رہا تھا۔ یوں آناً فاناً جھنجھوڑے جانے پر چونک گیا۔ اور سرعت سے اپنی جگہ بیٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کے سامنے اس کی مبہوت کھڑی والدہ اسے گھورے جا رہی تھی۔

"شاہان یہ سب کیا ہے؟" اس کی والدہ نے تلخ و شیریں لہجے میں پوچھا۔

"کک۔۔۔ کچھ نہیں امی۔۔۔ کیوں کیا ہوا؟" شاہان اپنی والدہ کے سوال پر سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"کون ہے یہ لڑکی؟" اس کی والدہ نے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس کی تصویر جب سے تم نے کمرے میں لگائی ہے تم اپنے کمرے سے باہر بھی نہیں آئے؟"

شاہان کے پاس اپنی ماں کے کسی سوال کا کوئی جواب ہوتا تو دیتا۔ اس نے چپ سادھے رکھی۔

"ابھی اتارو اس تصویر کو اور پھینک آؤ کہیں۔ وگرنہ تمہارے ابو اور بھائیوں کو کہلوا کر اسے باہر پھینکوا دوں گا۔"

"ماں آپ بھی نہ؟" بالآخر شاہان نے تنگ کر کہا۔ "اس تصویر کے میرے کمرے میں ہونے سے کونسا کوئی مصیبت آ جائے گی۔ یہ تصویر ہی ہے نہ کوئی لڑکی تو نہیں جسے اٹھا کر میں نے کمرے میں لٹکا دیا ہے۔"

"لیکن جب سے تم اس تصویر کو لے آئے ہو تم اپنے کمرے سے باہر بھی نہیں نکلے" شاہان کی والدہ نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو آپ کو اور کیا چاہیے۔ آپ کسی بات سے خوش بھی ہوتی ہیں۔ کبھی آپ کا اعتراض ہوتا ہے کہ گھر میں نہیں بیٹھتا اور اگر آج گھر میں رہا ہوں تو اب آپ کا اعتراض ہے کہ میں گھر میں کیوں رہا ہوں۔" شاہان نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا۔

"اگر گھر میں رہتے تو ایسی بات کیوں کرتی تم اپنے کمرے میں مقید ہو کر رہ گئے وہ بھی صرف ایک تصویر کی خاطر۔ ایسی بھی کیا خاص بات ہے اس تصویر میں ہمیں بھی بتاؤ ہم سب گھر والے تمہارے ساتھ اس کمرے میں مقید ہو جائیں گے۔" اس کی ماں جواباً غصے سے بولی اور پیر پٹختی ہوئی باہر نکل گئی۔

"اے کاش تم تصویر کی جگہ حقیقت میں لڑکی ہوتی اور مجھ سے گفت وشنید کر سکتی۔ میں دل کی باتیں تم سے کر سکتا۔" شاہان بیڈ پر ایستادہ ہو کر اس تصویر کو بغور دیکھ کر بولا۔

پھر بیڈ سے نیچے اتر گیا۔ اور باہر جانے کے لیے دروازے کی سمت چل پڑا۔ عین اس وقت اس تصویر کی آنکھیں اس کی پشت پر ٹکی ہوئی تھیں۔ اور جب تک وہ کمرے سے باہر نہ نکلا اس تصویر کی آنکھیں اسی پر مرکوز رہیں۔ اگر شاہان اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ لیتا تو حواس باختہ ہو جاتا۔ اس کے کمرے سے باہر نکلتے ساتھ ہی تصویر کی آنکھیں دوبارہ اپنی جگہ ٹک گئیں۔

------*

شاہان اس وقت بازار سے سودا سلف خرید رہا تھا۔ جب اس کے ایک کباڑیے دوست کی کال آئی۔ اس نے پہلی ساعت میں تو کال یس نہ کی لیکن جب موبائل کی گھنٹی نے دوسری بار اسے متوجہ کیا تو اس نے موبائل کان سے لگا لیا۔

"کیسے ہو شاہان؟" کال یس کرتے ساتھ ہی کباڑیے دوست کی بازگشت نے اس کی سماعت پر دستک دی۔

"ٹھیک ہوں تم سناؤ؟" شاہان نے سامان گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھ کر ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میں بھی ٹھیک ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "کہاں ہوتے ہو یار اب تو چکر بھی نہیں لگاتے جانتے ہو کتنی نایاب چیزیں میں نے جمع کر رکھی ہیں تمہارے لیے۔"

"نہیں دوست اب مجھے مزید کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے ایک ایسی نایاب چیز مل چکی ہے کہ مزید کسی نایاب یا پرانی چیز کی ضرورت باقی نہیں رہی۔" شاہان نے گاڑی گیئر میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ایسی بھی چیز مل گئی ہے تمہیں شاہان؟" اس کباڑیے

نے حیرت سے پوچھا۔

"چھوڑوان باتوں کو۔" شاہان نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ "یہ بتاؤ کام کیسا چل رہاہے؟"

"بہت اچھا چل رہاہے دوست۔ تمہارے لیے نایاب چیزوں کا انبار لگا کے رکھا تھا لیکن تم لینے کے لیے تیار نہیں ہو۔" کباڑیے نے شکوہ کرتے ہوئے کہا۔

"آج کل مجھ پر پابندی لگادی گئی ہے کہ اگر دوبارہ گھر میں کچرہ لائے تو گھر میں موجود ساری چیزیں باہر پھینک دی جائیں گی۔" شاہان نے موڑ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

"شور بہت ہے تمہارے پاس شاہان کہاں ہو تم؟" کباڑیے نے گاڑیوں کے ہارن کی آوازیں سن کر پوچھا۔

"میں بازار سے گھر کا کچھ سوداسلف خریدنے آیا تھا۔ اوراب واپس جارہاہوں۔" شاہان نے جواب دیا۔

"کیا تم میرے پاس سے ہوتے جاؤ گے؟" کباڑیے نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔" شاہان نے صاف جواب دیتے ہوئے کہا۔ "میں گھر کے بہت قریب پہنچ چکا ہوں اور پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔ مزید تھوڑی سی دیر بھی ہو گئی تو فون پہ فون آنا شروع ہو جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے دوست جیسے تمہاری مرضی لیکن میں پھر بھی تمہارے لیے ان چیزوں کو سنبھال کر رکھوں گا۔" کباڑیے نے کہا۔

"جیسے ہی وقت ملا میں ضرور آؤں گا دوست۔" شاہان بولا۔ پھر دونوں کے درمیان دوچار ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں اور کال منقطع ہو گئی۔

کال منقطع ہوتے ساتھ ہی شاہان نے موبائل ڈیش بورڈ پر رکھا اور گاڑی سپیڈ بڑھادی۔ وہ جلد سے جلد اپنی تصویر والی محبوبہ کے پاس پہنچنا چاہتا تھا۔

------*

شاہان بالکل ہی دیوانہ ہو چکا تھا۔ اسے ایک تصویر سے عشق ہو گیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ تصویر کسی کیمرے وغیرہ سے نہیں بنائی گئی بلکہ کسی مصور کی قلم کا کمال تھا اسے اس تصویر سے بے پناہ محبت ہو چکی تھی۔

شاہان گھنٹوں اس تصویر سے باتیں کرتا تھا۔ یہ جانتے

ہوئے بھی کہ اس تصویر نے اس کی کسی بات کا کیا جواب دینا ہے۔ لیکن ایک امید تھی اس کے سینے میں کہ ایک نہ ایک دن یہ تصویر اس سے ضرور بات کرے گی۔ وہ بھی شاہان سے اپنی محبت کا اظہار کرے گی۔

دوسری طرف شاہان کے گھر والے اس کی اس حالت سے بے حد پریشان تھے۔ ایک بار انہوں نے اس تصویر کو اس کے کمرے سے ہٹانے کی سعی کی تھی لیکن شاہان نے انہیں دھمکی دی تھی کہ اگر تصویر کو اس کے کمرے سے ہٹایا گیا تو وہ اس تصویر کو لے کر ہمیشہ کے لیے دور۔۔۔ بہت دور چلا جائے گا۔ اس کے گھر والوں نے چپ سادھ لی تھی۔

اس کی حالت پاگلوں سے بھی ابتر ہو چکی تھی۔ اس کے گھر والے اس کی حالت دیکھ کر بہت پریشان تھے۔ وہ کسی طرح اس تصویر کو اس کے کمرے سے باہر نکلوانا چاہتے تھے لیکن وہ شاہان کی ضد سے بھی آشنا تھے کہ اگر انہوں نے رتی برابر بھی سختی کی تو شاہان حقیقت میں اس گھر کو چھوڑ چھاڑ کر کہیں چلا جائے گا۔ اور یہی بات ان کی برداشت سے باہر تھی۔

ایک شام شاہان اپنے کمرے میں اپنے بیڈ پر دراز اسی تصویر کو تکے جا رہا تھا۔ موسم کروٹ بدل چکا تھا۔ کالے بادلوں نے آسمان کو چھپا دیا تھا۔ بجلی کی چمک اور بادل کی گرج نے ماحول کی خوفناکیت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ شاہان کی آنکھوں میں اتھرو بھر آئے تھے۔

شاہان اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ عین اس وقت شاہان کو اس تصویر والی لڑکی پر بہت پیار آیا۔ شاہان کی آنکھوں میں اتھرو بھر آئے تھے۔ آنسو بھری آنکھوں سے شاہان نے اس تصویر کی طرف دیکھا۔ شاہان کو اس تصویر میں کوئی تبدیلی دکھائی نہ دی۔ شاہان دوبارہ بیڈ پر آ کر براجمان ہو گیا۔ اس کی نگاہیں بدستور اس تصویر پر مرکوز تھیں۔

''کیا تم کبھی بھی نہیں بولو گی؟'' شاہان نے نم آلود لہجے میں تصویر کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''اے کاش کہ تم کبھی بول پڑتی۔ میری تنہائیوں کو دور کرتی۔ میں تم سے کتنی باتیں کرتا ہوں۔ کاش کہ تم بھی مجھے کسی

بات کا جواب دے دیتی۔"
"کیا تم واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو؟" شاہان جو سر جھکائے بری طرح سے رو رہا تھا۔ اچانک اس کی سماعت سے نسوانی آواز ٹکرائی۔
شاہان نے سرعت سے اس تصویر کی طرف دیکھا لیکن اپنا وہم سمجھ کر سر جھکا لیا۔
"میں نے کچھ پوچھا ہے؟"
ایک بار پھر آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ اب کی بار آواز پہلے سے زیادہ مترشح تھی۔ شاہان کو یقین ہو گیا تھا کہ اس نے کوئی آواز سنی ہے۔ اس نے چہار سو نگاہیں دوڑائیں پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی نگاہیں تصویر پر ٹک سی گئیں۔
اسے یوں لگا جیسے تصویر میں بنی لڑکی نے آنکھیں جھپکی ہوں۔ شاہان نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھیں مسلیں اور بغور اس تصویر والی لڑکی کو دیکھنے لگا۔
"کیا تمہیں ابھی تک یقین نہیں ہو رہا؟"
اب کی بار شاہان کو یقین ہو گیا تھا کہ آواز اسی تصویر والی لڑکی کی ہی ہے کیونکہ شاہان نے اس کے ہونٹوں میں ہوتی جنبش دیکھ لی تھی۔ شاہان سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔
"کیا تم واقعی بول سکتی ہو؟" شاہان نے بے یقینی سے اس تصویر کو تکتے ہوئے پوچھا۔
"اگر نہ بول سکتی تو تمہارے سوالوں کے جواب کیسے دیتی۔" ایک بار پھر اس تصویر کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی اور اس نے شاہان کی بات کا جواب دیا۔
"اگر تم بول سکتی تھی تو پہلے کیوں نہ بولی؟" شاہان نے شکوہ کناں لہجے میں پوچھا۔ "میں نے کتنی ہی باتیں تم سے کی تھیں۔ اپنے دل کی ہر بات تمہارے سامنے کی تھی۔ اس کے باوجود تم نے کسی بات کا جواب دینا بہتر نہ سمجھا تھا۔"
شاہان کا غصہ عروج پر تھا۔ اس کی بات سن کر تصویر والی لڑکی زیر لب مسکرا دی تھی۔ اس نے ایک محبت بھری نگاہ سے شاہان کو دیکھا۔
"چلو آج تو جواب دے دیا ہے نہ۔" تصویر والی لڑکی نے جواب دیا۔
"کیا تم تصویر سے باہر بھی نکل سکتی ہو؟" شاہان نے پوچھا۔

”ہاں۔“لڑکی نے جواب دیا۔”لیکن اس تصویر سے باہر نکلنے کے لیے بہت کٹھن حالات سے دوچار ہونا پڑ سکتا ہے۔“

لڑکی کا جواب سن کر شاہان حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو گیا۔اس نے انگشت بدنداں ہو کر اس تصویر والی لڑکی کو دیکھا۔”میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا؟“

شاہان نے کہا۔”مطلب مترشح ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ میں اس تصویر کی قید سے آزاد ہو جاؤں تو تمہیں میرا ساتھ دینا ہو گا۔“

”کیسا ساتھ؟“شاہان نے پوچھا۔

”کیا تم وعدہ کرتے ہو کہ میرا ساتھ دو گے؟“ تصویر والی لڑکی نے پوچھا۔

”جب تم بول سکتی ہو۔جنبش کر سکتی ہو تو پھر ایسی کونسی خاص بات باقی رہ گئی ہے کہ تم اس تصویر سے باہر نہیں نکل پا رہی؟“شاہان نے حیرت کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر پوچھا۔

”یہ چند برس پہلے کی بات ہے۔جب میں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ چکی تھی۔“تصویر والی لڑکی نے اپنی کہانی سنانا شروع کی۔اور پھر ایک ایک لفظ شاہان کو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن کرتا چلا گیا۔شاہان کو اپنی سماعت پر وشواس نہیں ہو رہا تھا۔اس لڑکی کی کہانی کا ایک ایک لفظ شاہان کے دل پر ثبت ہوتا جا رہا تھا۔

۔۔۔۔۔۔*

”مہوش۔“مہوش جو اپنی دھن میں چلی آ رہی تھی اسے پیچھے سے راجو کی بازگشت سنائی دی تو وہ نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئی۔

”کتنی دیر سے آوازیں دے رہا ہوں۔پتہ نہیں تم کہاں کھوئی ہوئی ہو؟“

راجو کی بات سن کر مہوش نے حیرت و غصے کے ملے جلے تاثرات سے اسے دیکھا۔

”راجو بھلا یہ کوئی طریقہ ہے بات کرنے کا۔ سر راہ اگر تم اس طرح مجھے پکارو گے تو لوگ باتیں بنائیں گے۔“مہوش نے غصے سے جواب دیا۔

”تو کیا تم ڈرتی ہو ان لوگوں سے۔ارے پاگل ہم محبت کرتے ہیں۔“راجو نے مہوش کی بات سن کر جواب دیا۔

''ہاں میں ڈرتی ہوں۔کیونکہ میں تمہاری طرح لڑکا نہیں ہوں۔ہم محبت کرتے ہیں تو یہ کوئی کمال نہیں دنیا میں ہر وہ انسان محبت کرتا ہے جو بلوغت کی حدود کو چھوتا ہے۔''مہوش نے جواب دیا۔

''تم کہنا کیا چاہتی ہو؟''راجو نے اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

''تم دیکھ رہے ہو نہ کہ ہر کس و ناکس کی نگاہیں ہم پر ہی مرکوز ہیں۔اب خود سوچو اگر کل کو کوئی ہم پر انگلی اٹھائے تو بے عزتی کس کی ہو گی تمہاری یا میری۔ اور میرے گھر والے میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔''مہوش نے رکتے ہوئے پوچھا۔

اسے رکتا دیکھ کر راجو بھی رک گیا۔وہ حیرت بھری آنکھوں سے مہوش کو دیکھ رہا تھا جو بات کرتے کرتے اچانک رک گئی تھی۔

''میں اپنے والدین کا سر نیچا ہوتا نہیں دیکھ سکتی۔اگر تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے تو کل کا سورج طلوع ہونے سے قبل گھر والوں کو بھیج دینا میرے گھر رشتہ مانگنے وگرنہ دوبارہ کبھی بھی میرے راستے میں مت آنا۔میں اپنی محبت کی قربانی تو دے سکتی ہوں۔لیکن میرے والدین کا سر نیچا ہو میں یہ کبھی بھی برداشت نہیں کر سکتی۔''

مہوش بات مکمل کر کے سرعت سے آگے بڑھ گئی جبکہ راجو اپنی جگہ ساکت و صامت ایستادہ اسے جاتے دیکھتا رہ گیا۔مہوش کی بات ٹھیک ہی تھی۔ راجو نے بھی مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ کچھ بھی ہو جائے وہ آج ہی اپنے گھر والوں کو مہوش کے گھر بھیجے گا۔وہ مہوش کی ضد سے بخوبی آشنا تھا۔وہ جانتا تھا کہ مہوش ایک بار جس بات پر بضد ہو جائے پھر دنیا بے شک ادھر کی ادھر ہو جائے وہ اپنی بات سے نہیں ہٹتی۔

------*

مہوش کو یقین بھی نہیں تھا کہ راجو اپنے گھر والوں کو اس کے ہاں رشتہ مانگنے کے لیے بھیجے گا۔لیکن ابھی شام کے دھندلکے پوری طرح سے ہر چیز پر قابض نہیں ہوئے تھے کہ راجو کے والدین اور راجو کی بہن اور بہنوئی اس کا رشتہ مانگنے آ گئے۔

مہوش کو یقین نہیں ہو پا رہا تھا۔وہ راجو کو بھی عام لڑکوں کی طرح ٹائم پاس سمجھتی تھی۔جو وقت گزاری کے لیے اس کے ساتھ مراسم قائم کیے ہوئے

تھا۔بے شک آج تک اس نے اسے چھوا تک نہ تھا لیکن پھر بھی وہ اس کی طرف سے بددل ہی رہتی تھی۔ راجو کے والدین اوراس کی بہن اور بہنوئی کو دیکھ کر مہوش سرعت سے اپنے کمرے میں بھاگ آئی تھی۔تھوڑی ہی دیر میں اس کی والدہ اس کے پیچھے اس کے کمرے میں آئی تھی۔اتفاق سے مہوش کے سارے گھروالے آج گھرپر تھے۔

کوئی بھی راجو کے والدین کو نہ جانتا تھا لیکن سب ان سے بہتر طریقے سے پیش آئے تھے۔جب انہوں نے آنے کی وجہ بیان کی تو مہوش کے والدین پہلے تو حیران ہوئے پھر اس کی والدہ اس کی رضامندی معلوم کرنے اس کے کمرے میں آئی۔اس وقت مہوش اپنے کمرے میں بیڈ پر دراز تھی۔یکبارگی اپنی ماں کو کمرے میں آتا دیکھ کر وہ اٹھ کر بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی تھی۔

"بیٹی۔"اس کی ماں نے اس کے پاس بیڈ پر براجمان ہوتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔"تم نے اتنی بڑی بات ہم سے کیوں چھپائے رکھی؟"

ماں کی بات سن کر مہوش نے اضطرابیت بھرے لہجے میں ماں کی طرف دیکھا۔

"چنتا مت کرو۔راجو کے والدین نے ہمیں ساری بات بتادی ہے۔اگر تم بھی ہمیں یہ بات بتا دیتی تو ہم تمہاری بات کے سامنے سر تسلیم خم کرتے۔لیکن پھر بھی ہمیں خوشی ہوئی ہے کہ ہماری تربیت کا یہ نتیجہ ہے کہ شرم وحیا نے ہماری دختر کے منہ کو کھلنے نہیں دیا۔"

"امی۔"مہوش خوشی سے سرشار ہو کر ماں کے گلے لگ گئی۔

"میری بچی۔بس میں تمہاری رضامندی پوچھنے آئی تھی۔مجھے میرے سوال کا جواب مل گیا ہے۔آگے تمہارا مقدر۔اللہ تمہارا بہتر مقدر بنائے۔"مہوش کی ماں اسے دعائیں دیتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ مہوش اور راجو کا رشتہ طے ہو گیا تھا۔راجو کے والدین نے مہوش کو جلد ہی اپنی بہو بنانے کا کہا تھا۔بھلا مہوش کے والدین کو کیا اعتراض ہوتا۔

------*

راجو شہر کا ایک مشہور مصور تھا۔اس کی مصوری کے چرچے جہاں بھر میں گونجتے تھے۔راجو بے شک کم

عمری میں تھا لیکن اس کی مصوری نے اسے بڑی عمروں کے مصوروں سے نایاب کر دیا تھا۔ راجو کے نام سے مہوش کے والدین بھی آشنا تھے۔ لیکن انہوں نے ابھی تک اسے دیکھا نہیں تھا۔ یہ ان کے لیے بھی اعزاز کی بات تھی کہ ان کی دختر کی شادی ایک انٹرنیشنل مصور سے ہونے جا رہی تھی۔ مہوش جو اس وقت اپنے روم میں سنگھار شیشے کے سامنے براجمان بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ اسے اچانک موبائل کی بیل نے چونکا دیا۔ اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا تو سکرین پر راجو کا نمبر تھا۔ اس نے سرعت سے کال یس کی اور موبائل کان سے لگا لیا۔

"السلام علیکم!" مہوش نے مؤدبانہ لہجے میں سلام دیا۔

"وعلیکم السلام۔" راجو نے اس کے سلام کا جواب دیا۔ "کیا تم آج مجھ سے مل سکتی ہو؟" راجو کے سوال پر مہوش انگشت بدنداں رہ گئی۔ "کیوں خیرت تو ہے ناں؟" مہوش نے پوچھا۔ "ہاں خیریت ہی ہے۔ بتاؤ نہ فری ہو کہ بزی؟" راجو نے استفسار کرتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال تک تو فری ہوں۔" مہوش بولی۔

"تو کیا میں آجاؤں۔ ایک بہت ہی ضروری کام ہے؟" راجو نے پوچھا۔

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہے۔ شام کے اس وقت تم میرے گھر میں میرے کمرے میں آؤ گے تو میرے والدین کیا سوچیں گے۔ اول تو وہ تمہیں میرے کمرے میں آنے ہی نہیں دیں گے۔" مہوش نے حیرت سے کہا۔

"وہ تم مجھ پر چھوڑ دو دیکھنا میں کیسے آتا ہوں۔" راجو نے جلدی سے جواب دیا۔

"نہیں کوئی مسئلہ بن جائے گا۔" مہوش نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

"کچھ نہیں ہو گا پلیز۔" راجو نے بضد لہجے میں کہا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو۔" مہوش بولی۔

"میں آرہا ہوں۔ تمہارے گھر کی بیرونی سائیڈ سے آؤں گا۔ کمرے کا دروازہ کھلا رکھنا۔" راجو نے اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے کہا اور مہوش کی بات سنے بغیر کال منقطع کر دی۔

مہوش کا راجو کی بات سن کر برا حال ہو گیا تھا۔ اس کے

ہاتھ پیر پھول گئے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کرے تو کیا کرے۔ عین اسی وقت اس کی ماں چائے لیے اس کے کمرے میں آ گئی۔

''کیا بات ہے بیٹا آج کمرے میں ہی مقید ہو کر رہ گئی ہو؟'' اس کی ماں نے چائے کا کپ بیڈ کے ساتھ رکھے چھوٹے سے ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

اس ٹیبل پر پہلے سے ہی جگ گلاس پڑا ہوا تھا۔ گلاس کو اس کی والدہ نے تھوڑا اور آگے سرکا کر جگ کے پاس رکھ دیا تھا۔

''کچھ نہیں امی۔ بس ایسے ہی۔'' اس نے بالوں کو اچھی طرح کلپ کی زد میں جکڑتے ہوئے جواب دیا۔

''اچھا یہ چائے لے آئی تھی تمہارے لیے۔'' اس کی ماں نے کہا۔

''ٹھیک ہے امی۔'' مہوش نے جواب دیا۔ ''چائے پی کر میں سو جاؤں گی نیند بہت آئی ہے۔''

''خیریت تو ہے نہ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہی ہے نہ بیٹا؟'' اس کی ماں نے اس کی نبض چیک کرتے ہوئے پوچھا۔

''امی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ بس آج تھکاوٹ سی ہو گئی ہے اور نیند بہت آ رہی ہے۔'' مہوش نے سفید جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔

''چلو کوئی بات نہیں میری بچی تم آرام کرو۔'' اس کی ماں اس کی گال تھتھپاتے ہوئے بولی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

عین اسی وقت راجو کمرے میں داخل ہوا۔ مہوش نے اسے سنگھار شیشے میں ہی دیکھ لیا تھا۔ اس کا دل دھک سے حلق کو آن لگا تھا۔ وہ رب کا شکر ادا کر رہی تھی کہ شکر ہے اس کی ماں کو پتہ نہیں چلا۔ راجو اندر کیا آیا مہوش نے جلدی سے دروازہ کو اندر سے مقفل کر دیا۔

''تم بہت بڑے مورکھ ہو۔ اگر کسی کو بھنک بھی پڑ گئی تو جانتے ہو قیامت برپا ہو جائے گی۔'' مہوش نے غصے سے تلملاتے ہوئے کہا۔

''کچھ نہیں ہو گا۔ میں بس تمہارے لیے شادی کا ایک تحفہ تیار کرنا چاہتا ہوں۔'' راجو نے جواب دیا۔

''کیا مطلب؟'' مہوش نے انگشت بدنداں ہو کر پوچھا۔

"مطلب یہ کہ میں تمہاری ایک تصویر بنانا چاہتا ہوں۔ایک یادگار تصویر جو شادی کے بعد میں تمہیں گفٹ کروں گا۔"راجو نے ساتھ لائے سامان کو سنگھار پر جوڑتے ہوئے کہا۔

سامان کیا تھا۔کچھ کلرز اور برش،ساتھ میں ایک چارٹ جو لکڑی کے ایک تختے پر فٹ کیا ہوا تھا۔

"شادی کے بعد بھی تو تصویر بنائی جا سکتی تھی؟"مہوش نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تصویر ایک اسپیشل تصویر ہو گی۔جو میں تمہیں شادی کی یادگار کے طور پر گفٹ کروں گا۔"راجو نے ایک ڈبیہ کے ڈھکن میں کلر اور مٹی کا تیل مکس کرتے ہوئے کہا۔

"تم ایسا کرو اس بیڈ پر ٹیک لگا کر پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاؤ۔"

راجو کا لہجہ تحکمانہ تھا۔لیکن اس کے انداز میں سختی نہ تھی۔

"چائے پیو گے کیا؟"مہوش نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں یہ کپ بھی اٹھالو۔ایک نیا رنگ اور نیا نکھار پیدا ہو جائے گا۔"راجو نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

مہوش اس کی بات سن کر زیر لب مسکرا دی اور کپ اٹھا کر چسکیاں بھرنے لگی۔راجو نے قلم تھام لیا اور کبھی مہوش کو دیکھتا اور کبھی قلم چلاتا۔اس نے تصویر کیسی بنائی تھی اچھی یا بہت اچھی۔لیکن اس نے تصویر مہوش کو اس کے بے حد اصرار پر بھی نہ دکھائی۔مہوش کا تصویر دیکھنے کو بہت من کر رہا تھا لیکن راجو سب کچھ سنبھالتا جس راستے سے آیا تھا اسی راستے سے نو دو گیارہ ہو گیا تھا۔

------*

رات کے پچھلے پہر کا وقت تھا۔مہوش اس وقت گھوڑے بیچ کر سو رہی تھی۔یکبارگی اس کے کمرے کی لائٹ آن ہو گئی۔لائٹ کیا آن ہوئی اس کی یک لخت آنکھ کھل گئی۔

کمرے کی جلتی لائٹ دیکھ کر اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن کمرے میں اس کے سوا کوئی نہ تھا۔یہی نہیں کمرے کی چٹخنی بھی اسی طرح لگی ہوئی تھی جیسے وہ لگا کر سوئی تھی۔اس کی حیرت ہویدا ہوئی۔اسے اچھی

طرح سے یاد تھا کہ سوتے وقت اس نے خود لائٹ آف کی تھی۔
"شاید میں نے لائٹ آف نہ کی ہو۔" مہوش سر جھٹکتے ہوئے زیر لب بڑبڑائی۔
پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر لائٹ آف کرنا چاہی لیکن اگلا منظر دیکھ کر اس کے پیروں تلے زمین سرک گئی۔ لائٹ کا بٹن اوپر تھا۔ جس کا مطلب تھا کہ اس نے واقعی لائٹ آف کی تھی۔ اس نے ایک دوبار بٹن کو اوپر نیچے کیا لیکن بے سود۔ پھر اس نے باقی بٹن اوپر نیچے کیے سارے بٹن کام کر رہے تھے۔
اس نے سوچا کہ شاید یہ بٹن لوز ہو گیا ہے۔ اسے شدید غصہ آیا کہ وہ لائٹ آف کر کے سونے کی عادی تھی۔ اب ساری رات کروٹیں بدلنے میں بیت جائے گی۔ نیند سارا دن اسے ستائے گی لیکن اب کیا کیا جا سکتا تھا۔
مہوش ابھی ٹھیک سے لیٹی بھی نہ تھی کہ لائٹ ٹمٹمانے لگی۔ اس کا دل دھک سے حلق کو آن لگا۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اس کا حلق تھا کہ خشک ہوئے جا رہا تھا۔ یکبارگی لائٹ ٹمٹمانا ٹھیک ہو گئی۔ مہوش نے شکر کا کلمہ ادا کیا۔
وہ جیسے ہی دوبارہ لیٹنے لگی اس کی نگاہ سامنے صوفے پر پڑی۔ اگلا منظر دیکھ کر تو اس کے حواس باختہ ہو گئے تھے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اسی کی عمر کی ایک نہایت ہی حسین و جمیل دوشیزہ براجمان تھی۔ وہ دوشیزہ اسے ٹکٹکی باندھے تکے جا رہی تھی۔
مہوش کبھی اسے دیکھتی تو کبھی دروازے کی لگی چٹخنی کو۔ مہوش کو اپنا قلب حلق سے ٹکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی رگوں میں دوڑتا لہو منجمد ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کی سانسوں کی روانی بے ترتیب ہونے لگی تھی۔ اس نے بولنا چاہا لیکن یوں لگا جیسے زمین تالو کے ساتھ چپک کر رہ گئی ہو۔ خوف سے اس کے پورے شریر میں جھرجھری سی پیدا ہو گئی تھی۔
"تمہیں زیادہ سوچنے اور مضطرب ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" اچانک صوفے پر براجمان دوشیزہ گویا ہوئی۔
اس دوشیزہ کی آواز یوں لگ رہا تھا جیسے دور کسی گہرے کنویں کی گہرائی سے آ رہی ہو۔ ایک عجیب کا رعب

ودبدبہ اس کے لہجے میں تھا۔یہی نہیں اس کی سرخ خون اگلتی آنکھیں مہوش پر اپنا تسلط جمانے کی سعی کررہی تھیں۔

"میرے لیے تمہارے یہ درودیوار کوئی فوقیت نہیں رکھتے کیونکہ میں تمہاری طرح منش نہیں بلکہ ایک جن زادی ہوں۔"

اس کی بات سن کرتو جیسے مہوش کے ہاتھوں کے طوطے ہی اڑگئے۔ہاتھ پاؤں جیسے پھول گئے تھے۔ جن زادی کا لفظ اس نے کچھ اس ادا سے ادا کیا تھا کہ مہوش اس لفظ کو سنتے ساتھ ہی خوف سے تھر تھر کانپنے لگی تھی۔اس کا من چاہ رہا تھا کہ پلک جھپکتے میں بھاگ کر اس کمرے سے نکل جائے۔لیکن اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے پاؤں کسی نے آہنی زنجیروں میں جکڑ کر رکھ دیئے ہوں۔اس نے مدد کے لیے اپنے والدین کو بلانا چاہا لیکن اس کی زبان تو اس کا ساتھ دینے کے لیے قطعی آمادہ نہ تھی۔ اسے اپنی بے بسی اور بے چارگی پر بے حد ملال ہو رہا تھا۔اس کا من چاہ رہا تھا کہ بلک بلک کر رو دے لیکن رونے سے مصیبتیں دفع دور نہیں ہوا کرتی۔

"مجھے آج مجبوراً تمہارے پاس آنا پڑا کیونکہ تم مجھ سے میری سب سے قیمتی چیز چھیننے والی ہو۔تم جانتی ہو کہ میں بھی راجو کے گھر کے صحن میں لگے قد آدم ٹاہلی کے درخت پر رہتی ہوں۔راجو کو میں بچپن سے بہت چاہتی ہوں لیکن اب جب سے تم اس کی زندگی میں آئی ہو اس کی زندگی میں بہت ساری تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوگئی ہیں۔

وہ کسی اور کو چاہے یہ بات میری برداشت سے باہر ہے۔میں اس کی زندگی میں آنے والی ہر لڑکی کا قلع قمع کر کے رکھ دوں گی کیونکہ میں سب سے زیادہ راجو کو چاہتی ہوں۔آج میں چاہوں تو تمہیں یہیں ابھی اوراسی وقت جلا کر بھسم کردوں لیکن میں ایسا قطعاً نہیں کروں گی۔اس طرح اگر کل کو راجو کو خبر ہوگئی تو وہ مجھ سے نہ صرف بہت نفرت کرے گا بلکہ مجھے اس کی نفرت سہنا بھی پڑے گی۔ میں تمہیں اسی تصویر میں قید کر کے رکھ دوں گی جو تصویر راجو نے تمہیں شادی کے دن گفٹ دینے کا وعدہ کیا ہے۔پھر میں تمہارا روپ دھار کر اس گھر کا فرد بن جاؤں گی۔یہاں کے باسیوں کی نظروں میں

میں مہوش ہی ہوؤں گی لیکن حقیقت میں تم اس تصویر میں قید ہو کر رہ جاؤ گی۔ پھر مہندی کی رات میں زہر کھا کر مرنے کا ڈرامہ رچاؤں گی اور عین اس وقت جب ہر کس و ناکس مجھے دفن کر کے واپس آئے گا۔ میں اپنے جادو کے زور پر اس قبر سے باہر نکل آؤں گی۔

پھر آہستہ آہستہ راجو کے دل میں اپنی محبت کا رس انڈیلنا شروع کر دوں گی۔ ایک دن راجو میرا عادی ہو جائے گا۔ پھر میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے راجو کو اپنا لوں گی اور اسے اپنی دنیا میں لے جاؤں گی۔ جہاں سے دنیا کی کوئی بھی طاقت اسے واپس نہیں لا سکے گی۔ تم یہ مت سمجھنا کہ تم اس تصویر میں قید ہو کر کچھ دیکھ یا سن نہیں پاؤ گی۔ بلکہ تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھو گی بھی اور سنو گی بھی۔ لیکن تمہاری زبان کو ہمیشہ کے لیے مقفل کر دیا جائے گا۔ تمہاری حرکات و سکنات کو ختم کر دیا جائے گا۔

ہاں البتہ ایک وقت ایسا آئے گا جب ایک نوجوان لڑکا جو راجو کا ہی ہمشکل ہو گا۔ اگر تم اس کے سامنے بولو گی تو وہ تمہاری آواز سن سکے گا۔ وہ تم سے محبت کرے گا۔ اگر اس لڑکے نے مجھے شکست دے دی تو تم ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جاؤ گی لیکن اگر وہ ہار گیا تو پھر دنیا کی کوئی بھی شکتی تمہیں کبھی بھی اس تصویر سے بریت نہیں دلا پائے گی۔ یہی نہیں یاد رکھنا اس خوش فہمی میں مبتلا مت ہونا کہ وہ لڑکا مجھے شکست فاش کر سکے گا۔ نہیں میں بہت شکتی شالی ہوں۔ راجو میرا ہے اور میرا ہی رہے گا۔ اور یہ بات بھی ہمہ تن گوش ہو کر سن لو کہ دنیا میں مجھ سے زیادہ شکتی شالی کوئی نہیں ہے۔"

صوفے پر براجمان دوشیزہ نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا تھا۔ اس کی ہر ہر بات مہوش کے اندر خوف کے تاثرات بھر رہی تھی۔ اس دوشیزہ نے اپنی بات ختم کر کے منہ ہی منہ میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے مہوش کو اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مہوش کا جسم بائیں جانب لڑھک گیا دوسرے ہی لمحے مہوش کے بدن نے دھوئیں کا روپ دھارنے لگا اور پھر دھوئیں کی ایک باریک سی لہر کمرے کی کھڑکی کے ادھ کھلے کواڑ میں سے باہر نکلتی دکھائی دینے لگی۔

۔۔۔۔۔۔*

اپنی دکھ بھری روداد سنانے کے بعد جیسے تصویر والی لڑکی ایک بار پھر ساکت وصامت ہو کر رہ گئی تھی۔شاہان ٹکٹکی باندھے جہاں اسے دیکھ رہا تھا وہیں ہمہ تن گوش اس کی آپ بیتی بھی سنے جا رہا تھا۔ شاید ہی کبھی کسی کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ رونما ہوا ہو کہ اس نے ہاتھ سے بنائی گئی پینٹنگ میں دکھائی پڑنے والی لڑکی یا کسی ذی روح کو بولتے دیکھا ہو۔ شاہان کے لیے اس تصویر والی لڑکی کی کہانی کا ایک ایک لفظ حیرت کے سمندر میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھا۔شاہان حیرت کے سمندر میں غوطہ زن سوچے جا رہا تھا۔ کہ اب تک اس نے جو کچھ سنا کیا یہ سب کچھ جاگتی آنکھوں اور کھلے کانوں سے دیکھا اور سنا گیا ہے یا پھر اس کی نظر کا دھوکہ اور وہم ہے۔

”کیا سوچ رہے ہو شاہان۔“

ایک بار پھر وہی پر تاثیر آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو شاہان نے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے آنکھیں مسلتے ہوئے اس تصویر کی طرف دیکھا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے کہیں آنکھوں کا دھوکہ تو نہیں ہے۔“شاہان نے سوالیہ آنکھوں سے تصویر والی لڑکی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں شاہان میں نے جو کچھ تمہیں بتایا ہے اس میں کوئی دروغ گوئی کا عنصر موجود نہیں ہے۔“ تصویر والی دوشیزہ نے اس کی بات کی تصحیح کرتے ہوئے جواب دیا۔

”کیا تم اس تصویر سے بریت حاصل نہیں کر سکتی؟“شاہان نے پوچھا۔

”میں نے بتایا تو ہے کہ اس دوشیزہ نے بتایا تھا کہ وہ انسان جو تمہاری آواز سننے کی شکتی رکھتا ہو گا وہ اگر چاہے تو تمہیں اس تصویر کی قید سے بریت دلا پائے گا۔“تصویر والی لڑکی گویا ہوئی۔

”لیکن کیسے؟“شاہان نے پوچھا۔

”تمہیں کسی طرح راجو کو اس بات پر آمادہ کرنا ہو گا کہ میں زندہ ہوں اور اس جن زادی نے مجھے اس تصویر میں مقید کر دیا ہے۔پھر اگر راجو تمہاری بات پر یقین کر لیتا ہے تو تم لوگوں کو کسی نیک انسان کی خدمات لینا ہوں گی۔اسے ساری بات بتانا ہو گی تب جا کر وہ تمہاری مدد کرے گا۔

اس طرح وہ مجھے اپنے علم کی بدولت ہی اس تصویر کی قید سے بریت دلا پائے گا۔ بصورت دیگر اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھنا راجو سے اس کے گھر میں جا کر ملاقات مت کرنا ورنہ اس جن زادی کو اس بات کا پتہ چل جائے گا اور وہ اس کا ذہن اپنی قید میں کر لے گی۔"

تصویر والی لڑکی نے وضاحت کرتے ہوئے شاہان کو ساری بات بتائی۔ جبکہ شاہان کو اس کی بات سن کر جہاں حیرت ہوئی وہیں پریشانی بھی کہ راجو جو اس وقت ایک مایہ ناز شخصیت بن چکا تھا۔ جس کی مصوری کے چرچے اندرون و بیرون گونج رہے تھے بھلا ایسے انسان سے اتنی آسانی سے ملاقات کیسے ہو سکتی تھی۔ لیکن دوسری طرف اس تصویر والی لڑکی نے شاید اس کا دماغ پڑھ لیا تھا۔

"میں تمہیں اس کا نمبر دیتی ہوں۔ تم ایسا کرو اس سے رابطہ کرو۔ راجو اتنا برا انسان نہیں ہے۔ وہ ایک بار تمہاری بات غور سے سنے گا۔ یہ تم پر depend کرتا ہے کہ تم کیسے اسے اس بات پر راضی کر سکتے ہو کہ میں اس تصویر میں قید ہوں۔"

شاہان اس کی بات سن کر متواتر مضطرب تھا۔ لیکن اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ راجو کو اس بات پر راضی کر لے گا۔

------*

شاہان کو یقین نہیں تھا کہ راجو اس کی بات پر اتنی جلدی یقین کر لے گا لیکن شاہان کی بات سن کر راجو نے کہا کہ:

"مجھے اسی دن ہی یقین ہو گیا تھا کہ مہوش کے ساتھ کوئی مسئلہ بن گیا ہے۔ اس جن زادی نے مہوش کا روپ دھار کر مجھے اپنا گرویدہ کرنا چاہا تھا لیکن مہوش اور اس کے گفت و شنید کرنے میں زمین و آسمان کا تضاد تھا۔"

دونوں اس بات پر متفق تھے کہ وہ آج ہی کسی سے رابطہ کریں گے۔ دوسری طرف راجو جو اس بات سے بہت پریشان تھا کہ اس کی بنائی گئی تصویر اچانک ہی اس کے کمرے سے غائب ہو گئی تھی۔ شاہان کے منہ سے اس تصویر کا سن کر اس نے شاہان سے کہا کہ "مجھے ایک بار اس تصویر کو دکھا دو اس تصویر میں میری محبت مقید ہے۔ کتنا عرصہ بیت گیا

ہے، اپنی محبت کو دیکھے۔"

بات مکمل کرنے تک راجو کی آنکھیں ساون بھادوں ہو چکی تھیں۔ جن آنکھوں میں کبھی مستقبل کے سپنے ہوتے تھے آج انہی آنکھوں میں اشک بھرے تھے۔

------*

راجو نے گھر والوں کو ساری بات بتادی تھی۔ یہی نہیں دوسری طرف مہوش کے گھر والوں کو بھی ساری بات بتادی گئی تھی۔ راجو اور شاہان نے ایک بزرگ کی خدمات حاصل کرلی تھیں۔

اس بزرگ نے راجو کو ایک تعویذ دیا تھا کہ اسے گلے میں پہنے رکھنا تاکہ وہ جن زادی تم پر مسلط نہ ہو پائے۔ پھر اس بزرگ نے ایک اگربتی دی اور کہا کہ گھر کے سارے ممبران کو ایک کمرے میں بٹھا کر اس اگربتی کو جلا دینا۔

جب تک اس کی بساند کمرے میں رہے گی وہ جن زادی اس کمرے تک پہنچنے کی جسارت بھی نہ کر پائے گی۔ بزرگ نے عشاء کی نماز کے بعد آنے کا وعدہ کیا تھا۔ شاہان بھی راجو کے ساتھ ہی اس کمرے میں براجمان تھا۔ جس میں اگربتی لگائی گئی تھی۔ ہر کس و ناکس شاہان کا مشکور تھا۔

شاہان اس وقت خود کو بہت بڑا انسان سمجھ رہا تھا۔ اسے جتنی پذیرائی ملی تھی اس کا اس نے تخیل میں بھی نہ سوچا تھا۔ اس کے کمرے میں لگی مہوش کی تصویر بھی اب یہاں لائی گئی تھی۔

سب چپ سادھے اس تصویر کو دیکھ رہے تھے جس میں مہوش مقید تھی۔ بس ایک شاہان تھا جو آنکھوں کے اشاروں سے مہوش سے بات کر رہا تھا۔ اس کی ہر بات سب سے پوشیدہ تھی۔ وہ آنکھوں کے اشاروں سے مہوش کو تسلی دے رہا تھا کہ وہ جلد ہی اس تصویر کی قید سے بریت حاصل کرنے والی ہے۔

تبھی ڈور بیل کی چیخ نے سب کو چونکا دیا۔ راجو سرعت سے اٹھا اور دروازے کی طرف لپکا جب وہ واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک نہایت ہی باریش اور پر رعب بزرگ تھے۔ جن کے چہرے پر جلال رقصاں تھا۔ سرخ و سپید چہرے نور کی تجلیات مترشح تھیں۔

ان کی تعزیم میں سب ایستادہ ہوگئے تھے۔

بزرگ کو ایک صوفے پر بٹھایا گیا۔ بیٹھتے ساتھ ہی انہوں نے تکلفات سے منع کر دیا۔ انہیں آگے کہیں

جاناتھاجس کی وجہ سے وہ بہت جلدی میں تھے۔

پھراس بزرگ نے سب سے کہا کہ وہ باہر صحن میں آجائیں اوراس تصویر کو بھی صحن میں لے آئیں۔سب سے پہلے بزرگ اس کمرے سے باہر نکلے اور نکلتے ہوئے انہوں نے راجو سے کہا کہ ایک چھری لے کر آؤ۔

راجو کچن میں گھس گیاجبکہ شاہان جو سب سے آخر میں کمرے سے باہر نکلا تھااس نے تصویر اٹھائی ہوئی تھی۔ راجو چھری لے کر آیاتوبزرگ نے سب کوایک جگہ اکٹھابٹھاکران کے گرد چھری سے دائرہ کھینچاساتھ ہی ساتھ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائے جارہے تھے۔ تصویرانہوں نے شاہان سے لے لی تھی۔اسے ایک الگ جگہ رکھ کراس کے گرد بھی دائرہ لگادیاگیا تھا۔پھربزرگ خود بھی ایک دائرے میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔

بزرگ نے سب کو سختی سے منع کیا کہ کیسے ہی حالات کیوں نہ جنم لے لیں کوئی بھی اپنے دائرے سے باہر نکلنے کی تقصیر نہ کرے وگرنہ پیش آنے والے واقعات کا ذمہ داروہ خود ہی ہو گا۔

اس کے بعداس نیک سیرت وصورت بزرگ نے اونچی آواز میں قرآن پاک کی تلاوت کرنا شروع کردی۔

اچانک سب کو یوں لگاجیسے کوئی کچن میں ہواور برتن اٹھااٹھاکر پھینک رہاہو۔برتن پھینکنے کی بازگشت سب کو مترشح سنائی دے رہی تھی۔ان کے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

سب کی نگاہیں کچن کی طرف لگی ہوئی تھیں۔یکبارگی سب نے ایک حیران کن منظر دیکھا۔کچن کے دروازے میں انہیں کوئی شبیہہ دکھائی دی۔پھراس شبیہہ نے انسانی روپ اختیاکیا۔یک لخت ان کے سامنے ایک نہایت ہی حسین وجمیل دوشیزہ ایستادہ تھی۔

اس دوشیزہ کی کھاجانے والی نگاہیں سب پر مرکوزتھیں۔تبھی اس کی سرعت سے گھومتی آنکھوں کی پتلیاں آکرراجوپررک گئیں۔وہ راجو کو متواتر گھورے جارہی تھی۔راجو کواس خبیث لڑکی پر تاؤ چڑھ رہاتھا۔اگربزرگ نے انہیں سختی سے منع نہ کیاہوتاتووہ اٹھ کر جاکراس کی کرچیاں کرچیاں

کر کے رکھ دیتا۔
تبھی اس لڑکی نے سر جھٹکا اور آ کر بزرگ کے سامنے دوزانوں براجمان ہو گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا اور اس بزرگ کا کوئی بہت ہی قریبی سمبندھ ہو۔ لڑکی کے بیٹھنے کی دیر تھی کہ اس بزرگ نے تلاوت ختم کی۔
"اے ظالم! تو نے ایسا گناہ کیوں کیا۔ کیوں ایک مظلوم لڑکی کو ایک تصویر میں مقید کر کے رکھ دیا۔ تم کون ہوتی ہو ایسی جسارت کرنے والی؟" بزرگ نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے پوچھا۔
"میں راجو سے بے پناہ محبت کرتی ہوں اور مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوا کہ میرے علاوہ کوئی اور اس کی زندگی میں آئے۔" اس لڑکی نے نم آلود لہجے میں جواب دیا۔
"پہلے اس مظلوم کو اس تصویر کی قید سے بریت دلاؤ جلدی۔" بزرگ نے اب کی بار تحکمانہ لہجے میں تقریباً دھاڑتے ہوئے کہا۔
بزرگ کی بات سن کر اس دوشیزہ نے اپنے بائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اس تصویر کی طرف کی تو دوسرے ہی لمحے تصویر میں سے دودھیا دھواں باریک لہر کی صورت میں نکلنا شروع ہو گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس دھوئیں نے انسانی روپ دھارنا شروع کر دیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے سب کے سامنے دائرے کے اندر مہوش براجمان تھی۔ جو تصویر کی قید سے بریت حاصل ہونے پر خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی۔ وہ بار بار اپنے جسم کو ٹٹول رہی تھی۔ کبھی وہ تصویر کو دیکھتی اور کبھی خود کو۔ پھر اس نے ایک نگاہ سب پر ڈالی تو اس کی آنکھیں خوشی سے نم آلود ہو گئیں۔
"دائرے سے باہر مت نکلنا بچی۔" بزرگ نے مہوش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جواباً مہوش نے ان کی بات کی تائید میں سر ہلا دیا۔
"کسی کو چاہنے یا حاصل کرنے کا یہ طریقہ تم بھی جانتی ہو کہ غلط ہے۔" اب کی بار بزرگ نے چنداں نرم لہجے میں کہا۔
"محبت میں غلط صحیح کی پہچان ہی کہاں رہتی ہے۔ اندھا کر دیتی ہے یہ محبت۔ آنکھوں میں بینائی ہونے کے باوجود دکھائی کچھ نہیں پڑتا۔ اگر کچھ دکھائی

دیتا ہے تو اپنا آپ۔" اس لڑکی نے گردن جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"تم بھی تو ایک مسلمان جن زادی ہو۔ اگر میں تمہیں ہمیشہ کے اسی تصویر (انگلی سے تصویر میں مقید کر دوں تو تم پر کیا بیتے گی؟" بزرگ نے سوالیہ آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ مجھے ابدی نیند سلا دیں۔" جن زادی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے روتے ہوئے کہا۔

اس کی حالت پر سب کو ہی ترس آ رہا تھا۔ بے شک اس نے بہت بڑا گناہ کیا تھا لیکن اس وقت اس پر سب کو ترس آ رہا تھا۔ خود مہوش جو اس کے لیے دل میں کتنی ہی نفرت لیے ہوئی تھی۔ اسے بھی اس کی حالت پر بہت ترس آ رہا تھا۔

"تم ایک اچھی جن زادی ہو۔ اس بات سے آشنا ہو کہ اگر تم کسی انسان سے محبت کر کے اسے اپناؤ گی تو تمہاری ساری شکتیاں مفقود پڑ جائیں گی۔" بزرگ نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"شکتیاں محبت کے سامنے کوئی فوقیت نہیں رکھتیں۔۔۔ دنیا میں سب سے بڑی شکتی تو ہے ہی محبت۔" اس جن زادی نے متواتر گلوگیر لہجے میں جواب دیا۔

"تو کیا تم واقعی محبت کی خاطر اپنی شکتیوں کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو؟" اب کی بار بزرگ نے چند اس کڑک دار لہجے میں پوچھا۔

لڑکی نے بزرگ کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بس ایک بار اس نے بے بسی اور بے چارگی سے بزرگ کی طرف دیکھا اور پھر نگاہیں جھکا لیں۔ بزرگ اپنی جگہ سے اٹھے اور دائرے سے باہر نکل آئے۔ انہوں نے اس جن زادی کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ جن زادی ان کے قدموں پر گر کر گڑگڑانے لگی۔

"مجھے میری محبت سے دور مت کیجئے گا۔۔۔ خدا کے لیے۔۔۔ میں دوبارہ کبھی بھی ان کے سامنے نہیں آؤں گی۔۔۔ لیکن راجو کی جدائی سہنا میرے لیے ماہی بے آب کی طرح تڑپ تڑپ کر مرنے کے مطابق ہے۔" جن زادی نے اب کی بار دھواں دھار روتے ہوئے کہا۔

"اٹھو بیٹی۔" بزرگ نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

جن زادی بزرگ کی بات سن کر اپنی جگہ پر ایستادہ

ہوگئی۔

"کوئی بھی کام کرنے کا کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ بنا کسی طریقے کے کوئی بھی کام بہتر نہیں لگتا۔" بات مکمل کرنے کے بعد بزرگ دائرے میں براجمان سب کی طرف متوجہ ہوئے۔

"آپ لوگ کمرے میں آیئے۔" حکم دیتے ہوئے بزرگ اس لڑکی کو ساتھ لئے ہوئے اسی کمرے میں چلے گئے جہاں اگربتی لگائی گئی تھی۔ سب یکے بعد دیگرے بزرگ کے پیچھے اس کمرے میں آگئے۔ اب کی بار تصویر کسی نے نہیں اٹھائی تھی۔ وہ ایسے ہی اپنی جگہ دھری کی دھری تھی۔ شاہان تصویر اٹھانے لگا تھا لیکن مہوش نے منع کر دیا تھا کہ مجھے اس تصویر سے ڈر لگتا ہے۔ اسے دوبارہ کمرے میں نہ لانا۔ اس لیے شاہان نے تصویر کو ادھر ہی رکھ دیا تھا۔

سب اس کمرے میں بزرگ کے سامنے مجتمع تھے۔ سب کی سوالیہ نگاہیں بزرگ پر گڑھی ہوئی تھیں جبکہ شاہان بار بار کن آنکھوں سے مہوش کو دیکھ رہا تھا۔ دوسری طرف مہوش کی نگاہیں بھی بار بار شاہان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ نجانے کیوں اور کیسے اسے شاہان میں دلچسپی ہوگئی تھی۔ ویسے بھی شاہان اس کا محسن تھا۔ اس کی وجہ سے اسے ایک نئی زندگی ملی تھی۔ وگرنہ وہ تو تا زیست اس تصویر میں مقید ہو کر رہ جاتی اور ایک دن یہ تصویر اس کی جان لے لیتی۔

"میں آپ لوگوں سے کچھ گزارش کرنا چاہتا ہوں۔" اچانک کمرے کی سکوت زدہ فضا میں بزرگ کی آواز گونجی۔ تو راجو اور مہوش کے والدین سمیت باقی سب نے بھی سوالیہ نگاہوں سے بزرگ کو دیکھا۔

"جو کچھ بھی ہوا۔ آپ لوگوں نے اپنی سماعت سے سنا بھی اور اپنی بینائی سے دیکھا بھی۔ کچھ بھی آپ لوگوں سے پنہاں نہیں ہے۔" بزرگ نے اپنا فقرہ مکمل کر کے سب کی طرف دیکھا تو سب نے ان کی بات سے متفق ہوتے ہوئے ہاں میں سر ہلا دیا۔ جن زادی بزرگ کے پیروں سے چمٹی ہوئی تھی۔ جیسے ابھی تک اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ کہیں اسے راجو سے دور نہ کر دیا جائے۔ اس کا شریر خوف سے بری طرح رائبریٹ کر رہا تھا۔ بزرگ

نے اچانک اپنادست شفقت اس کے سر پر رکھااوراس نے ترحم آمیز نگاہوں سے بزرگ کو دیکھا۔

"بے شک اس لڑکی کا طریقہ غلط تھا۔لیکن پیار اور جنگ میں سیانے کہتے ہیں کہ سب کچھ جائز ہوتا ہے۔میں یہ نہیں کہتا کہ اس نے ظلم نہیں کیا اسے قطعاً ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔لیکن اب اس کے اندر بہت ساری تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔یہ اپنی غلطی کو تسلیم کر چکی ہے۔اب آپ لوگ کیا کہتے ہو اس کی کیا سزا ہونی چاہیے؟"

اب کی بار فقرہ مکمل کرنے کے بعد بزرگ نے صرف مہوش کے گھر والوں کو بغور دیکھا تھا۔بزرگ کی بات سن کر وہ جن زادی مزید زور سے بزرگ کے پیروں سے چمٹ گئی تھی۔اس کی سسکیوں نے خاموش فضا میں گونجنا شروع کر دیا۔

"اگر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو ہم لوگ اسے معاف کرتے ہیں لیکن اس شرط پر کہ یہ دوبارہ ایسی حرکت نہ کرے۔"بزرگ کی بات سن کر مہوش کے والد نے جواب دیا۔

"اگر آپ لوگ واقعی اسے معاف کرتے ہیں تو کیا میرے فیصلے سے آپ لوگ متفق ہوں گے؟" بزرگ نے اپنا دست شفقت ایک بار پھر اس جن زادی کے سر پر پھیرتے ہوئے ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں اس لڑکی کو اپنی دختر بنانا چاہتا ہوں۔"

بزرگ کی بات سن کر سب نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔

"اور اس کے لیے آپ کے پسر راجو کا ہاتھ مانگتا ہوں۔"

تھوڑا توقف کرنے کے بعد اچانک بزرگ بولے تو ان کی بات سن کر ہر کس و ناکس اپنی جگہ ساکت و صامت رہ گیا۔یہی نہیں سسکتی جن زادی بھی حیرت کے سمندر میں غوطہ زن بزرگ کو تکنے لگی تھی۔

"بے شک مہوش اور راجو ایک دوسرے سے بہت پیار کرتے تھے لیکن اب حالات کروٹ بدل چکے ہیں۔مہوش کے دل میں بے شک راجو کے لیے پیار ہے لیکن جتنا پیار اس کے دل میں شاہان کے لیے ہے اتنا راجو کے لیے نہیں ہے۔"

"باباجی یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"شاہان کا والد تقریباً بھڑک کر بولا۔

"ہمارا پسر مہوش سے بہت زیادہ پیار کرتا ہے اور یہ جن زادی بے شک ہم نے اسے معاف کر دیا ہے لیکن ایک جن زادی اور انسان کا کبھی کوئی سمبندھ نہیں بن سکتا۔"

راجو کے باپ کی بات سن کر سب نے ان کی تائید میں سر ہلایا۔

"آپ کو بنا سوچے ایسی بات نہیں کرنی چاہیے۔"اب کی بار مہوش کی والدہ نے لقمہ دیا۔"آپ نے ہماری دختر کو ایک نئی زندگی دی۔ایک مصیبت سے اسے چھٹکارا دلایا لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ اس کے بدلے میں ہم اپنی دختر کی خوشیاں ایک بار پھر قربان کر دیں۔ہماری دختر راجو کو ہی چاہتی ہے اور اس کی شادی راجو سے ہی ہو گی۔رہی بات شاہان کی تو ہم تازیست اس کے مشکور رہیں گے۔"

"نہیں امی۔"والدہ کی بات سن کر مہوش فوراً بولی۔"باباجی درست فرما رہے ہیں۔ایک لمبا عرصہ راجو سے دور رہنے اور شاہان کے ساتھ رہنے سے مجھے شاہان سے بہت پیار ہو گیا ہے۔"

مہوش کی بات سن کر ہر کس و ناکس کے پیروں تلے زمین سرک گئی۔راجو اسے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھور رہا تھا۔اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس کی محبت اس کی نگاہوں کے سامنے اس کی ایسی بے عزتی کرے گی۔

"راجو تم بہت اچھے ہو لیکن مائنڈ نہ کرنا میں اب تم میں انٹرسٹڈ نہیں ہوں۔ہمارے گھر والے اگر ہماری زبردستی شادی کر دیں گے تو میں اف تک نہیں کروں گی لیکن یاد رکھنا میرے دل میں ہمیشہ کے لیے شاہان بس چکا ہے۔"

مہوش نے پاس براجمان راجو کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔اس کی بات سن کر راجو کی آنکھیں نم آلود ہو گئی تھیں۔دوسری طرف شاہان کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے۔وہ متوحش نگاہوں سے کبھی کسی کو دیکھتا تو کبھی کسی کو۔

"مہوش بیٹا۔"مہوش نے والد نے اسے مخاطب کیا۔"تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

مہوش نے باپ کی بات سن کر سر ہلایا گویا وہ اپنے باپ

کی بات کی تصدیق کررہی ہو۔

”جی ابو میں بہت اچھی طرح سے جانتی ہوں۔اتنے عرصے میں میں نے شاہان کو جتنا سمجھا ہے۔راجو کو کبھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ویسے بھی راجو سے مجھ سے زیادہ میری یہ بہن (جن زادی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)پیار کرتی ہے۔“

”جلدبازی کے فیصلے بعد میں پچھتاوے کا باعث بنتے ہیں۔“راجو کی والدہ نے پہلی بار اپنے پسر کی اندرونی کیفیت کو بھانپتے ہوئے مہوش کو مخاطب کر کے کہا۔

”میں جلدبازی نہیں کررہی آنٹی۔میں نے اتنے عرصے میں بہت کچھ سوچ سمجھ لیا تھا۔“مہوش نے جواب دیا۔

”آپ لوگوں کو آپس میں بحث کی بجائے میری بات کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔بچوں کو اپنی مرضی سے جینے کا حق حاصل ہوتا ہے۔اس حق کو چھیننے کا آپ کا کوئی حق نہیں بنتا۔راجو کے لیے میری اس دختر سے بہتر کوئی نہیں ہے۔اور مہوش بیٹی کے لیے شاہان سے زیادہ پیار کرنے والا کوئی نہیں ہے۔“بزرگ نے انہیں آپس میں بحث وتکرار کرتے دیکھ کر کہا تو چاروناچار انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔

شاہان خوشی سے پھولے نہ سمارہا تھا۔دوسری طرف جن زادی بزرگ سے چمٹی نجانے کتنی دیر تک زاروقطار روتی رہی تھی۔اس نے سب کے سامنے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی شکتیوں کو قربان کر کے راجو سے شادی کرلے گی۔اس نے نہ صرف مہوش سے بلکہ وہاں موجود ہر کس وناکس سے معافی مانگ لی تھی۔یہی نہیں شاہان کو اس نے مبارکباد دی تھی۔ راجو نے بھی بزرگ کے فیصلے کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔اس نے مہوش اور شاہان کو مبارکباد دی تھی۔مہوش نے راجو سے وعدہ لیا تھا کہ وہ کبھی بھی اس کو یاد نہیں کرے گا بلکہ اب کی زندگی میں جو آنے والی ہے وہ اس سے بھی زیادہ راجو سے محبت کرتی ہے۔راجو نے بھی وعدہ کیا تھا کہ وہ گزرتی باتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس جن زادی سے شادی کرلے گا۔

کہتے ہیں کہ جن زادی نے محبت کی خاطر نہ صرف اپنے اہل وعیال اور قبیلے کو خیر آباد کہہ دیا تھا بلکہ اپنی شکتیوں کو بھی قربان کر دیا تھا۔یکے بعد دیگرے

راجو کو اس جن زادی سے جس کا نام شمائل رکھ دیا گیا تھا تین پسر زا اور ایک دختر ہوئی تھی۔

دوسری طرف شاہان اور مہوش کی ایک دختر اور ایک ہی پسر تھا۔وقت تیزی سے پر لگا کے گزرتا چلا گیا اور آج ان کی اولاد جوانی کی دہلیز کو چھو چکی ہے۔

مہوش کے والد خالق حقیقی کو جا ملے تھے۔والدہ حیات تھی۔

جن زادی کو دختر بنانے والے اور مہوش کو تصویر کی قید رسے بریت دلانے والے بزرگ ان کی شادی کے بعد نجانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔لیکن ان کی دختر (شمائل) جب بھی انہیں یاد کرتی ہے وہ حاضر ہو جاتے ہیں۔ان بزرگ کے کیے گئے فیصلے کو سب نے تسلیم کیا تھا۔یہی وجہ ہے کہ آج سب ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔

مبارک ہو مبارک ہو مبارک ہو

داستان دل اپریل سے کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے

اب آپ داستان دل اپنے گھر، ہوسٹل، آفس، کالج کے ساتھ ساتھ دنیا کے کسی بھی کونے میں حاصل کر سکتے ہیں، تو ابھی اپنا نام ممبر شپ میں فائنل کروائیں

معلومات ممبر شپ:

سالانہ بمعہ ڈاک خرچ	:	1200/-
چھ ماہ بمعہ ڈاک خرچ	:	600/-
تین ماہ	:	300/-

(ممبر شپ 03225494228 اس نمبر پر موبی کیش اکاونٹ میں جمع کروا کہ اپنا ایڈریس اسی نمبر پر واٹس اپ یا مسیج میں سینڈ کریں)

مزید معلومات کے لیے: 03225494228 واٹس اپ / موبائل نمبر

مجبوری

تحریر ایم یعقوب احمد ڈیرہ غازی خان

میرا نام اکبر علی ہے میں اپنوں کی وجہ سے آج در بدر بھٹکنے پر مجبور ہوں میں کام تلاش کرتے کرتے کراچی آ پہنچا ہوں۔ میری دوری سے کیا پتہ میرے اپنوں کو میری حالت کا احساس ہو ویسے تو احساس تو کب کا در گور دفن ہو چکا ہے۔ کوئی مر رہا ہے تو کوئی مار رہا ہے تو کوئی اغواء ہو رہا ہے کوئی پہاڑی والے مزدور سے پچاس لاکھ تاوان مانگ رہا ہے۔ مگر احساس نہیں کسی کا کسی کو اسی طرح میرے اپنوں کو میرا احساس نہیں میں کئی دن بھوکا تھا گھر میں سوچا گھر سے نکل جاؤں تب میرا احساس ہو شاہد جام پور سے کراچی کی ٹکٹ کرواکر کراچی آ گیا بھوک انسان کو ہاتھ پاؤں مارنے پر مجبور کر دیتی ہے جیب خالی ہو گی تھی اجنبی شہر میں کوئی میرا جاننے والا نہ تھا۔ مجھے کسی نے فیکڑی میں کام پر لگنے کا بتایا۔ اس لئے میں اس مل میں آ گیا۔ اکبر علی کی ملاقات مجھ سے ہوئی جہاں اسی مل مجھے تین سال ہو گئے تھے اکبر علی سوچوں کے سمندر میں غوطہ زن رہتا۔ نجانے کب وہ دن آئے گا جب میرے دل کے ارمان پورے ہونگے اور حسرت میری زندگی بن کر میرے سامنے بن سنوار کر پھولوں کی سیج پر بیٹھی ہو گی۔ وہ دن مجھے اچھی طرح یاد ہیں جب میں سکول سے واپس آتا اور شام ڈھلے کھیتوں میں کام کرتا۔ اللہ

پاک نے اچھی صورت سے نوازہ تھا مجھے کسی اور کا کوئی وہم خیال نہ ہوتا۔ اپنے کام سے کام مجھے کوئی خبر نہ تھی کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے ایک دن ایک چھوٹے بچے کے ہاتھ سے ایک لیٹر ملا میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں میرا نام شمائلہ نواز ہے اور میں ہر روز آپکو دیکھتی ہوں خدا کے لیے میری محبت کا بھرم رکھنا۔ میں یہ سوچ کر حیران ہو گیا کہ واہ کیسی لڑکی ہے جو کاغذ کا سہارا لے کر اظہار کرتی ہے میں زیادہ پریشان نہ ہوا۔ کیوں کہ میں اپنی محبت سے مطمئن تھا میری حسرت میری روح میری زندگی کی ہر خوشی میری محبت سائمہ تھی۔ جیسے دیکھتے ہی میں کسی شرابی کی طرح مدہوش ہو گیا تھا۔ اور ساری زندگی صائمہ کے سنگ گزارنے کا عہد کر لیا تھا چاہے جو کچھ بھی ہو جائے کسی کی پرواہ نہیں میں سکول سے واپس کھیتوں کے بہانے دیدار یار کو دیکھنے جاتا اور آنکھوں کی پیاس ختم ہونے کا نام تک نہ لیتی مغرب ہو جاتی اور صائمہ جان اپنے گھر چلی جاتی۔ محبت بھی انسان کو طاقت ور بنا دیتی ہے بزدل ڈرپوک انسان اپنے آپکو چٹان سمجھ لیا ہے۔ جو ہو گیا دیکھا جائے گا۔ ہر رات کانٹوں پر بسر ہوتی رات سالوں کی لگتی۔ اک اک پل مشکل سا لگتا میں نے اپنی اماں کو اپنے دل کی کفیت بتا دی اور پاؤں پر ہاتھ رکھا کہ ہاتھ مانگو میرے لیے صائمہ کے ابو سے صائمہ کا ابو میرے ابو کا خاص دوست تھا۔ امی نے سب سے مشورہ کر کے صائمہ کے گھر جانے کا سگنل دے دیا۔ بہت خوش تھا چند دن کے بعد ایک پڑوسن ملی جس نے شمائلہ کا سلام دیا۔ میں ہنس کر چل دیا۔ چند دن بعد کچھ عورتیں گھر تھیں جب میں سکول سے واپس آیا تو سب کو سلام کیا ان میں ایک جوان پتلی خوبصورت سی لڑکی تھی ایک نظر دیکھ کر اندر چلا گیا وہ باہر برآمدے میں براجمان تھا۔ اندر سکول کی یونیفارم تبدیل کر رہا تھا ابھی قمیض ہی اتاری تھی کہ کوئی پیچھے سے آیا اور آکر لپٹ گیا میں چونک گیا جب مڑ کر دیکھا تو وہی نوجوان لڑکی تھی یہ کیا میں غصے سے بولا میں شمائلہ ہوں کتنے لیٹر لکھے تم بڑے نخرے باز ہو میں لڑکی ہو کر بھی نہیں ڈرتی تو تم کیوں ڈرتے ہو۔ دیکھو تم جو بھی ہو مجھے کیا میں ایسا نہیں ہوں میں کسی اور پیار کرتا ہوں مگر اکبر میں تم سے بے حد پیار کرتی ہوں جو بھی ہو میں جلدی سے باہر نکل گیا کیا مصیبت

گلے پڑی تھی۔ صائمہ میری کزن تھی بہت دور کی۔ مجھے آج سے کچھ دنوں ہی پہلے پتہ چلا تھا جب صائمہ کے ابو فیصل آباد سے جام پور شفٹ ہوئے تھے پہلی ہی نظر میں صائمہ کو اپنا جیون ساتھی بنا لیا۔ دل ہوتا ہی بڑا کمینا ہے کسی کی کب سنتا ہے بس اپنی من مانی کرتا ہے عشق میں مبتلا کر کے آگ میں دھکیل دیتا ہے جس سے انسان ساری زندگی آہیں سسکیوں اور اشکوں میں گزارنے پر مجبور ہو جاتا ہے کچھ دن بعد پھر شائلہ ملی تمیں آخر میری بے لوث محبت کا یقین کیوں نہیں آتا۔ کیسے یقین آئے گا۔ کچھ پل دنوں کی صورت میں گزر گئے میرے کزن کی شادی تھی دھوم دھام سے بارات لے آئے تھے میں نے بلیک کلکر کا سوٹ پہنا ہوا تھا رات کا کھانا سب آنے والوں کو کھلا چکے تھے سوا ایک کا ٹائم تھا ایک چھوٹا بچہ میرے پاس آیا اور بولا انکل آپکو کوئی فلاں جگہ پر بلا رہا ہے سو میں چلا گیا اس جگہ پر کالا گھپ اندھرا تھا۔ رات کا اندھیر اپوری روح زمین پر سیاہی بکھیر چکا تھا آس پاس سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھی اس جگہ پر آیا تو کوئی پہلے سے انتظار میں تھا میں نے پوچھا جی کون ہو اتنے میں پستول بھی لوڈ کر لیا۔ تم اکبر ہو۔ آواز کچھ نسوائی سی لگی ہاں اتنے میں وہ پاس آئی تو بولی اکبر میں شائلہ ہوں۔ تم یہاں کیوں۔ تم کو میں نے ہی بلایا ہے۔ تم اخر میری چاہت پر بھروسہ کیوں نہیں کرتے۔ دیکھو شائلہ میں پہلے سے ہی کسی اور سے لو کرتا ہوں۔ اتنے میں شیطان نے دماغ میں اکیلی لڑکی وہ بھی نو جوان کو ہاتھیا ہاتھیانے کا خلل ڈال دیا۔ ہاں میں محبت پر یقین نہیں رکھتا کیا ہوتی ہے محبت میں نے شائلہ سے کہا اتنے میں شائلہ اپنا دوپٹہ گلے سے اتار کر زمین پر پھینک دیا۔ اور باقی سے بھی اور روتے ہوئے میرے سینے سے لگ گئی ہم محبت کی اس راہ پر آ کر نزل کی سب حدیں پار کر گئے دیکھ لو کتنی چاہت ہے میرے تن بدن میں تم اب میری محبت کا بھر رکھ لو۔ میں ہاں کی اور گلے مل کر چل دیا۔ شائلہ بہت خوش تھی محبت مل گئی۔ میری منزل شائلہ نہیں صائمہ تھی۔ میں اپنا سب کچھ صائمہ کا مان لیا تھا۔ شائلہ تو خود چل کر اپنا پیار تلاش کر رہی تھی مجھ سے مگر میں تو پہلے ہی سے اپنا دھن من دل و جان صائمہ کے نام کر چکا تھا صائمہ کے سوا میری زندگی اجرن تھی۔ ہر حال ہر صورت

صائمہ کو اپنانا تھا میں صائمہ کے بارے میں امی کو بتا چکا تھا۔ امی نے اپنی امی یعنی نانی امی کو میرے دل کی بات بولی۔ تو گھر میں کرام برپا ہو گیا قیامت سے پہلے اثار نظر آگئے جو نانی امی نے سب کو سنا دیے۔ برسوں کی دشمنی میری خوشی پر ماتم کرنے لگی۔ نانی امی یکدم آگ بگولہ ہو گئیں شرم نہیں آتی بے غریت انسنا کو اپنے نانا سابی کے دشمنوں میں شادی کرئے گا غیر تو غیر آج اپنا خود کا دھوتا اس گھر میں شادی چائے گا جہاں نانا ابو کی امی کی عزت لوٹی تھی وہ بھی گھر سے اٹھا کر اس وقت نانا ابو سات سال کے تھے نانی اماں کی باتیں کئی من کے بھاری ہتھوڑوں کے برابر میرے ذہین پر برس رہی تھی میں ہاں سے اٹھ کر آگیا۔ جسم میں آگ سی لگی ہوئی تھی ۔ ایک طرف محبت کی جنگاری دل کو جلس رہی تھی تو دوسری طرف عزت کا مسئلہ تن بدن میں شعلے بن کر اٹھ رہے تھیکر تا تو کیا سب کچھ سمجھ سے باہر تھا۔ میں مجبور ہو گیا میری سب سے بڑی مجبوری صائمہ تھی جس کے بغیر میں ادھورا تھا میں ایک بار پھر سب کے پیر پکڑے اپنے دل کے سکون صائمہ کے لیے رویا گڑ گڑیا۔ نانی امی نے صرف ایک ہی جواب دیا اگر اپنے فیصلے پر قائم رہا تو ہم سب منہ موڑ جائیں گے نانا ابو نانی امی ماموں سب میری جان سے بڑھ کر تھے ان کو بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا یہ بھی میری مجبوری میں شامل تھے ۔ مسئلہ سمجھ سے بالاتر ہو گیا میں نانی امی کے گھر جانا چھوڑ دیا ادھر کبھی کبھی صائمہ دیکھائی دیتی دل کے ارمانوں کا چکنا چور ہو گیا تھا جب سے نانی امی کی کڑا کے دار زہر اگلتی باتیں سنی تھی۔ اگر میں ان کے فیصلے کے خلاف جاتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میرے چھوٹے بھائی کی منگنی جو ماموں کی بیٹی وہے ہوئی تھی وہ ٹوٹ سکتی تھی میرے سب اپنے غیر ہو جاتے اور میں اپنی خوشی کے لیے اتنا کچھ کیے قربان کر سکتا تھا ہر وقت ہر پل آہیں سسکیاں بھر تا رہتا کھانے پینے کا کوئی پتہ نہ تھا کب دن ہوا اور کب شام ہوئی کوئی جزنہ تھی محبت کی راہ پر چلو تو منزل پر دشمنی مجبوری قدم چومتی اور اگر گھر والوں کے خلاف محبت اپناؤں تو مجبوری سب کچھ قربان کرنا پڑتا سب کو اپنی دشمنی یاد تھی مگر میرے معصوم دل کی خوشی چھوٹی سی ارزو حسرت بھری نگاہیں صائمہ کا راہ تکتے ہوئے کسی کو دیکھائی نہ دیتی۔ کچھ دنوں کے بعد

میری ملاقات صائمہ سے ہوئی گھر کی ساری کہانی بتائی تو صائمہ نے کہا دیکھو اکبر علی میں اپنی امی کو راضی کر چکی ہوں اور اب تمہارے گھر والوں کے آنے سے ہی بات بنے گی۔ اسی طرح ہار پر سو گی مناتے مناتے دن سولی پر بیت رہے تھے ایک دن اچانک میرا دوست یاسر ملا یاسر کو میری پریم کہانی کا پورا علم تھا۔ میں ہر بات یاسر سے شئیر کرتا تھا۔ یاسر بولا اکبر علی سنا ہے صائمہ کی منگنی ہو رہی ہے یاسر صائمہ کا پڑوسی تھا ہ بات پر پتہ رکھتا تھا میں نے کہا مجھے تو پندرہ دن پہلے صائمہ ملی اس نے تو کوئی بت نہیں کی۔ ارے پاگل صائمہ بھی ہونے والے منگیتر اسد سے لو کرتی ہے مجھے خود اسد نے بتایا یہ بتاتے ہوئے مجھے یاس پر غصہ آنے لگا تم جھوٹ بکتے ہو یاس میں چلایا۔ واقعی یار میری بات کا یقین کرو یاسر سچ بول رہا تھا مگر انہونی بات پر مجھے بھروسہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ مجھے اس صائمہ پر یقین نہیں آ رہا تھا اسد سے وقت گزاری ہے یہ مجھ سے بات کیا ہے میرے پاؤں سے زمین نکلتی جا رہی تھی سانس روکتی ہوئی محسوس ہونے لگی میری انکھوں سے اشکوں کی ساؤن کی رم جھمی برسات شروع ہونے لگی یاسر جھوٹے دلاسے دینے لگا۔ یاس ایسا کبھی صائمہ نہیں کر سکتی مجھے دوکا نہیں دے سکتی میں سچا پیار کرتا ہوں اس سے اکی عبادت کی اسے سب کچھ مانا نہیں یاسر ایسا نہیں ہو سکتا یاسر بولا چلو ابھی پچ کرو کچھ دن تک دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ مزید کچھ تلخ بھری یادوں کے ساتھ دن گزر گئے صائمہ گھر سے باہر ہی نہ نکلتی کبھی شام ڈھلے تو کبھی سورج چڑھے تو کبھی کڑی دھوپ میں صائمہ کو ملنے جاتا تو محبوب کی دیلز بند ہی پڑی ملتی۔ یاسر کی بات اک دن پکی ثابت ہوئی۔ صائمہ کی منگنی طے پائی میرے اوپر تو قیامت برپا ہو گی میں ہار گیا اسد جیت گیا کسی تو مانگتے ہوئے بھی کچھ بھی نہیں ملتا تو کسی کو بن مانگے سب کچھ منل جاتا ہے گھر والوں کا فیصلہ تو اٹل تھا مگر اک آس تھی کوئی تو میرے دل کی بات سمجھے گا کوئی تو محبت کو ملانے کی تگ دوو کرئے گا ہائے مجبوری تجھے سلام۔ میرا سکون چین راتوں کی نیند دل کا قرار سب خاک میں مل گیا میری محبت کا چمن اسد کے ہاتھوں لٹ کر برباد ہو گیا میں گلی کا خالی ہاتھ فقیر بن گیا اک دایدار کے لیے ترس رہا تھا۔ کوئی موقع ہاتھ نہ آ رہا تھا کہ صائمہ تو بھی

مجھے سے محبت کرتی ہے۔ میں دیوانہ بن کر چورا ہے پر ہر شخص کو حسرت بھری نگاہ سے تکتا کاش صائمہ ہو بات ہو سکے لیکن قدرت کے کھیل نرالے ہیں۔ ایک دن شمائلہ ملی میری حالت دیکھی تو مجھ سے لپٹ گئی رو رو کر برا حال تھا شمائلہ کو میرے اجڑ جانے کی خبر نہ تھی شمائلہ تو خوش تھی کہ اکبر علی تو میر صرف میرا ہے میں نے پوچھا کہاں جا رہی ہو تو بولی میری کزن کی آج منگنی ہے صائمہ کی میں تو شمائلہ کی باہنوں میں جھول گیا۔ دن گزر گیا رات آئی تو میں یاسر کو بولا۔ آج ہر حال میں صائمہ سے ملنا ہے جو کچھ بھی ہو جائے۔ میں رات کو یاسر کے گھر گیا یاسر کو ساتھ لیا اور صائمہ کے گھر چل دیے ۔ ہم اسلئے سے لیس تھے آدھی رات گزر چکی تھی۔ میں دیوار سے چانگ لگائی اور اندر صرف صائمہ اور شمائلہ دونوں بیٹھی ہوئی تھی صائمہ اپنے ہاتھ بڑے غور سے دیکھ رہی تھی جس پر اسد کے نام کی مہندی لگائی ہوئی تھی۔ میں دونوں کو چپ کرنے کا اشارہ دیا۔ او نقاب بھی اتار دیا۔ دونوں کی آنکھیں پٹھی پٹھی تھی۔ اکبر علی تم دونوں نے بولا۔ ہاں صائمہ میری محبت چاہت عشق مجھے آج اس طرح

آنے پر مجبور کر دیا میری مجبوری بن گی تھی تمہیں دیکھنا۔ کیا کر دل دل سے مجبور ہو میں نے دل سے سچی محبت کی تھی تم سے صائمہ مگر یہ کیا تم آج اسد کے نام کی مہندی ہاتھوں پر لگائی ہے کیا تم نے کبھیمجھ سے سچی محبت نہ کی تھی اکبر علی میں آج بھی تیری ہوں مگر کیا کروں کچھ بھی سمجھ نہیں آتا ایک طرف تم سے محبت دوسری طرف ابو کی مرضی میں تو دوکشت کی مسافر بن گئی ہوں میری بھی مجبوری بن گئی ہے ابو کی بات کی لاج رکھنا اب میں ابو کی سفید ڈاڑھی اور پگڑی کی لاج رکھنی ہے۔ اس خاموشی سے واپس آ گیا گھر والے احساس کرتے تو شاید میں اور صائمہ ایک ہو جاتے ہر طرف مجبوری آپکی رائے کا انتظار رہے گا۔

ایم یعقوب احمدانی

☆☆☆☆☆

کتابی شکل کے لیے اپنی تحریریں ہمیں جلد سے جلد سینڈ کر دیں۔۔۔

ندیم عباس ڈھکو۔ چک نمبر 79/5۔ ایل ساہیوال

03225494228

خوشی سمیع۔ سیپن

میرب جو کبھی چپ نہیں ہوتی تھی یا بقول مما کے میرب کو چپ رہنا آتا ہی نہیں۔ اب اس کو لگتا اس کے اندر خاموشیوں نے ڈیرے ڈھال لیئے ہیں۔ اسے بولنے کے لیئے سوچنا پڑ تا تھا اب کہ کیا بولے کیا نہ بولے۔ کیونکہ ڈر تھا کہیں غلطی سے وہی بات منہ نہ سے نکل جائے جسے سوچتے اس کی نیند اڑ جاتی اور جسے سن کے سب کو شاک لگتا۔ کبھی پریشان نہ ہونے والے جب پریشان ہوں تو خاموشی کی اک تہہ انکو اپنے لپیٹے میں لے لیتی ہے۔ جیسے کہ میرب کو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

سب کرن کی طرف گئے تھے اور اس نے جانے سے منع کر دیا تھا۔ پڑھائی کا بہانہ بنا کہ جبکہ پڑھا ایک لفظ بھی نہ تھا۔ بس سوچیں تھی کہ ایک کے بعد ایک آ رہیں تھیں اور ہر سوچ کی تان آ کے ٹوٹتی شایان احمد پہ جسکی منکوحہ تھی اور جو زندگی کا ساتھی تھا مگر صدیوں کہ فاصلوں پہ کھڑا لگتا تھا۔ اور ڈر تھا کہ جانے کب شایان یہ ڈوری توڑ دے۔

اسی لان میں پہلی دفعہ دیکھا تھا اسے مسکراتے ہوئے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کتنا اچھا لگ رہا تھا مسکراتے ہوئے۔ مگر اس کے بعد تو اس کی بادلوں سی گرجتی آواز نے اسے سہمہ کے رکھ دیا تھا۔ وہ کیوں اتنا خفا خفا تھا۔ کس بات کا غصہ تھا کیوں اس پہ بھڑکا تھا۔ وہ آج تاک جان نہ پائی تھی اور یہی بات اسے ایک سال سے پریشان کر

رہی تھی۔ یہ سوچ ہی اسے گھیرے رکھتی تھی کہ جس سے کبھی ملی نہیں بات نہیں کی وہ اتنا کیوں چلایا تھا اس پہ۔۔۔وہ تو اسے جانتا بھی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

تو اس کو اس پہ غصہ کس بات کا تھا۔ کیا وہ اس رشتے کہ بننے پہ خوش نہیں تھا یا یہ زبردستی مسلط کیے جانے والا کوئی معاملہ ہے؟ کیا وہ کسی اور کو چاہتا تھا؟ ایسے بہت سے۔۔۔۔کیا۔۔۔۔۔اور۔۔یا۔۔۔۔تھے جو وہ سوچتی رہتی تھی مگر آج تک کبھی کوئی سرا ہاتھ نہ لگا تھا۔۔۔۔۔۔گھر میں کسی کو بتا کہ پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیئے سال بھر سے چپ چاپ اندر ہی اندر خوفزدہ رہتی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یہ رشتہ اس کے پاپا کے دوست کے بیٹے سے پاپا نے بڑی چاہت سے جوڑا تھا۔ وہ کوئی بھی ایسی بات پاپا سے نہیں کہنا چاہتی تھی کہ جس سے دو دوستوں اور نئی رشتے داری میں کوئی بدمزگی ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اسے انتظار تھا اب قسمت کے فیصلے کا۔

انہی سوچوں سے بچنے کو کئی بار اس نے سر جھٹک کے اپنا دھیان دوسری طرف کرنا چاہا۔ سامنے تلاب میں ڈھوبتے سورج کی نارنجی کرنیں لان کو سنہری روشنی سے بھر رہی تھی میرب کو لگا کہ اس کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہو گیا ہے اس کی سوچ پہ شایان سورج کی کرنوں کی طرح پھیل گیا ہے۔

شام کو ڈوبتے سورج کی کرنوں کو لان میں پانی پہ رقص کرتے دیکھنا میرب کو تو ویسے ہی بہت پسند تھا اور یہ شعائیں اسے بہت بھلی لگتی تھی اور ڈوبتا سورج بڑا اٹریکٹ کرتا تھا اسے۔ اس وقت اس کا دھیان ڈوبتے سورج نے اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔

وھاب ہاوس تعمیر کے لحاظ سے ایک نفیس سا گھر بلاشبہ ہے گیٹ کے دونوں اطراف لان تھے درمیان میں روش تھی جسے بہت یونیک طریقے سے بنوایا گیا تھا جو چھوٹی سی خوبصورت سی سڑک لگتی تھی جس پہ گاڑی اندر داخل ہو کہ پورچ تک جاتی۔ دائیں طرف لان میں بڑی بڑی کمروں کی کھڑکیاں کھلتی تھیں جن کے سامنے میز اور کرسیوں کو رکھا گیا تھا سنگی بنچ بھی بنے ہوئے تھے جن کے پیچھے موسی پھول لگے تھے بائیں طرف کے لان میں گیسٹ روم کی کھڑکیاں تھی اور ساتھ میں چند سفید سنگی مرمر کی سیڑھیاں تھی جو ڈرائنگ روم سے لان میں آنے کا ڈائرکٹ راستہ تھا

سیڑھیوں کے سامنے ایک بڑا سا جھولا پڑا ہوا تھا اور سائیڈ پہ چھوٹا سا تلاب تھا دونوں طرف کے لان کے کے آگے اک بر آمدہ تھا جس کے وسط میں ایک بڑا سا منقش دروازا گھر کے اندونی حصے میں داخل ہونے کے لیئے بنا تھا جس کے اندر کاریڈور کے دائیں طرف گھر کے مکینوں کے کمرے تھے دوسری طرف ڈرائینگ روم اور گیسٹ روم تھے کاریڈور کے آخر میں ایک بڑا سا ہال تھا جس کے ایک طرف سے سیڑھیاں اوپر وی منزل کو جاتی تھیں۔ گھر میں جدید طرظ کے فرنیچر اور سجاوٹ گھر والوں کے ذوق کا پتہ دیتے ہیں۔

تمہارا گھر نہ میرے خوابوں کے گھر جیسا ہے کتنی بار اقراء کہتی تھی۔ اتنے خوبصورت گھر میں رہتے بندہ اداس پریشان نہیں ہو سکتا۔ دل خوش باش رہتا ہے بے فکر رہتا ہے۔

میرب ہنس کہ کہتی اچھا جی مجھے تو آج تک کسی بتایا ہی نہیں تھا یہ

اور اقراء یوں مذاق اڑائے جانے پہ چڑ جاتی۔

گھر کتنے بھی خوبصورت کیوں نہ ہوں یہ پریشانی کو آنے سے نہیں روک سکتے۔ یہ اندر سے اجڑے دلوں کو آباد نہیں کر سکتے۔

سورج کی طرف زیادہ دیر وہ دھیان نہ دے پائی کہ اب پھر شایان کے بارے میں سوچنا شروع ہو گئی تھی گیٹ سے اندر داخل ہوتی سپورٹس بائیک پہ ارتضی سیدھا پورچ میں پہنچا اور بائیک کھڑی کر کے انگلی میں کی چین گھماتے موسم کی خوشگواریت کو دیکھ کے بائیں طرف لان میں آیا تو نظر میرب پہ پڑی۔

تم یہاں اتنا اداس چپ چاپ کیوں بیٹھی ہو

بس ایسے ہی دل کر رہا تھا اس کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھ کے بولی

میرب مجھے لگتا ہے کہ کچھ ہے جو تمہیں پریشان کرتا ہے کچھ تو ہے جو ہم سے کہتی نہیں ہو وہ اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے بولا تو کرن نے آنکھیں دکھا کے اسے مزید کچھ کہنے سے روکا۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو کوئی شک ہو کہ اسے کوئی پریشانی یا مسئلہ ہے۔

آنکھوں کو کرائے پہ نہیں لیا نہ جو نکال نکال کے ڈرا رہی ہو آنکھیں پٹپٹا کے اسے دیکھتے ازلی خوشحال موڈ میں بولا

بکو مت وہ ہنسی روکتے مصنوعی غصے سے بولی

او کے نہیں بکتا

مماپاپا نہیں آئے

نہیں

تم جلدی کیوں آ گئے

وہ رات کو آئیں گے ممانی نے کھانے پہ روک لیا ہے

اس کا سوال نظر انداز کر کے اس نے کہا

تم بھی ساتھ ہی آجاتے وہ جانتی تھی کہ وہ اس کے لیئے ہی آیا ہے پھر بھی کہے بنا نہ رہ سکی۔

تم بھی زرا زندہ لوگوں کی طرح ہنسا کرو، مسکرایا کرو، آیا جایا کرو اسنے پھر اسکی بات سنی ان سنی کی مگر اب کہ وہ کچھ نہ بولی۔ یہ تو سچ تھا اب عرصہ ہوا وہ کہیں آنے جانے سے کتراتی تھی۔

کچھ دیر وہ بھی چپ رہا پھر اٹھ کے اندر جاتے ہوئے بولا یوں کھوئے رہنے سے مسئلے حل نہیں ہوا کرتے تمہاری زندگی میں خوشی کسی کی محتاج تو نہیں ہے خوش رہا کرو مت سوچا کرو اتنا۔

اس نے بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹ کہ اس پہ چہرہ ٹکاہ دیا۔ ایسا کر کے وہ آنکھوں کی نمی ارتضی سے چھپا گئی تھی۔

اسکی خاموشی سب سے زیادہ ارتضی کو ہی چبھتی تھی۔ ابھی بھی اس کے چپ رہنے پہ پھر بولا میرب تم یوں اچھی نہیں لگتی (جیسے میلے میں کھوئی ہوئی ہو وہ یہ سوچ کہ رہ گیا پر کہا نہیں۔ پٹنا تھوڑی تھا کرن اور میرب دونوں بہنیں اپنے اس کزن ارتضی سے بہت پیار کرتی تھیں مگر میرب چونکہ چھوٹی تھی سو زیادہ ارتضی کے ساتھ ہنسی مزاق کرتی تھی۔)۔

جاتے جاتے وہ پلٹا اور بولا

تمہیں کون سا شایان سے محبت ہے جو لگے کہ اس کو سوچتی ہو تبھی کھوئی کھوئی رہتی ہو۔۔۔۔۔۔ یہاں تو یہ وجہ بھی نہی۔ وہ شرارتاً کہتے مسکرایا۔

میرب نے اب سر اٹھا کے گھورا تو وہ اندر بھاگ گیا وہ ایسا ہی تھا ایک پل سنجیدہ ہوتا تو دوسرے ہی پل پھر اپنی ٹون میں آجاتا۔ میرب کو ہر وقت اپنے ساتھ ہنسانے والا اس کی بہت کیئر کرنے والا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس کی چپ کو محسوس تو کرتا تھا مگر کرید تا نہیں تھا کہ میرب کو جب مناسب لگے گا وہ خود کہہ دے گی۔

اسکے جانے کہ بعد پھر سوچیں شایان کی طرف مڑ گئی۔

-----محبت ہی تو ہو گئی ہے مجھے

اب وہ اس کو کیا کہتی کے دل میں کب کیسے وہ اترا

۔اسے تو خود بھی خبر نہیں نکاح سے پہلے تصویر تو

دیکھی تھی پر تب تو ایسا کوئی احساس نہیں ہوا یہ شائید

نکاح کے بولوں کا اثر ہے یا کرن کی مہندی کی رات اسی

لان میں اسے مسکراتے دیکھا تھا تو شائید تب۔

جو اب وہ رگ وجان میں رہتا محسوس ہوتا ہے مجھے اس

سے محبت ہے کون اسے جا کے بتائے کہ

تجھے سوچنے کے علاوہ کُچھ کرنے کو دل ہی نہیں کرتا،

سبھی حسیّات، سارے احساسات دم تُوڑ چُکے ہیں

جیسے۔۔زندہ ہے تو بس تمہاری طلب۔۔۔۔۔

کوئی کسی سے محبت یوں بھی کرتا ہے کہ ایک شخص

آپ کا ہونے کے بعد بھی آپ سے بیگانہ ہو اور ہمارا

دل پھر بھی اسکے طرف کھنچتا چلا جائے۔

۔آج نانو نے مہمونہ اور وھاب کو اصل میں میرب کی

رخصتی کے متعلق بات کرنے کو روک لیا تھا۔مجھے تم

لوگوں نے بہت مایوس کیا ہے سال سے اوپر ہو گیا ہے

میرب کے نکاح کو مگر رخصتی کا تم لوگوں نے اب تک

اس متعلق سوچا ہی نہیں۔

اماں ہم تو میرب کے امتحانوں سے فارغ ہونے کا انتظار

کر رہے ہیں۔وھاب نے جواب دیا۔

پڑھائی ہوتی رہتی تم لوگوں کو بات تو کرنی چاہیئے تھی

نہ۔

میں نے تو کئی دفعہ کہا تھا مگر وھاب ہی کہنے لگے ابھی

جلدی کیا ہے مہمونہ خود چاہتی تھیں کہ ان کی بیٹی اپنے

گھر کی ہو۔

بس بہت ہو گیا اب اور دیر کرنے کی ضرورت نہیں تم

لوگ ایک دو دن میں میرب کے سسرال بات کرو

اور رخصتی کا معاملہ طے کرو۔

جی اماں وھاب نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا کے

کہا۔

سنو میں تو سوچ رہی تھی کہ ارتضی کے لیئے زارا کو

مانگ لینا چاہیئے تم لوگوں نے کچھ سوچا ارتضی کا۔نانو نے کچھ دیر سوچ کے نیا آئیڈیا دیا۔

زارا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ارتضی کے لیئے مہمونہ نے خوش ہو کے کہا۔مجھے تو وہ ویسے بھی بہت اچھی لگتی ہے وہ میری بہو بن جائے تو اس سے خوشی کی بات بھلا کیا ہو گی کیوں وھاب

مجھے تو کوئی اعتراض نہیں وھاب نے بھی اس پر پوزل کو اپنی پسندیدگی دی۔جسے سن کے نانو نے بہت سی دعائیں دی۔

سمیرا آنٹی اور قمر انکل نے بھی اس پر پوزل کو بہت خوشدلی سے قبول کیا۔ارتضی سے پوچھا گیا تو اس نے سو فیصد فیصلہ مما پاپا کو سونپ دیا کہ وہ جو اور جیسیا مناسب سمجھیں کریں۔میرب کو پتہ چلا تو پہلے تو اسے بے حد خوشی ہوئی زارا بہت اچھی لڑکی ہے اور اس سے کافی دوستی بھی ہے پھر اس کی پریشانی دوچند ہو گئی۔

ایک تو شایان اس سے پہلے ہی اپنا رشتہ رکھنا نہیں چاہتا تھا اوپر سے زارا اور ارتضی کا رشتہ۔۔۔۔۔۔مجبوری یہ تھی کہ وہ کسی کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتی تھی۔

ابھی یہ ایک سال پہلے کی ہی بات ہے وہ کتنا خوش باش رہا کرتی تھی

پھر اک دن مسز قمر اور قمر صاحب پاپا کے دوست انکے گھر آئے تھے۔پاپا کی طرف سے کھانے کی دعوت پہ (اصل میں اپنے بیٹے کے لیئے لڑکی دیکھنے جو صاف لفظوں میں مما پاپا سے کہا تھا)

میمونہ بھابھی آپ کی بیٹیوں کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے

مسز قمر نے کھانے کی میز پہ کئی طرح کی ڈشز اور لذیذ ذائقے کی تعریف کی۔قمر صاحب نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

شکریہ بھابھی۔

بس بچیاں ہی اب گھر سنبھالتی ہیں یہ تو دونوں مجھے کوئی کام نہیں کرنے دیتیں میمونہ کے لہجے میں بیٹیوں کے لئے محبت تھی۔

کاش للہ نے ہمیں بھی ایسی بیٹی دی ہوتی قمر صاحب نے مسکراتے ہوئے شرارتاً کہا۔

یہ بھی تمہاری بیٹیاں ہیں وجاہت نے دوست کو کہا۔

ہاں ہاں کیوں نہیں سمیرا نے کہا۔ زارا بھی ان جیسی بن جائے گی ابھی چھوٹی ہے تو زرا لاپرواہ ہے۔

اس کی ٹریننگ کے لیئے چلو پھر ایک کو ہم لے جاتے ہیں۔

تو انکل آپ مجھے اپنے ساتھ لے جائیں پھر ۔۔۔۔۔ میرب نے جلدی سے۔

میرب۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کرن نے ٹوکا۔

ہاہا۔۔۔۔۔ ٹھیک ہے چلو۔۔۔۔۔۔ لے چلیں گے۔

پکا۔۔۔۔۔۔۔ میرب نے پوچھا۔

ہاں پکا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ خوشدلی سے جواب آیا۔

قمر کو میرب کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔ تبھی باتوں سے باتیں نکال رہے تھے۔ اچھا۔۔۔۔ اب وجہ تو بتاو۔۔۔۔ تمہیں ہی کیوں اپنے ساتھ لے جائیں۔۔۔۔۔ قمر نے پوچھا۔

اس لیئے کے کرن کے ساتھ آپ ایک دن نہیں گزار سکتے۔

کرن نے آنکھیں دیکھائیں جس کا میرب پہ کوئی اثر نہ ہوا۔

ہاں بتاؤ وہ کیسے سمیرا نے دلچسپی سے پوچھا۔

وہ ایسے کے محترمہ کو ڈر لگتا ہے اکیلے میں۔ نہ خود کہیں جاتی ہے نا مجھے جانے دیتی ہے۔ سارا دن کمرے سے نکلتی ہی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اسی لیئے یہ ہر وقت گھر میں قید رہنا پسند کرتی ہے بلکہ مجھے بھی ساتھ قید رکھتی ہے۔ میرب کو کرن کی اس عادت سے چڑ تھی اور ابھی اس نے یہی بات منہ بناتے کہی۔ جسے سب نے دلچسپی سے سنا اور اس بات پہ سب نے قہقہ لگایا۔

ویسے اتنا ڈرنے کی وجہ۔۔۔۔۔۔۔ اب کے قمر نے پوچھا۔

ان کو لگتا ہے جیسے ہی یہ اکیلی ہوں گی کوئی جن بھوت ان کو پکڑ لے گا میرب نے جواب دیا۔

یہ ذرا اکیلے رہنے سے ڈرتی ہے میمونہ نے کرن کی شکل دیکھ کے اس کے ڈرنے کی عادت بتائی اور کہا میرب اس کی اس عادت سے خائف رہتی ہے۔

کرن نے میرب کو آنکھیں دکھائیں اور سرگوشی کی اللہ کرے یہ تمہیں سچی ہمیشہ کے لیئے جائیں۔

آمین۔۔۔۔میرب نے اس کو چڑانے کو آمین کہا۔اور شائدیہ قبولیت کی گھڑی تھی جو اس کی آمین قبولیت کا درجہ پا گئی اور اسے عمر بھر انکے گھر ہی چلے جانا تھا

--

رات کو سب اکھٹے ہوں گے تو ہی کچھ فائنل رزلٹ اناؤنس ہو گا

تب تک-----------------------

تو تکے ہی لگ سکتے ہیں کون پسند آئے گی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کرن

کمرے میں ادھر سے ادھر چکر لگاتے یہی فقرہ بیسویں بار بول رہی تھی۔جسے سن سن کے میرب اب چڑ سی گئ تھی۔

اب اگر تم نے ایک بھی چکر اور لگایا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یا یہی بات پھر سے کہی تو میں تمہیں اپنے کمرے سے باہر پھینک دوں گی کرن۔

بڑی ہوں تم سے

ڈیڑھ سال میرب نے اثر نہیں لیا۔

تم باہر پھینکنے کی بات کر رہی ہو یہاں گھر سے نکالنے کے پروگرام بنائے جا رہے ہیں۔

آہا۔۔۔۔۔۔آپ کو گھر سے نکالنے کا خیال آیا کسے۔

کرن ہر بات کو کچھ زیادہ ہی سوچتی تھی اس لیئے میرب نے اس کی فکر کو اس کی عادت سمجھ کے زیادہ اہمیت نہ دی۔

پیچھلے ہفتے جو قمر انکل لوگ ائے تھے انکی طرف سے رشتہ آیا ہے وہ اب پژمردگی سے بولی۔

تو تم کیوں اتنا سوچ رہی ہو بیڈ پہ بیٹھے چپس کھاتے اس نے حیرت سے دیکھا اسے۔

تم چپس کھالو وہ اس کو اتنے آرام سے بیٹھا دیکھ کے چڑ گئ۔

لو نہیں کھاتی ساتھ ہی پلیٹ سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دی تم

سوچو مت یہ مسئلہ تمہارا نہیں مماپاپا کا ہے۔

اچھامسئلہ میرا نہیں اور اب اتنا بھی نا

سوچوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟بعد

میں بھلے ساری عمر روتی رہوں کرن کو اس کا ٹوکنا

اسوقت تو قطعیً اچھا نہ لگا۔

اس کی بات کرنے کے انداز سے میرب ہنس دی ویسے

کیوں روتی رہو بعد میں ؟

ممانی کل میرا رشتہ لے کے آرہیں ہیں اب کے اس

نے اپنے اندر کی بے چینی کہہ دی۔

جانتی ہوں وہ تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس معاملے کا

آنٹی سمیرا اور انکل قمر سے کیا تعلق ؟؟؟؟؟میرب

نے حیران ہو کے کرن کو دیکھ کر پوچھا۔

اوفو کس قدر نکمی لڑکی ہو تم اس دن آنے والوں کا

مقصد صرف پاپا کی دعوت نہیں تھا بلکہ وہ اپنے بیٹے

کے لیئے لڑکی پسند کرنے آئے تھے۔

یہ کس نے کہا ہے ؟

اب میرب کو بھی کچھ کچھ فکر ہونے لگی تھی۔

میرب کالج کی سٹوڈنٹ تھی جب کے کرن گریجویشن

کے بعد پڑھائی چھوڑ چکی تھی۔اور گھر والوں کا اب

اس کی شادی کرنے کا ارادہ تھا۔

کرن بچپن سے نوریز کو پسند کرتی تھی ماموں نے مما

سے رشتے کی خواہش عرصہ پہلے کی تھی اور کچھ نانو نے

ہمیشہ اسے نوریز کی دلہن کہا تھا سو وہ دل ہی دل میں

اسے پسند کرنے لگی تھی مگر باقاعدہ رشتہ تو ابھی طے

نہیں ہوا تھا۔

مما بات کر رہیں تھیں پاپا سے تو میں نے سن لیا۔

تم نے اپنا نام سنا تھا؟

نہیں۔

تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہو سکتا ہے وہ

پاپا سے یہی بات کر رہیں ہوں کہ اس دن وہ کہیں اور

کوئی لڑکی پسند کر کے آئے ہوں۔

اگر وہ انکے بیٹے کے لیئے کوئی لڑکی پسند کرنے کی بات

کر رہے تھے تب تو ٹھیک ہے ویسے وہ یہاں اگر رشتے

کی بات کر کے گئے ہوں تو؟ کرن کی پریشانی ختم نہیں

ہوئی تھی۔

ایسا کچھ نہیں ہو سکتا کرن نے ناک سے مکھی اڑائی

۔۔۔۔۔۔۔مما نوریز بھائی کی بجائے کہیں اور

تمہاری شادی نہیں کریں گی۔

ہمم۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کرن نے دو پل سوچ کے کہا۔

پکا ایسا ہی ہو گا نہ کرن نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے اس کے ہاتھ پکڑ کے رنجیدہ سے لہجے میں آنکھوں میں ہزار خدشے لیئے پوچھا تو اس کو اپنی بہن پہ بے حد پیار آیا۔

ہاں بالکل پکا اس نے اس کا ہاتھ تھوڑا سا دبا کے اس کو تسلی دی۔

ان شااللہ کرن کو اب کچھ تسلی ہوئی مگر رنگ ابھی تک اڑا ہوا تھا۔

کرن شکل دیکھو زرا اپنی ایسے لگ رہا ہے تمہں اغواہ کیا گیا ہو جیسے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور جیسے مسز قمر آج بارات لے کہ آ رہیں ہوں اور تمہیں زبردستی دلہن بنایا جا رہا ہو۔ اسکی رونی صورت دیکھ کے میرب کو مذاق سوجھا۔

بد تمیز۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ اس کو پکڑنے کو لپکی اس سے پہلے کہ کرن کے ھاتھ آتی وہ اٹھ کے باہر کی طرف بھاگی۔

میرب چھوٹی ہونے کہ ناطے خود کو ایسی فکر سے آزاد محسوس کر رہی تھی جبکہ یہ فکر اسی کے حصے کی تھی۔

اگلے دن نانو، ممانی، ماموں پھلوں اور مٹھائی کے ٹوکرے لیئے باقائدہ رشتہ طے کرنے آ گئے۔ ظاہر ہے یہ رسمی سی کاروائی تھی سو فوراً ہاں کر دی گئی تھی۔ منگنی کے بارے میں بعد میں ڈسائیڈ ہونا تھا۔

دیکھا کرن میں نے کہا تھا نا کے تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو گی کل کتنا پریشان ہو رہی تھی تم

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔میرب کرن کے ساتھ مل کے کچن سمیٹتے اسے کہہ رہی تھی۔

سہی بات ہے میں تو ڈر گئی تھی بس اتنا سا ہی سنا تھا کہ وہ لڑکی پسند کرنے کے چکروں میں تھے۔

ہاں اور تمہیں لگا کہ کہیں کوئی نوریز بھائی جگہ تمہیں لے نا اڑے خوامخواہ انکل اور آنٹی پہ شک کرتی رہی۔

ہاہا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اب کرن کو خود بھی سوچ کہ ہنسی آ رہی تھی کل وہ ایسے ہی سوچ سوچ کے پریشان ہوتی رہی اور میرب کو بھی کرتی رہی۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔

پانی پکڑاؤ کرن نے بریانی کھاتے میرب سے کہا۔

میں پانی نہیں پکڑا سکتی

------------------سوری

کرن-------------------اس نے آرام سے صاف انکار کر دیا جس سے سبھی حیران ھوئے۔

کیوں کیا مسئلہ ہے مہمونہ نے پوچھا انہیں یوں جواب دینا اسکا برا لگا تھا۔

ظاہر ہے پانی مجھ سے ہی جب پکڑا نہیں جا سکے گا تو پکڑاوں گی کیا میں جب بھی پانی پکڑوں گی وہ ہاتھ سے پھسلے گا-----------------جگ اٹھا کے دے سکتی ہوں-----------------اس نے اتنی سنجیدگی سے دلائل دیئے کہ میمونہ اور وھاب جہاں اپنی ہنسی نہ روک پائے وہیں کرن شرمندہ سی ہو گئی۔ میرب ایسی ہی باتیں کرتی تھی کہ اگلا کچھ کہہ نا پاتا۔

کرن نے حسب عادت اگنور کیا۔

میرب نے جگ اٹھا کے اس کو دیا اور اپنی پلیٹ پہ جھک گئی۔ پورے دھیان سے کھانے میں مصروف تھی جیسے اس سے ضروری دنیا میں کام نہ ہو۔

اس کی ایسی باتیں ہی پسند آئی تھی انکو میمونہ نے وھاب سے کہا-----------وہ خوش ہوئے تھے سن سن کے۔

ہاں---------------وہ مسکرا دیئے۔

کس کو مما کرن کو تجسس ہوا جاننے کا جسے سن کے میرب کے چودہ طبق راشن ہو گئے تھے۔

مسز قمر اور قمر بھائی کو جبھی تو مسز قمر نے کرن کو اپنے بیٹے شایان کے لیئے مانگ لیا ہے۔

میرب کے لیئے جھٹکا تھا نوالہ میرب سے چبانا مشکل ہو گیا تھا وہ حیرت سے پھٹی آنکھون سے کبھی مما کبھی پاپا کو دیکھ رہی تھی اور ایسی ہی حالت کرن کی بھی تھی شاک سا دونوں کو لگا تھا۔ وہ جس بات کو دونوں نے بھلا دیا تھا وہ ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی۔

مگر مام-------------کرن سے مارے شاک

کے کچھ بولا نہ گیا۔

ان کا بیٹا شایان ہمیں بہت پسند ہے اور ان کو ہماری میرب بھی بہت پسند آئی ہے۔ میرب تو ابھی پڑھ رہی ہے اس لیے ہم نے سوچنے کے لیئے ٹائم لے لیا ہے۔ مگر ہم نے ہاں کہہ دینے کا سوچا ہے میمونہ نے تفصیل بتائی۔

اچھا کرن ابتدائی جھٹکے سے سنبھل چکی تھی اب اسے خوشگواریت نے گھیرے میں لیا تھا۔

میرب کو جھٹکا اس لیئے لگا کہ اس نے کبھی اس معاملے پہ کبھی سوچا نہ تھا ابھی وہ خود کو بچی سمجھتی تھی یوں اچانک اس کیلیئے رشتے کا آنا اسے حیرت میں مبتلا کر گیا تھا۔

میمونہ نے اپنا ہاتھ میرب کے ہاتھ پہ رکھ کے سر کے اشارے سے پوچھا کیا ہوا۔

میرب نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں ساتھ ہلا دیا۔

کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے کرن نے بہت سے زیہن میں آنے والے سوال پوچھے کب کہاں کیسے یہ معاملہ طے ہوا اس سے چھوٹی اور اس کی بہت پیاری بہن تھی میرب اس کو خوشی بھی ہو رہی تھی اچھنبھا بھی تھا۔

میمونہ اور وھاب نے مسز قمر کے بار بار آنے والے فون کالز اور انکی خواہش کے متعلق بتایا

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس سارے میں میرب چپ چاپ سنتی رہی ایک عجیب سی جھجھک سی اور شرم سی آ رہی تھی۔

میمونہ اور وھاب نے اپنی بیٹیوں کی ماں باپ کی شفقت کے ساتھ ساتھ دوستوں کی طرح پرورش کی تھی۔ انکو زندگی کی ہر طرح کی اونچ نیچ بتائی تھی۔ وہ ان سے ان کی دن بھر کی ساری کارگزاری پوچھتے کتنے بجے اٹھے۔۔۔۔۔ کتنے سکول گئے۔۔۔۔۔ کتنے بجے واپس آئے۔۔۔۔۔ گھر آ کے کیا کیا۔۔۔۔۔ اور کھانا کھا کے سپارہ پڑھا۔۔۔۔۔، کتنا کھیلے۔۔۔۔۔ نماز پڑھی۔۔۔۔۔ مما کو تنگ کیا۔۔۔۔۔ سوئے کب ۔۔۔۔۔ دن میں کون کون ملا۔۔۔۔۔ کیا کیا بات ہوئی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور جب وہ سب سن لیتے پھر ان کی جہاں۔۔۔۔۔ جس بات میں ان کی غلطی ہوتی جو غلط کیا ہوتا اسے اتنے اچھے سے سمجھاتے

کہ وہ آئندہ وہ غلطی نہ کرتیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

وہ اپنی بیٹیوں کو ہر بات خود سکھا دینا چاہتے تھے

۔۔۔۔۔کہ زمانے کی ٹھوکر یا زندگی میں بدلتے حالات ان کی شخصیت کو اثرانداز نہ کریں۔۔۔۔۔لوگوں کے رویے اور غلط بات کو سن کے بنا غصہ کیے سہی بات کہنا صبر اور برداشت کرنا غرض زندگی کے ہر پہلو پہ ان کو سمجھاتے۔

ان کی اولاد یہ دو ہی تو بیٹیاں تھیں وہ زندگی کے ہر معاملے کو بیٹیوں کے سامنے رکھتے ان کی صلاح لیتے اور دیکھتے کہ وہ کتنی سمجھداری سے معاملے کو سمجھتی ہیں۔یہی بات تھی کہ رشتے کی بات بھی انہوں نے کھل کے بتادی تھی۔حسب توقع انہوں نے فیصلہ مما پاپا کے حوالے کر دیا تھا کہ وہ جو مناسب سمجھیں کریں۔

اقراء بس کرو اب میرے پاس بیٹھو۔میں تم سے ملنے آئی ہوں اقراء آئس کریم لیئے اندر آئی تو اب کے میرب کو اقراء پہ تھوڑا غصہ بھی آیا جب سے آئی تھی یسے وی آئی پی مہمان بنائے ہوئے تھی۔

ہاں ہاں میں تو جیسے جانتی نہیں نہ اب بھی اگر کرن کے نکاح کا کہنے نہ آنا ہوتا تو تم نے کہاں آنا تھا میری طرف آئس کریم پکڑا کے وہ بھی اس کے برابر میں ہی صوفے پہ دونوں پاوں اکھٹے کر کے بیٹھی آئس کھانے لگی۔

اچھا بس اب پھر سے شروع نہ ہو جانا۔۔۔۔۔گلے کرنے۔۔۔۔۔میرب تم آتی نہیں۔۔۔۔۔میرب نے اس کی ہو بہو نکل کی تو اقراء ہنس دی۔

چلو نہیں کرتی۔اچھا پھر تیاری ہو گئی ساری۔

ہاں ہو گئی تقریباً ساری۔

ویسے یہ اچانک نکاح کی کیا تک ہے جب کچھ عرصے میں شادی ہونا ہے۔

ہم تو منگنی کا ہی سوچ رہے تھے مگر پھر نانو نے خواہش ظاہر کی۔کسی کو اس خواہش پہ اعتراض نیہں تھا سو اب نکاح ہو رہا ہے میرب نے وجہ بتائی کرن کے منگنی کی جگہ ڈائریکٹ نکاح کیئے جانے کی۔جس کی دعوت دینے وہ اس کے طرف آئی تھی۔

ویسے اچھا بھی ہے دو دو دفعہ شادی کا مزہ آئے گا اقراء

نے جوش سے کہا۔

ہاں نہ بلکل۔۔۔۔۔۔۔۔۔مگر ارتضی نہیں آپائے گا اتنی جلدی اب وہ کچھ کچھ اداس لگی۔

ارتضی کے بغیر تو مزہ ادھورا رہے گا شادی پر تو آئے گا نہ ؟

ہاں تو اس کے بنا بھلا ہمارے گھر کوئی شادی ہو سکتی ہے ۔۔۔۔۔ارتضی کا ذکر کرتے میرب کے لہجے میں محبت کی جھلک تھی۔

ہاں پھر تو شادی کا اپنا ہی مزہ ہو گا۔

تمہارے رشتے کا کیا بنا۔

ابھی تک تو کچھ نہیں۔

چلو ہو جائے گا جلدی بیڑا پار۔

ہاہا۔۔۔۔۔۔۔۔دونوں ہنس دی۔

اچھا چلو اب مجھے جانا ہے تم نے تو سارا دن میرا لے لیا ہے میرب نے آئس کریم کھا کے اٹھتے ہوئے کہا۔

ہاں تو آتی بھی تو سالوں بعد ہو اور شادی کے بعد پھر کہاں وقت ملنا ہے تمہیں مجھ سے ملنے کا اقراء بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے سے نکلتی کہہ رہی تھی۔

میرب ہنس دی کہا کچھ نہیں ابھی تو اس نے اس بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔

کرن کے نکاح کی رسم گھر میں ادا کی گئی سادگی اور خوبصورتی سے۔ جس میں کرن کی ایک دو دوستوں کے علاوہ اقراء کو بس انوائٹ کیا گیا تھا یا بس قریبی عزیز۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔باقی سب کو شادی پہ بلانے کا ارادہ تھا۔ سمیرا آنٹی اور زارا دونوں ماں بیٹی بھی آئی تھیں۔ نکاح والے دن کرن نانو کے سرخ بجوائے لہنگے میں مناسب سے میک اپ سے بہت سارا روپ چرائے دلہن بنی بیٹھی سب کی تعریفوں پہ کچھ کچھ پزل ہو رہی تھی۔

دلہا نوریز سفید سوٹ پہ بلیک واسکوٹ پہنے بڑے وجیہہ لگ رہے تھے بہت سارے پھول برسا کے انکا ویلکم کیا گیا تھا۔ سارا انتظام لان میں کرایا گیا تھا جہاں چھاٹا سا سٹیج بھی بنایا گیا تھا اور برقی قمقمے بھی لگا کے خوب صورتی سے سجائے گئے تھے لان میں مہمانوں کے بیٹھنے اور کھانا کھلانے کا سارا بندوبست کیا گیا تھا۔

میرب پنک سوٹ پہنے اپنی عمر سے بھی چھوٹی لگ رہی تھی مہمانوں سے باتیں کرتی اقراء اور زارا کے ہمراہ یہاں وہاں پھر رہی تھی۔ نکاح ہونے کے بعد کرن کو لا کے نوریز کے پہلو میں بٹھایا گیا تو تصویریں بنی ہینڈی کیم سے مووی خاص طور پہ ارتضی کے کہنے پہ بنائی گئی۔ میرب نے اپنی کزنز زارا کرن کی دوستوں اور اقراء کے ساتھ مل کے دودھ پلائی کی رسم ادا کی۔ اور لڑ لڑ کے خوب نیگ لیا۔

گو کہ چھوٹا سا فنکشن تھا مگر سب نے بہت انجوئے کیا۔ واپسی پہ شایان سمیرا اور زارا کو لینے آیا تو زارا نے دور اقراء کے ساتھ باتیں کرتی میرب دکھائی۔ شایان نے دیکھا وہ دور کھڑی لڑکی ایک پل میں دل میں اترتی محسوس ہوئی۔ وہ پہلی نظر کی محبت پہ یقین نہ رکھتا تھا سو اپنے خیال کی یہ کہہ کے تصدیق کی کہ وہ لڑکی دل میں نہیں اتر رہی بلکہ انہیں کچھ زیادہ اچھی لگی ہے یا وہ ہے ہی بہت خوبصورت۔

وہ جو سوچتے تھے کہ وہ انہیں بس اچھی لگی ہے ایک ماہ بعد تھک گئے تھے اپنے دل کی آواز دباتے اور بالآخر اپنے آپ سے اقرار کر ہی لیا کہ وہ انہیں اچھی نہیں لگی بلکہ اپنا اسیر کر چکی ہے۔

اس اقرار کے بعد انہوں نے اپنی آنے والی زندگی کا ہر پل اس کے ساتھ سوچ لیا تھا۔

اک نظر دیکھا تمہیں اور محبت ہو گئی

صبح آفس کے لیئے تیار ہوتے شایان گنگنا رہا تھا۔

اچھا جی تو یہ بات ہے۔ زارا اسے ناشتے کے لیئے بلانے آئی تو اسے گنگاتے سن کے چھیڑتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

ہاں۔۔۔ کیا کہا۔۔۔۔ شایان نے اسکا سوال سنا نہیں تھا تو دوبارا پوچھا۔

رہنے دیں وجہ کہنا ہے مما کو کہوں گی۔

اوکے شایان نے کندھے اچکائے۔

مما بلا رہیں ہیں جلدی آجائیں وہ جاتے ہوئے بولی۔

ہاں بس آ رہا ہوں۔

وہ جب ناشتے کے لیئے پہنچا تو مما اور زارا کو بار بار معنی خیز مسکراتا دیکھ کر بولا۔ کیا بات ہے آج آپ لوگ بڑا

مسکرا رہے ہیں۔

ہم تو ہمیشہ مسکراتے ہیں بھائی آپ نے غور آج کیا ہے

۔

چلو جلدی ناشتہ کرو ٹھنڈا ہو جائے گا ورنہ۔ سمیرا نے بات کا رخ بدل دیا۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک میرب کے گھر والوں سے فائینل جواب نہ پتہ چل جائے وہ اس بارے میں شایان سے بات نہیں کریں گی۔

پھر تین ماہ گزرتے ہی نانو نے رخصتی کے لیئے مما پاپا سے کہہ دیا وہ ہر بات نانو کی مانتے تھے سو طے پایا کے اس بار بھی وہی ہو گا جو نانو کہیں گئیں۔

اس قدر بڑا گھر ہے میں تو دل کھول کے آزادی مناؤں گی کرن تمہارے جانے کے بعد۔ میرب نے مسکراتے ہوئے کرن کو چھیڑا۔

ہاں۔۔۔۔ تم شکر کرنا جان چھوٹے گی تمہاری ۔یہاں رہ کہ تم کبھی میری کمی تو محسوس نہیں کرو گی۔

کرن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میرب نے اسکا بازو پکڑتے کہا۔ تمہاری کمی میری زندگی میں کبھی نہیں آئے گی

کیونکہ شادی کے بعد تم گھر سے جاؤ گی۔۔۔۔ دل سے نہیں۔

دونوں بہنوں میں محبت بھی کمال کی تھی مگر کرن کو چڑانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی میرب ان دنوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شادی ہونے والی تھی تو اس کو خوب تنگ کر رہی تھی ابھی بھی حسب معمول کھانا کھا کے لان میں چکر لگا رہیں تھیں دونوں اپنی اداسی ہنسی مزاق میں بھلا رہی تھیں۔

گلاس وال کے دوسری طرف کے صوفے پہ میمونہ کے پاس بیٹھے چائے کا کپ تھامے وھاب گلاس وال کی دوسری طرف کرن اور میرب کو چہل قدمی کرتے دیکھ رہے تھے ہونٹوں پہ بڑی خوبصورت مسکراہٹ تھی۔

کیا سوچ کے ہنس رہے ہیں آپ میمونہ نے پوچھا۔

میمونہ میری مسکراہٹ تو میری بیٹیاں ہیں باہر دیکھتے بولے۔

ہاں یہ تو ہے آپ کی تو ویسے ہی اپنی بیٹیاں سب سے بڑی کمزوری ہیں۔

ہاں سادگی سے اقرار کر لیا وھاب نے۔

وہ عام بچوں کی طرح باہر دوستوں کی بجائے آپ کے اتنے کلوز ہیں۔ اپنی ہر بات ہر پریشانی کسی اور سے نہیں بلکہ آپ سے شئیر کرتی ہیں۔ مہمونہ کو انکی یہ عادت بہت زیادہ پسند تھی کہ وہ اپنے مسئلے اپنے ماں باپ سے کہتیں تھیں دوستوں کی طرح۔

آہم۔۔۔۔۔۔۔۔۔ جبکہ عام طور پہ مائیں ہوا کرتی ہیں دوست بیٹیوں کی اب کہ انہوں نے لطیف سی طنز کی۔۔۔۔۔۔ مہمونہ ہنس دی۔

اچھا تو آپ کو اعتراض ہے پھر۔۔۔۔۔۔ تو بتا دیں۔۔۔۔۔۔ وھاب نے اب رخ ان کی طرف موڑ کے ہنوز مسکراتے ہوئے پوچھا۔

لو اب کیا آپ اور اپنی بچیوں سے اعتراض ہو گا مجھے میمونہ نے مصنوعی جھلاتے ہوئے کہا۔ ہاہاہا

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وھاب کا قہقہہ بڑا جاندار تھا مہمونہ کی بات پہ۔

وھاب زرا سنجیدہ ہو کے بولے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میری بس اتنی سی خواہش ہے میمونہ کہ میری بیٹیاں جینے کا طریقہ تہذیب ہم سے سیکھ لیں کل کو پرائے گھر ان کو مسئلہ نہ ہو میں نہیں چاہتا ان کو مشکل مصیبت پریشانی میں ثابت قدم رہنے میں مسئلہ ہو زمانے میں کبھی ٹھوکر لگے تو سنبھلنے کا ہنر نا جانتی ہو اپنی طرف سے پوری کوشش ہے باقی للہ مالک ہے اور میری دوعائیں تو ہر وقت انکے ساتھ رہتیں ہیں وہ سنجیدگی سے اب کہہ رہے تھے ان کے لفظوں میں محبت ہی محبت تھی۔

ہاں انشااللہ

بھائی صاحب نے فون کیا تھا آج۔ آنے کا کہ رہے تھے میمونہ نے وھاب کو اپنے بھائی کرن کے سسر کی کال کی خبر دی۔

اچھا سب خیریت ہے اور کب آنے کا کہا ہے۔

وہ تو کل آنے کو کہ رہے تھے میں نے کہا تھا آپ سے بات کر کے بتاوں گی۔

نیک کام ہے جتنی جلدی ہو اچھا ہے کل جمعہ کا مبارک دن ہے آنے کا کہہ دو۔

مگر وہ شادی کی تاریخ جلد کی چاہ رہے ہیں۔

چلو جیسے وہ چاہیں للہ سب بہتر کرے گا۔

لیکن۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کیا لیکن کوئی مسئلہ ہے۔

میرب کے لیئے مسز قمر نے کچھ بات کی تھی میں چاہ رہی تھی دونوں کی رسم ساتھ کر لیتے۔

وہ جب ہو گا تب دیکھیں گے ابھی تو کرن کی شادی کی خوشی مناؤ۔

ٹھیک ہے۔

اب جا کہ آپ فون پہ آنے کی بھائی صاحب کو آنے کی دعوت دے دیں

میمونہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتی فون کرنے چلی گئی کہ اسکی بیٹی اپنے گھر کی ہو رہی تھی۔ ماں باپ کو اس سے زیادہ بھلا کیا چاہیئے ہوتا ہے۔

میرب سو گئی؟ مہمونہ نے کرن کے جہیز کے کپڑے دیکھتے پوچھا۔

جی ہلکا ہلکا بخار لگ رہا تھا دوا دے کہ سونے کو کہا ہے۔

کرن چائے مہمونہ کو پکڑاتے ہوئے بولی۔

چلو اچھا ہے کچھ آرام کرے گی تو طبیت ٹھیک ہو جائے گی اس کی۔ مہمونہ نے چائے کا سپ لیتے کہا۔

ہاں بازاروں کے چکر لگا لگا کے تھکاوٹ ہو گئی ہے اسے۔

آج سمیرا بھابھی اور زارا آئیں تھیں۔

اچھا۔---------- میرے آنے سے پہلے چلے گئیں زارا سے ملنے کو دل کر رہا تھا۔ کرن آج ممانی کے ساتھ ان کے کہنے پہ شادے کے زیورات پسند کرنے گئی تھی پھر ممانی نے اور بھی کتنی شاپنگ اس کی پسند سے کی جس کی وجہ سے آج دوپہر ساری ممانی کے ساتھ ہی گزر گئی تھی۔

وہ تو کافی دیر بیٹھیں تھی۔ اور ہم نے ان کو ہاں کہہ دیا ہے شایان کے لیئے، مہمونہ نے ان کے آنے کا مقصد اور اپنا جواب بتایا۔

سچ

مما--------------------------

----------- کرن خوشی سے اچھل پڑی،

ہاں اور قمر بھائی اور بھابھی تو کہہ رہے تھے کہ تمہاری شادی پہ اس کا نکاح کر دیں۔ میمونہ نے مذید کہا۔

واہ، واہ---- مما کیا بات ہے۔ میرب کو پتہ ہے؟ اور کیا اب اس کی منگنی ہو گی یا نکاح؟ اور آپ نے اور پاپا نے کیا کہا؟ کرن نے پے در پے کئی سوال کر ڈالے

۔

دم تو لو۔۔۔بتاتی ہوں۔ کرن کے اتنے سوال سن کے میمونہ مسکراتے ہوئے خالی کپ رکھ کہ سیدھے ہوتے بولی۔

مجھے اور تمہارے پاپا کو بھی نکاح والا مطالبہ اچھا لگا۔ مگر ابھی ان کو ہم نے کچھ نہیں کہا۔

اچھا ویسے اچھا رہے گا یہ بھی کرن آنے والے وقت کو سوچتے خوش ہو کے بولی۔ مما ابھی تو وہ شائید ایسا سوچتی بھی نہیں وہ تو اس اچانک ہو جانے والے رشتے سے ہی کافی حد تک حیران ہے۔

اسکے سوچنے سے کیا ہوتا ہے بیٹا جو نصیب میں لکھا ہو وہ ہونا ہوتا ہے ہاں حیران ہے کیوں کہ وہ ابھی خود کو چھوٹی سی بچی سمجھتی ہے

ہاہا بلکل سہی کہا مما

اب جب نکاح ہو گا تو زمے داری پڑے گی تو رخصتی تک سمجھ جائے گی

ویسے مما مجھے تو بڑی خواہش تھی ارتضی بھی شادی پہ آتا

ہاں اس کے ہونے سے رونق خوب ہوتی

اسی لیئے تو یاد بہت آتا ہے اس کے بنا ہر فنکشن ادھورا لگے گا

ہاں وہ ہے بھی تو اتنا شرارتی ہر وقت ادھم مچانے والا اسے بلا لیں نہ اب

ہاں میں کروں گی بات وھاب سے وہ آج پھر سحرش سے بات کر کے کہیں گے جلد بھیجے ہمارے گھر کی رونق

ہاں تو

میرب نے بھی کل تمہاری پھپھو کو کہا تو تھا بجوانے کا اب دیکھو کیا بنتا ہے وھاب کریں گے بات۔

پھپو نے میرب کو کیا کہا تھا مما؟

کہہ رہی تھی ارتضی کو بھی بہت جلدی ہے آنے کی وہ بس سحرش نے اپنی وجہ سے اسے روکا ہوا ہے۔ اور وہ بچہ رک گیا۔

لگتا ہے پاپا آ گئے ہیں۔ گاڑی کے ہارن کی آواز سن نے کرن نے کہا۔

ہوں۔ چلو تم اب میرب کو جا کہ دیکھو بخار تیز تو نہیں ہوا۔ مہمونہ نے اٹھتے ہوئے کرن کو ہدائیت دی۔ اور اگر بخار تیز ہوا تو بتا دینا تمہارے پاپا اسے ہسپتال لے

جائیں گے۔

جی مما۔ کرن ماں کے پیچھے وہاں سے جاتے ہوئے بولی۔

اسکا رخ میرب کے کمرے کی طرف تھا جسے آج کی اتنی بڑی خبر دینی تھی۔

کرن کی شادی کی ڈیٹ چودہ مئی رکھی گئی ساتھ ہی کرن کی مہندی سے ایک رات پہلے میرب کے نکاح کی ڈیٹ رکھی گئی۔ سب اتنا عجیب اور جلدی ہو رہا تھا کہ میرب کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ وہ جو کرن کی شادی کی تیاریوں میں بزی تھی اب اپنے نکاح کی تیاری بھی کر رہی تھی۔ اور کرن سارے بدلے چکا رہی تھی اسے چھیڑ چھیڑ کے۔

اور میرب کو اب سمجھ آیا کہ اس نے کتنا کرن کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔

جب اچانک سے زندگی کا رخ بدلتا ہے تو اکثر ہر چیز عجیب اور سمجھ سے بالاتر محسوس ہوتی ہے۔ کچھ ایسا ہی میرب کے ساتھ تھا۔

شادی کی خوب تیاریاں ہو رہی تھی اور سب سے زیادہ جس بات کی سبھی کو خوشی تھی وہ تھی ارتضی کی آمد جس دن سے وہ امریکہ سے آیا تھا گھر بھر میں ایک ہلچل ایک رونق سی آ گئی تھی شادی کے ہنگاموں میں تیزی آ گئی تھی۔ تین دن پہلے سے ان کی کزنز کو ارتضی اکٹھا کر کے لے آیا تھا اور پھر ڈھولک رکھ کے خوب بے سرے گانے گائے رونق میلے سے گھر میں شادی والا ہنگامہ مچ گیا تھا۔ پھر تین دن مسلسل ہی یہ سب ہوتا رہا۔

اور پھر نکاح کا دن بھی آن پہنچا۔

میرب-------------------اومائی گاڈ

--------------یہ تم ہو

------------------------کرن نے پارلر میں تیار ہونے آئی میرب کو نکاح کے جوڑے میں دلہن بنی دیکھا تو بے اختیار اسے گلے لگا کے اس کے گال پہ بوسہ دیا۔ میرب کرن کے اس والہانہ پن سے جھینپ گئی۔ ارتضی کی شوخ آنکھیں بھی اسے شرم سی دلا رہیں تھیں،

ارتضی اسے پارلر چھوڑ گیا تھا اب کرن اور وہ دونوں اسے لینے آئے تھے۔

چلو جی دلہن صاحبہ گھر چلیں،،،،،،،،،شایان صاحب پارلر میں ہرگز نہیں آئیں گے نکاح پڑوانے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ارتضی نے اسے چھیڑا تو مارے شرم کے اسے سمجھ نہ آئی غصہ کرے کہ ڈانٹے۔ اتنے میں ارتضی نے آگے بڑھ کے اس کے سر پہ پہلے ہاتھ رکھا پھر ایک بازو اس کے کندھے پہ پھیلا کہ اسے ساتھ لگایا میں تم سے ناراض ہوں ابھی بھی مصنوعی غصے سے کہ کے ہنس دیا تو دونوں کی آنکھوں میں نمی اتر گئی۔

اچھا بس بس میرب اور کرن چلو مما پاپا ویٹ کر رہے ہوں گے، ارتضی نے اپنا بازو ہٹاتے جلدی سے موجودہ صورت حال کو بدلا۔

اور تینوں اپنی اپنی جگہ دکھ سکھ کے ملے جلے جزبات لیئے گھر پہنچے۔

ارتضی جب سے لوٹا تھا میرب سے ناراض تھا کہ شادی تو کرن کی ہونا تھا۔ اس کا نکاح کیوں ساتھ ہو رہا ہے۔

ناراضگی کی وجہ تھی یہ کہ اگر وہ نہ آ پاتا تو کیا دونوں اس کے آنے کا انتظار کیے بنا شادی کر کے چلی جاتیں۔ وہ جو اس کے بنا ماموں کے ہاں نانو کے بلانے پہ بھی نا جاتی تھی اب پرائے گھر جا رہی تھی،،،،،،دل اداس تھا۔ اور ناراضگی اداسی بھلانے کا بس بہانہ تھی۔ اس کی شادی کا جہاں کچھ پتہ نہیں تھا وہاں وہ بھی امیریکہ تھا۔ سب اتنا جلدی ہو گا کہ وہ اداس اداس سا تھا ان دونوں کے اس گھر سے جانے پہ حالانکہ میرب کا بس نکاح تھا مگر وہ پھر بھی ناراض تھا۔ اور اسی ناراضگی کی وجہ سے میرب سے بات بند کی ہوئی تھی۔

ارتضی جب سے امریکہ سے آیا تھا شادی کے سارے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیئے تھے۔ وھاب اس کے آجانے سے خود کو ریلیکس فیل کر رہے تھے۔ مہمونہ اس کے آجانے سع مطمئن تھی کہ یہ تو ان کے گھر کی رونق تھا۔ کرن کو ہر وقت ہنسانے والا اسکی شادی پہ آگیا تھا جس کی کمی اس نے بہت محسوس کی تھی نکاح پہ۔ میرب سے تو خیر اس کا گاڑھی دوستی تھی اس کو تو اس کے آجانے پہ بے حد خوشی تھی مگر اس کا ناراض ہونا اسے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ کتنی دفعہ میرب

نے کوشش کی اس کو منانے کی مگر کوئی نہ کوئی اس کو بلا لیتا۔ ابھی بھی راستہ بھر اس نے کوشش کی مگر کرن اس کو جانے کون کون سے رشتہ داروں کی کہانیاں سنا رہی تھی۔

کرن اور اقراء نے اسے کمرے میں چھوڑا اور خود میرب کے سسرال والوں کے ویلکم کرنے کو باہر چلی گئی۔ زیادہ لوگ نہ تھے کیوں کہ انکا نکاح سادگی مگر رخصتی دھوم دھام سے کرنے کا ارادہ تھا۔

شایان کریم ٹو پیس میں بڑے پر وقار اور وجیہہ لگ رہے تھے۔ زارا کرن اقراء مہمونہ سے مل کے میرب کو دیکھنے چلی گئی۔ سمیرا مہمونہ اپنے اپنے رشتہ داروں کے تعارف کروانے لگی۔ کچھ ہی دیر بعد نکاح کی رسم ادا کی گئی۔ کھانا کھایا گیا۔

نکاح کے بعد کرن کو شایان کے پہلو میں بٹھا کے کچھ تصوریں لی گئی شایان نے کرن کو گہری اور بھرپور نظر سے دیکھا جبکہ کرن نے پلکوں کو اٹھانے کی کوشش بھی کی تو اٹھا نہ سکی اور یہ بات شایان کو بہت اچھی لگی اسکی شرم سی جھکی گردن اور لرزتی پلکوں نے اس کے دل کے تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔

میرن نے گولڈن لہنگا پہنا تھا۔ مناسب میک اپ اور جیولری نے اسے بے پناہ حسن بخشا تھا۔ شایان کو آج وہ اس روپ اور اس رشتے میں اور بھی دل کے پاس اپنی صرف اپنی لگی زندگی بھر کی ساتھی۔ اسکی محبت

-----------۔میرب شایان۔

اگلے دن کرن کی مہندی تھی سبھی سٹیج پہ بیٹھی ملکے پیلے اور ڈارک گرین چوڑی دار پاجامہ فراک پہ ڈھیروں پھولوں کے زیور پہنے کرن کو مہندی لگا رہے تھے مٹھائی کھلا رہے تھے اور پیسے وار وار کے ایک ٹوکری میں رکھ رہے تھے۔ میرب کے سسرال والے بھی آئے تھے۔ زارا سے اس کی اور اقراء کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ میرب ان کے اور اپنی کزنز کے ساتھ کچھ دیر وہیں کھڑے فنکشن انجوائے کرتی رہی پھر اسے ارتضی اندر جاتا نظر آیا تو اس نے سوچا کہ ابھی جا کہ اس کو منالے کیوں کہ وہ مسلسل اسے اگنور کر رہا تھا اور اسے یہ بات بہت پنچ کر

رہی تھی۔ وہ اند جانے کو بڑھ رہی تھی کہ اس نے شایان کو دیکھا اس کے کسی کزن سے باتوں میں مصروف مسکراتے وہ بے حد دلکش لگ رہا تھا میرب اندر جانا بھول کے اسے دیکھے

گئی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کچھ دیر بعد اقراء کی آواز نے اس کی محویت توڑی۔

یہاں کیا کر رہی ہو۔ اس کے پاس آ کے پوچھ رہی تھی۔

اارتضی کو منانے جا رہی ہوں۔ اندر کی طرف قدم اٹھاتے اسے بتایا۔ وہ بھی اس کے ساتھ چل دی۔

ارتضی ڈرائینگ روم میں کسی سے فعن پہ بات کر رہا تھا یہ بھی پاس جا کہ بیٹھ گئیں۔ اس نے گھورا بھی مگر اثر نہیں لیا گیا۔ دو منٹ مذید بات کر کے اس نے فون رکھ دیا۔ اور بولا ہاں کیا کوئی کام تھا۔ لہجہ اجنبی سا تھا۔

دیکھو ارتضی شایان سے نکاح میرب کی مجبوری تھی۔ آنٹی انکل کا فیصلہ تھا وہ۔ ورنہ یہ تم سے کتنا پیار کرتی ہے تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اقراء نے بات شروع کر کے میرب کی مشکل آسان کی۔

اقراء نہ بھی کہتی تب بھی وہ بہت اچھی طرح ہر بات جانتا تھا ہر بات وھاب نے فون سے اس کی تھی سارا کچھ اس کے مشورے کے ساتھ ہی ہو رہا تھا۔ وہ تو بس میرب کو تنگ کرنے کو ناراض تھا۔

ہاں تم جانتے ہو سب پھر بھی ناراض ہو رہے ہو مما پاپا کے فیصلے پہ میں کیا کرتی تم کوں سا یہاں تھے۔ میرب مان سے روٹھے روٹھے لہجے میں بولی تو ارتضی اس کے سر پہ چت لگا کہ ہنس دیا۔ اور باہر کھڑے شایان کے کانوں کے پاس شائید کوئی دھماکہ ہوا تھا۔ وہ فون کرنا چاہتا تھا کیرب کا کزن جس سے وہ باتیں کر رہا تھا اسے ادھر چھوڑ کے چلا گیا تھا اندر سے آتی آوازوں کو سن کے وہ پلٹنے لگا تھا جب اقراء نے اس کا نام لیا اور وہ اپنا نام سن کے بے اختیار رک گیا۔ اور اب جو کچھ اس کی سماعتوں میں اترا تھا اس سے ایک پل اہاں رکنا مشکل ہو گیا تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس گھر سے ہی چلا گیا۔ رش ڈرائیونگ کرتے بلاوجہ وہ سڑکوں پہ گاڑی دوڑاتا رہا۔ بار بار کانوں میں وہی فقرے گونج رہے تھے۔

شایان سے نکاح میرب کی مجبوری تھی۔

آنٹی انکل کے فیصلے سے وہ مجبور ہو گئی تھی۔

وہ ارتضی سے محبت کرتی تھی،

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اور یہ آخری بات سوچتے اس کا دم سا گھٹ رہا تھا لگتا تھا شائید ہوا میں آکسیجن کی کمی ہو۔ یہ باتیں ہتھوڑے بن کے اس کے دماغ پہ پڑ رہیں تھیں، اندر شدید ترین توڑ پھوڑ ہو رہی تھی۔ وہ جسے اتنے عرصے سے چاہتا آرہا تھا۔ اب اس کی منکوحہ تھی جس کے نام کے ساتھ اس کا نام تک جڑ گیا تھا۔ وہ کسی اور کو چاہتی

ہے۔---------------------------وہ

صافدل کا شدتوں سے محبتیں کرنے والا بندہ تھا۔ پہلی بار کسی نے اس کے دل کو چھوا تھا، پہلی بال کسی نے اس کی ٹھہری پر سکون زندگی میں اپنے احساس کا پتھر مار کے ہلچل مچادی تھی۔ اب جب وہ ہر طرح سے اسکو اپنا سمجھ رہا تھا۔ اس انکشاف کے بعد ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا تھا۔ گھر آکے اس نے سونے کی بہت کوشش کی ان ساری سوچوں سے بچنے کے لیئے مگر نیند نے نہ آنا تھا نہ آئی تھی۔

شادی اور ولیمے پہ اس نے شرکت نہ کی سمیرا اور زارا دونوں نے بہت اصرار کیا قمر احمد نے بھی کہا مگر اس نے کام کا بہانہ بنا کے پہلو بچا لیا۔

اور دل تھا کہ چاہتا تھا اڑ کے جائے اور میرب کو ایک نظر دیکھ آئے۔ کوئی بے بسی سی بے بسی تھی کہ دل اب کوئی بات ماننا چاہتا ہی نہ تھا اتنا سب سن کے بھی دل اسی کی دید چاہتا تھا۔

شادی کے بعد دعاوتیں شروع ہوئی تو قمر انکل اور سمیرا آنٹی نے کرن کی شادی کی دعوت میں کرن ،نوریز کے علاوہ میرب کو بھی بلایا۔ وہ وہاں جانے سے ہچکچا رہی تھی مگر زارا نے بار بار کال کر کے اسے آنے پہ مجبور کر ہی لیا۔ کرن اور نوریز جاتے ہوئے اسے بھی ساتھ لے گئی اور کرن نے اسے خوب چھیڑا۔

اوہو نوریز آج تو لوگ سسرال جا رہے ہیں۔ اور میرب گاڑی سے باہر دیکھنا سروع کر دیتی ہونٹوں کی تراش میں ہلکی سی مسکراہٹ سج جاتی۔

دعوت شاندار تھی سبھی بہت چاہت اور محبت سے ملے زارا نے اسے سارا گھر دیکھایا کرنا اور زارا نے اسے تنگبھی کیا مگر کچھ کمی سی محسوس ہوئی مگر

کیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔آنٹی شایان کہاں ہے؟

نوریز بھئی کے سوال پہ اسے پتہ چلا کہ اسے کیا کمی محسوس ہو رہی تھی۔ بھائی ابھی آدھا گھنٹا پہلے گئے ہیں ۔ان کو کچھ ارجنٹ کام سے جانا پڑا ہے۔ زارا نے بتایا۔ پھر جب تک یہ وہاں رہے شایان نہیں آیا۔ سمیرا آنٹی اور زارا نے ان سب کو گفٹس دیئے انکی شادی کے اسکو اس گھر میں پہلی دفعہ آنے کا۔

کرن میں ارتضی کو بلا لیتی ہوں وہ مجھے واپس لے جائے گا میرب نے کرن سے کہا کیوں کہ کرن اور نوریز کو کہیں اور بھی جانا تھا اور اسے ڈراپ کرنے میں وہ لیٹ ہو جاتے یہاں بھی وہ بہت زیادہ دیر رکنے سے لیٹ ہو گئے تھے۔ ہاں ٹھیک ہے۔ پھر زارا سے پوچھ کے وہ فون کی طرف چل دی۔ ارتضی کو آنے کا کہہ کے فوں رکھا اور پلٹنے لگی تھی کہ بیل ہوئی اس نے یہ سمجھ کہ اٹھا لیا کہ ارتضی ہو گا مگر دوسری طرف شایان کی آواز سن کے کچھ بول نہ پائی جس نے اس کے ہیلو ارتضی کیا ہے کہنے پہ عجیب بات کہہ دی تھی۔

غصے اور گرجتے لہجے میں اس نے کہا

یہاں آنے کی ضرورت کیا تھی مجبوری اور ماں باپ کے فیصلے کو نبھانے سے بہتر فاصلے ہوتے ہیں میرب شایان۔

اور فون ٹھک سے رکھ دیا۔ اس کے لہجے میں کتنی تکلیف تھی کیا وہ اس کے ماں باپ کا اور مجبوری کا فیصلہ تھی۔ اس کے دماغ میں شائیں شائیں ہو رہی تھی ۔اس کا وجود ہلکے سے لرز رہا تھا خوف سے۔ پھر ارتضی کے آنے تک وہ بڑی مشکل سے وہاں رکی۔ گھر آ کے تھکن کا بہانہ کر کے سونے چلی گئی۔ اور اگلی صبح اسے بخار نے آ لیا تھا۔ اس نے یہ سب کیوں کہا کیا ہوا۔ کیا وجہ تھی اسے اتنا سوچنے پہ بھی کچھ سمجھ نا آئی۔ لیکن اس سب میں اس نے ایک بات سوچ لی تھی کہ جو بھی ہو وہ یہ بات مما پاپا کو یا کسی اور کو نہیں بتائے گی۔ اور اس نے ایک سال سے یہ بات خود سوچی تھی خود کی نیندیں گنوائیں تھی مگر کہا کسی سے کچھ نہیں

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس سب سے عجیب بات جو ہوئی تھی وہ تھی اس کے دل میں دن بہ دن بڑتی چاہت اسکی محبت۔

اسکے نام کے ساتھ جڑا شایان کا نام اسے اتنا پسند تھا کہ اکثر دعا کرتی تھی کہ اس کی زندگی میں کبھی اسکا نام

اسکے نام سے جدا نہ ہو۔

ایک سال ہو گیا تھا اس کے بعد نہ اس نے شایان کو دیکھا نہ کبھی اس سے بات ہوئی مگر وہ پہلی اور آخری بات اس کے دماغ سے کبھی نہ نکلی۔

"وہ پتہ نہیں اور کتنی دیر بیٹھی سوچتی رہتی مگر کچن سے کھٹ پٹ کی آوازوں کو سن کے اندر گئی تو ارتضی کو کچن میں پا کے خیال آیا کے اس نے تو کچھ بنایا ہی نہیں ابھی اسے شرمندگی نے آلیا تھا۔

کیا کر رہے ہو۔۔ پیچھے ہٹو میں بناتی ہوں کھانا۔ ارتضی اکثر اس کے ساتھ کچن میں کوکنگ کیا کرتا تھا ابھی بھی وہ چکن نکال کے سوچ رہا تھا کس طرح بنائے جب میرب نے اسے کہا تو وہ اس کی طرف مڑتے ہوئے بولا چکن پکوڑا یا چکن پلاؤ؟؟؟؟

میرب کو چکن پلاؤ پسند تھا اور ارتضی کو چکن پکوڑا۔

چکن پکوڑا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ساتھ ہی اس نے چکن پکوڑا بنانے کے لیئے مصالحے نکالنا شروع کر دیئے۔

دونوں نے مل کے چکن پکوڑے بنائے ارتضی نے سلاد کاٹی اور میرب نے پھلکے بنائے۔ کھانا کھا کے دونوں نے مل کے کچن صاف کیا۔ اور اپنے اپنے چائے کے مگ لے کے لاؤنج میں گلاس وال کے پاس آ بیٹھے ۔باہر ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ دونوں کے چائے پینے تک وباب اور مہمونہ بھی آ گئے۔ کچھ دیر سبھی باتیں کرتے رہے تھے کرن کی ماموں کی نانو کی۔۔

جب اٹھنے لگے تو فون کی بیل ہوئی، میرب فون کے پاس بیٹھی تھی تو اس نے ریسیور اٹھا کے کان سے لگا لیا۔

ہیلو۔

اسلام علیکم میرب بھابھی۔

واعلیکم اسلام۔ دوسری طرف زارا تھی۔ کیسی ہو زارا؟ زارا اور سمیرا آنٹی اکثر اسے کال کیا کرتی تھیں۔

میں ٹھیک ہوں بھابھی آپ کیسی ہیں۔

میں بھی بلکل ٹھیک ہوں، اور گھر میں سب کیسے ہیں؟ وہ کبھی کسی اور کا نام لے کے حال نہیں پوچھا کرتی تھی بس یہی کہا کرتی تھی گھر میں سب کیسے ہیں۔

ٹھیک ہیں سبھی۔ بھابھی میں آپ کو کسی خاص کام کے

لیئیے فون کیا ہے۔زارا نے اس سے کہا۔

ہاں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔کہو کیا کام ہے،

بھابھی کل میرا برتھ ڈے ہے۔میری دوستوں نے مجھے پارٹی کا کہا ہے۔

ہیپی برتھ ڈے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تو پارٹی دینے میں کوئی مسئلہ ہے۔

بھابھی میری دوستوں نے خاص آپ کو دیکھنے کی فرمائیش کی ہے۔آپ کے نکاح پہ بلایا نہیں تھا-اب میرے منہ سے آپ کا ذکر سن سن کے وہ آپ سے ملنا چاہتیں ہیں۔آپ آیئں گی نا بھابھی۔

اس نے اتنے مان سے اتنی محبت سے کہا تھا کہ میرب ڈائریکٹ انکار نہ کر پائی۔(کہتی بھی تو کیا۔۔۔یہ کے پہلے اپنے بھائی سے تو پوچھ لے جس نے اس رشتے کا فیصلہ،فاصلہ منتخب کیا تھا)

بھابھی۔۔۔۔۔؟اس کی خاموشی سے اسے لگا لائن کٹ گئی ہے تبھی اس کو پکارا۔

ہاں۔۔۔۔۔زارا اس طرح اچھا نہیں لگتا۔میں کسی کو جانتی نہیں ہوں،یوں کتنا۔۔۔۔۔۔۔

آنٹی کہاں ہیں۔زارا نے اس کی بات کاٹ کے میمونہ کا پوچھا۔

یہیں ہیں۔اس نے مہمونہ کی طرف دیکھ کے کہا۔

بات کرا دیں پلیز۔اور اس نے رریسیور مھمعنہ کی طرف بڑا دیا۔

زارا نے مہمونہ سے بات کر کے نا صرف اس کے آنے کی اجازت لی بلکہ پک اینڈ ڈراپ کی ذمے داری بھی لے لی۔

ارتضٰی کو اسنے زارا کے لیئے گفٹ خریدنے کے لیئے ساتھ مارکیٹ لے جانے کو روک لیا تھا۔

جلدی کرو بعد میں مجھے پاپا کے پاس بھی جانا ہے۔اس کے پورچ میں آتے ہی اس نے جلدی مچادی۔مارکیٹ میں بھی اس نے زیادہ کچھ دیکھنے نا دیا بس اپنے مشورے پہ زارا کے لیئے اسے شاپنگ کروائی اور گھر چھوڑ کے خود پاپا کے پاس آفس چلا گیا۔

مہمونہ کی ہدایت پہ اس نے ڈارک پرپل ہلکے کام والی

ساڑھی باندھی۔ ہلکا سا میک اپ کیا اور کانوں میں ہمیشہ والے چھوٹے چھوٹے ڈائمنڈ ٹاپس رہنے دیئے۔ گلے میں باریک سی گولڈ کی چین اور ایک ہاتھ میں سٹون کی میچنگ بریسلیٹ پہنی۔ بالوں کو اکھٹا کر کے دائیں طرف سامنے ڈال لیا تھا۔ تیار ہو کے ایک تنقیدی نگاہ خود پہ ڈالی اور باہر نکا گئی۔

میمونہ نے اس کو دیکھ کے دل ہی دل میں اس کے بلائیں لیں۔

اور پندرہ منٹ اسے انظار کرنا پڑا تھا۔ زارا جب اسے لینے آئی تو اس کی تیاری کو دیکھ کے بہت خوش ہوئی اس کے گلے مل کے اس کے گال پہ پیار کیا۔

وہ جب گھر پہنچیں تب تک اس کی کوئی دوست نہیں آئی تھی۔ سمیرا بڑی گرمجوشی سے ملی۔ وھاب اور شایان گھر نہیں تھے۔ اس نے وھاب کا حال پوچھا تو سمیرا نے اسے بتایا کے دونوں آج کسی ڈنر میں انوائٹ ہیں اس لیئے دونوں کو جانا پڑا۔

اور جانے کیوں میرب کا دل بجھ سا گیا تھا۔ زارا کی دوستیں اسے مل کے بہت خوش ہوئیں۔ کیک کاٹا گفٹس دیئے سب نے خوب ہلا گلا کیا۔ پھر پر تکلف کھانا کھایا گیا۔ بعد میں چائے کافی پینے تک زارا کی سبھی دوستوں نے خوب انجوائے کیا، میرب نے انکا بھرپور ساتھ دیا مگر اسے مزا کیوں نہیں آرہا تھا یہ اسے خود بھی سمجھ نہیں آرہی تھی۔

ایک ایک کر کے زارا کی ساری دوستیں رخصت ہونے لگیں تو اس نے بھی زارا سے کہا کے اسے گھر بجوا دے۔ سمیرا نے اس بار بھی اسے کئی گفٹس دیئے جسے اس نے لینے سے انکار کیا تو انہوں نے کہا۔

بس میرب بیٹا اب کچھ نہیں کہنا میرے شایان کی دلہن ہو تم۔۔۔ خالی ہاتھ تو کبھی بیجھوں گی میں تمہیں۔ ویسے بھی اب تمہارا حق بنتا ہے۔

اتنے خوبصورت لفظوں اور شایان کی دلہن ہونے کے مان نے احساس نے اس کے بجھے دل کو بڑی خوبصورتی سے دھڑکا دیا تھا۔ پھر اس نے انکار نہیں کیا بلکہ گفٹس لے لیئے تھے۔ پھر جب وہ پورچ میں پہنچی جانے کے لیئے وھاب اور شایان کی گاڑی اسی وقت گیٹ سے اندر داخل ہوئی۔ میرب نے ڈرائیونگ سیٹ پہ شایان کو اپنی طرف دیکھتے پا کے نظر جکالی۔ کتنی اپنائیت تھی اس کی آنکھوں میں اس کے لبوں پہ مسکراہٹ سج گئی،

پھر وھاب گاڑی سے نکال کے ان کی طرف آئے
بڑی شفقت سے اس کے سر پہ ہاتھ رہا اس کا ماتھا چوما۔
اور اپنے ساتھ ایک کپ کافی پینے کی دعوت دیتے اندر
لے گئے۔ شایان کی اس کی بس ہلکی سی سلام کی آواز
سنی تھی۔ ان سے پہلے وہ اندر چلا گیا تو اسے پھر اس
کے فعن پہ سال پہلے کے کہے لفظ یاد آئے۔ اور دماغ
پھر الجھ گیا اسی ادھیڑ بن میں کے کیا وہ وّاقعی اس کے
لیئے مجبوری کا بندھن اور ماں باپ کاٍ فیصلہ ہے۔ بڑی
مشکل سے اس نے کافی کے کڑوے گھونٹ اندر
انڈیلے تھے۔ شایان اندر انکے پاس نہیں آیا۔
شایان کتنی محبت کرتا تھا اس سے۔ کتنا چاہتا تھا اسے۔
اور آج وہ اس کے گھر میں آئی تھی اسکی بہن کے
بلانے پہ۔۔۔۔۔۔۔اس کے حوالے
سے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اسکے نام کے ساتھ
کی وجہ سے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مگر وہ اس
کو ایک نظر بھر کے دیکھ نہیں سکتا
تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بات نہیں کر سکتا
تھا۔ کیسے کرتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اپنی جلد بازی کی
عادت سے اسے کیا کچھ نا کہا تھا اس

نے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ تو رات کو سوچ رہا تھا کے وہ
نہیں آئے گی۔ زارا کو منع کر دے گی اور جب زارا وجہ
پوچھے گی تو سب کہہ دے گی۔
مگر
اس نے کچھ نہیں کہا اور آ بھی گئی۔ اب وہ اپنی نظروں
میں شرمندہ سا ہو رہا تھا، کیسے سامنا کر سکتا تھا اسکا۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔
۔۔۔
شایان محبت کو کوئی اہمیت نا دیتا تھا اور پہلی نظر کی محبت
اس کی نظر میں سراسر حماقت تھی۔۔۔۔۔۔۔ پھر
تقدیر نے اس پہ اس حماقت کو کھولا۔ کس قدر
خوبصورت احساس تھا یہ۔ اسے میرب سے محبت ہو
جانے کے بعد پتہ چلا۔ کرن کی شادی پہ اس نے جو سنا
اس کو سمجھے بنا وہاں سے چلا آیا اور یہ اس نے اپنے
ساتھ اور میرب کے ساتھ غلط کیا

تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس کی محبت کو جب شرعی اور قانونی نام ملا تو میرب کے منہ سے ارتضی کے لیئے محبت کا سن کے اسے لگا کوئی اس کے کل متاع چھین رہا ہو۔ میرب کو کھونے کا خیال اسے وہشت زدا کر رہا تھا۔ اسی لیئے کرن کی دعوت والے دن گھر سے بہانہ بنا کے چلا گیا تھا وہ بس میرب کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے گھر فون اپنے لیٹ آنے لا کہنے کے لیئے کیا تھا مگر فون سے میرب کی آواز سن کے اتنے دنوں جو سوچا تھا بول کے فون بند کر دیا۔

اسے لگا تھا شائید میرب ارتضی سے محبت کرتی ہو۔ وہ اس کی پھوپھو زاد تھا۔ دہ ماہ کا تھا جب اس کا باپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ پاپا نے پھاپھو کی دو سال بعد شادی کر دی ارتضی بھی سحرش پھپھو کے ساتھ ہی گیا مگر جب انکر دوسرے شوہر کی اولاد ہوئی تو انہوں نے ارتضی کو پاس رکھنے سے انکار کر دیا۔ تب ارتضی کی عمر پانچ سال تھی۔ وھاب نے اسے اپنے پاس رکھ لیا۔ ان کو اللہ نے شائید اسی لیئے بیٹا نہیں دیا تھا بس دو بیٹیاں ہی دی تھیں۔ ارتضی کو مہمونہ، وھاب، کرن، میرب نے کبھی پرایا نہیں سمجھا تھا، وہ تو سگے بیٹے اور سگے بھائی سے زیادہ سگا تھا۔ سحرش اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ امریکہ کئی سال پہلے شفٹ ہو گئی تھی۔ خود تو آتی نہیں تھی بس ارتضی کو ہی دو سال بعد ملنے بلا لیتی تھی۔ اس دفعہ انہوں نے ارتضی کو چھے ماہ اپنے پاس ٹھہرایا تھا۔ اس کا رشتہ اور نکاح کی ڈیٹ اس کے وہاں ہوتے ہوئے اس کے ہی مشورے سے وھاب مہمونہ نے رکھی تھی۔ اس لیئے شایان اسے جانتا نہیں تھا نہ ہی اس کا کوئی خاص زکر ہوا تھا۔ اسے تو غلط فہمی ہونا ہی تھی۔

کرن کی شادی کے ایک ڈیڑھ ماہ بعد اس کے متعلق زارا ماما بات کر رہیں تھیں۔ وہ پاس بیٹھا تھا، تب اسے ارتضی اور میرب کے رشتے اور پیار کی وجہ معلوم ہوئی۔ اسے اپنے آپ میں شرمندگی بھی محسوس ہوئی اور ایک عجیب سی خوشی اور اطمنان کی لہر بھی اندر دوڑی کے میرب بھائی کے رشتے سے ارتضی سے محبت کرتی ہے۔ اور وہ بس اسی کی ہے۔ اب اسے ارتضی اور اس کی محبت پہ اعتراض نہ تھا۔ زارا کی ارتضی کے ساتھ بات طے کرنے میں شایان کی بھی مرضی شامل تھی اسی لیئے کئی دفعہ وہ ارتضی سے ملا

بھی تھا کھلے اور صاف دل

سے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔مگر میرب کی شکوہ کناں آنکھوں کا سامنا کرنا اسے ابھی بھی مشکل لگ رہا تھا۔ اپنے کمرے میں آ کے بنا کپڑے بدلے وہ بیڈ پہ آڑھا ترچھا لیٹا میرب کے بارے میں سوچ رہا تھا جب دروازے پے ناک کر کے زارا اندر آئی۔

بھائی آپ تھک تو نہیں گئے۔ اس نے اس کو یوں لیٹے دیکھ کے پوچھا۔

ہاں۔۔ نہیں تو۔ کوئی کام تھا۔ اٹھتے ہوئے بولا۔

جی بھابھی کو چھوڑنے جانا ہے۔ ممی کہہ رہیں ہیں ٹائم بہت ہو گیا ہے ڈرائیور کی بجائے آپ ہمارے ساتھ چلیں۔

ہمارے ساتھ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔؟؟؟؟ کون

کون جا رہا ہے؟

میں اور بھابھی

ہمممم۔۔۔۔۔۔ تم ایسا کرو رہنے دو مما سے کہو میں خود چھوڑ آتا ہوں۔

او۔۔۔۔۔ ہو۔۔۔۔۔۔۔زارا نے شرارتاً ہانک لگائی

۔

اچھا جاؤ میں آ رہا ہوں۔ زارا کو بھیج کے وہ کچھ سوچتے رہے پھر اٹھ کے باہر کی طرف چل دیئے۔

میرب گاڑی میں پیچھے بیٹھی تھی جب ڈرائیونگ سیٹ پہ شایان کو بیٹھتے دیکھا تو ایک پل کو تو اس کا سر چکرا گیا۔ الہیٰ یہ کیا ہے۔ کیا آج وہ پھر کچھ کہنے والا یا غصہ کرنے والا ہے۔

گاڑی گھر سے کچھ دور جا کے روکتے شایان نے اسے فرنٹ سیٹ پہ آنے کو کہا۔ تو اس کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی کے شایان کے ہاتھوں آج خوب بے عزت ہو گی۔ مرتا کیا نہیں کرتا کے مصداق اسے بھی آگے آنا پڑا۔ دل کی دھڑکن کافی تیز چل رہی تھی۔ ماتھے پہ پسینہ آ رہا تھا۔ کچھ دیر تو کوئی نہ بولا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔بس دونوں اپنی اپنی جگہ ایک ہی بات کو مختلف انداز سے سوچتے جا رہے تھے۔ میرب کو اس سوچ سے اپنی نم ہوتی آنکھوں کو خشک رکھنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ شایان لاعلم نہ تھا ڈرائیونگ کرتے کئی بار سر موڑ کر میرب کے جھکے سر اور گود میں رکھے ہولے

سے کانپتے ہاتھوں کو دیکھ چکا تھا۔

گھر میں سب کیسے تھے؟

میرب نے شایان کی آواز سنی مگر اپنا پھر اسے اپنا وہم سمجھ کے جواب نا دیا۔

ناراض ہو؟

اب کہ میرب کو اپنی سماعتوں پہ بم گرتا محسوس ہوا۔ بے یقینی سے شایان کو دیکھا جانے کیوں شایان کے لبوں پہ مسکراہٹ دوڑ گئی۔ اور میرب کو لگا تھا اب وہ بس چکرا کے بے ہوش ہونے والی ہے پہلے غصہ پھر جھنجھلاہٹ پھر بلانا پھر اب مسکرانا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اللہ یہ کیا ہے؟ کیا یہ شخص مجھے ہی مخاطب کر رہا ہے؟ کیسی بے یقینی سی بے یقینی تھی اس پل کہ اسے جواب تک دینا بھول گیا تھا۔

میں شائید بہت جلدری ایکٹ کر جاتا ہوں جس وجہ سے اکثر مجھے بعد میں خود بھی پریشانی ہوتی ہے۔

شایان کو خود بھی سمجھ نہیں آئی اس نے اسے یہ وضاحت کیوں دی۔

آپ۔۔۔

آپ کو کسی مجبوری کی وجہ سے خود پہ جبر کر کے اپنے فیصلے کو بدلنے کی ضرورت نہیں۔ میرب کو لگا وہ اس کو شائید ایک بار پھر سے ناپسندیدہ مجبوری میں بندھا رشتہ یاد دلانے لگا ہے۔ اس لیئے فوراً بول گئی۔

شایان نے حیرت سے اسے دیکھا اس کے لفظوں پہ غور کیا مجھے یہ عزت افزائی کبھی نہی بھولے گی ہمیشہ یاد رہے گی اور گاڑی کی سپیڈ بڑھا دی شایان کی یہ بات میرب کی ریڑھ کی ہڈی سنسناہٹ دوڑا گئی تھی وہ تو پہلے ہی ناپسندیدہ تھی اب کیا مزید۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اوہ میرے مالک یہ کیا ہو گیا۔ ایک دم سے بہت سارا غصہ اسے خود پہ آیا کیا تھا اگر آج بھی وہ کچھ کہہ دیتا زیادہ سے زیادہ وہ یہی کہتا نہ کہ وہ اسے پسند نہی مجبوری کا بندھن ہے کہہ لیتا۔ مجھے تو اس سے محبت ہے نہ میں نے کیوں کچھ کہا افسوس در افسوس ہو رہا تھا اب اسے مگر اب پچھتاوا کسی کام کا نہ تھا۔

پھر سارے رستے دونوں میں سے کوئی نا بولا۔ گھر کے گیٹ پہ گاڑی روک کے میرب کو اتارا وہ بھی آہستہ سے خدا حافظ کہہ کے اتر گئی اور وہ زن سے گاڑی

دوڑاتا چلا گیا میرب نے اس کی دور ہوتی گاڑی کو دیکھا اور ایک تھکی ہوئی سانس خارج کر کے بیل پہ ہاتھ رکھ دیا۔

کس کے ساتھ آئی ہو؟ مہمونہ نے اسے اندر آتے دیکھ کر پوچھا۔

شایان چھوڑ کے گئے ہیں۔ اس نے صوفے پہ بیٹھ کے سینڈلز کے سٹر پس کھولتے جواب دیا۔

چھوڑ کے چلے گئے ہیں؟ تم نے اندر آنے کو کیوں نہیں کہا؟

وہ مما۔۔۔ مما وہ جلدی میں تھے ان کو کہیں جانا تھا اس لیئے نہیں آئے۔ میرب نے آنکھیں چراتے ہوئے کہا اور سینڈل اٹھا کے اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

کبھی کبھی جس ٹائم اور جس بات سے ہم بہت دکھی ہو رہے ہوتے ہیں وہ بات وہ وجہ اصل میں موجود ہوتی ہی نہیں۔ شایان کو غلط فہمی ہوئی ختم بھی ہو گئی مگر میرب کبھی اس کہ کہے لفظ بھول ہی نہیں پائی اور بھولتی بھی تو کیسے اسے کون سا بتایا گیا تھا کہ وہ جس بات سے سو نہیں پاتی جس بات سے اس کا سکون غرق ہوا ہے وہ ہوئی اور ختم ہو گئی۔ یہی بات ہم غلط کرتے ہیں اور ہمارے اکثر رشتے اسی وجہ سے ہم دور ہو جاتے ہیں جب ہم کسی کی کسی بات سے غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں تو اپنے جزبات ہر حال میں ہر موقع پر کہنے میں جلدی کرتے ہیں ہم چاہتے ہیں جو تکلیف ہم سہہ رہے ہیں وہ اگلا بھی محسوس کرے، مگر جب وہ غلط فہمی دور ہو جائے تب ہم کبھی بھی اپنے جزبات دوسرے کو نہیں بتاتے کہ اگلا ہمیں کمزور نا سمجھ لے ہمیں کچھ کہہ نا دے۔ بس ہمارا بھرم بنا رہے۔ ہمیں غلط فہمی ہوئی اور دور ہو گئی مطلب سب سہی ہو گیا۔ شایان کے اور میرب کے درمیان بھی یہی ہوا تھا۔ شایان کو غلط فہمی ہوئی تو میرب کو کیا کچھ سنا دیا۔ مگر جب بات کلیئر ہوئی تو چپ سادھ لی کہ سب سہی ہو گیا ہے۔ سب سہی شایان کے لیئے تو ہوا تھا میرب کے لیئے تو آج بھی وہی صورتحال تھی۔

تم نے مجھے کالج سے لیٹ کروا دیا نا تو میں تمہارا سر پھاڑ دوں گی میرب تیسری دفعہ اسے اٹھانے آئی تو غصے

سے غرا کر کہا۔

تم ابھی پھاڑ دو تاکہ میں آرام سے سو جاؤں ارتضی نے بستر پہ لیٹے لیٹے جواب دیا۔

اچھا

ٹھیک ہے پاپا کو جا کے فون کرتی ہوں وہ دھمکی دے کے ابھی مڑی ہی تھی کہ وہ کمبل پھینکتے اٹھ بیٹھا۔

میرب۔۔۔۔۔۔

ہاہا۔۔۔۔ جلدی کرو میرا آج ٹیسٹ ہے لیٹ نہیں ہونا چاہتی۔ وہ حکم دے کہ بھاگ گئی۔

اور ارتضی منہ میں بڑبڑاتے اٹھ کے واش روم میں گھس گیا۔

اس وقت وہ دونوں پیریڈ لے آئیں تھی اگلے دو پیریڈ فری تھے اس لیئے کالج میں اپنی فیورٹ جگہ سیڑھیوں پہ آ کے بیٹھ گئیں تھیں۔

مجھے تم نے بتایا نہیں کہ کل کا دن سسرال میں کیسا رہا اقرا نے تجسس سے پوچھا۔

میرب کو ایک دم سے شایان کی باتیں یاد آئیں۔ تو ہلکی سی اداسی کی لہر نے اسے چھوا۔ (کیا بتاؤں کہ کل وہ پھر مجھے وہی سب کہنے لگا تھا جو پہلے کہہ کے میرا سکون غارت کیا تھا)

اوہو۔۔۔۔ تم تو سوچوں میں ہی ڈوب گئی ہو کچھ بک بھی دو۔

میرب نے سر جھٹک کے اقرا کو گھورا جو اب اسے چھیڑ رہی تھی۔

سوچ لو سوچ لو شایان بھائی کو زیادہ فضول ہانکنے کی ضرورت نہیں۔

چلو تم بتا دو کوئی کیا کام کی بات ہوئی تھی۔

تمہیں کیوں بتاؤں میں۔

اچھا جی تو ہم سے پردہ داری ہے کیا۔

ہاں ہے تو میرب کو اب اسے چڑانے میں مزا آ رہا تھا۔

دفع ہو جاؤ پھر۔

اوکے جو حکم میرب اپنی بکس اور بیگ لے کے اٹھ کھڑی ہوئی دو تین سٹیپ اتر کے بولی۔

اٹھو بھی کینٹین چلیں بھوک لگ رہی ہے مجھے۔

دفع ہو جاؤ اقراء اس کے ساتھ اترتے ہوئے بولی

دونوں یوں ہی نوک جھونک کرتیں کینٹین جا پہنچیں۔

میرب کو اقراء کی عادت کا پتہ تھا وہ بات کے پیچھے پڑنے والوں میں سے نہیں تھی نہ ہی بلاوجہ منہ بنانے

والی اسی لیئے شایان کی بات ناہو اس نے آرام سے گھما دی تھی۔

میرب کی خالہ زاد روبی ان کے گھر رہنے آئی تھی ان دنوں اور ہر وقت ارتضی کے آگے پیچھے رہتی تھی جیسے اس گھر میں وہ بس ارتضی کے لیئے ہی تو آئی ہو۔ جب سے میرب شایان کی طرف سے ہو کے آئی تھی اس کا بلاوجہ موڈ آف رہنے لگا تھا۔ کچھ روبی کے آ جانے سے ہر وقت کی ہلچل سے اسے چڑ ہونے لگی تھی۔ آج اس کے ویسے ہی سر میں درد تھا مما پاپا کرن کی طرف گئے تھے اور روبی اس وقت سو رہی تھی۔ میرب نے ٹھنڈے پانی سے ہاتھ لیا اور ایک ناول لے کے لان میں آ گئی گرمیوں کی شام میں بھی اسے نیند نہیں آتی تھی دن میں۔ اس لیئے گرمیوں کے دن اسے ہمیشہ برے لگتے تھے۔ ابھی وہ بڑے انہماک سے ناول کے اینڈ میں ڈوبی تھی جب روبی بھی وہیں چلی آئی۔

کیا ہو رہا ہے بھئی اس کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھتے پوچھا۔

ناول پڑھ رہی ہوں۔ میرب نے ایک نظر اٹھا کے اسے دیکھا اور جواب دے کہ پھر ناول پہ آنکھیں جما لیں۔

میرب ایک بات پوچھوں۔ کچھ دیر بعد وہ پھر بولی۔

جی پوچھیں۔ ناول بند کر کے رکھ دیا روبی کو کمپنی دینے کے خیال سے۔

تمہارے سسرال میں کوئی ان بن ہو گئی ہے کیا؟ روبی نے بڑے طنزیہ انداز سے پوچھا۔

کیا مطلب کیسی ان بن؟

دیکھو مجھے آئے ایک ہفتہ ہو گیا ہے مگر کبھی تمہارے شوہر کی کال نہیں آئی نہ ہی میں نے کبھی تمہیں فون کرتے دیکھا ہے شایان کو۔

تو؟

تو ہی تو پوچھ رہیں ہوں سب ٹھیک ہے کہ نہیں۔

میرے فون نا آنے یا نا جانے سے کچھ خراب ہونا کیوں لگا آپ کو؟

دو سال پہلے میری منگنی ہوئی تھی اپنی تایا زاد سے وہ مجھے دن میں دو تین بار کال کرتا تھا اور میں بھی اسے

کرتی تھی۔ تمہارا تو نکاح ہوا ہے تمہارا تو بار بار کال کرنا بنتا ہے۔ جبکہ یہاں تو ایسا کچھ نہیں ہے تو ظاہر ہے کچھ تو ہے وجہ۔ روبی نے بڑے مزے سے اسے دلیل دی یوں جیسے اس نے میرب کی بہت بڑی کمزوری پکڑی ہو۔ اور میرب اتنی بودی دلیل سن کے تاسف سے سر ہلا کے رہ گئی۔

دیکھا اسی لیئے مجھے لگ رہا تھا کوئی بات ہے۔ میرب کی چپ کو ہاں سمجھ کے روبی اپنے تکے پہ اٹھلائی۔

آپ کی وہ منگنی ابھی بھی ہے؟ میرب نے جواباً سوال کیا

نہیں وہ تو چھ ماہ بعد ٹوٹ گئی تھی۔

کیوں؟

میری تائی کو مجھ سے جلن ہونے لگی تھی۔

وہ کیوں؟

سجاد مجھ سے فون بات کارتا تھا اور میری ہر بات مانتا تھا وہ تو کھانا کھاتے اٹھتے بیٹھتے مجھے کال کرتا تھا تائی کو بس میرا اور اس کا پیار کھٹکنے لگا تھا ہر وقت بس وہ یہ چاہتیں تھی کہ سجاد مجھ سے بات نہ کرے جلنے لگیں تھیں۔ روبی کے لہجے میں اپنی تائی کے لیئے نفرت تھی۔

دن میں کتنے گھنٹے کال ہوتی تھی آپ کی؟

تین چار دفعہ وہ کال کرتا تھا اور دو تین بار ہی میں کال کرتی تھی کبھی گھنٹے کی کبھی زیادہ دیر۔ وہ تو کام تک چھوڑ دیتا تھا مجھ سے بات کرنے کو۔ روبی نے بڑے فخریہ لہجے میں بتایا۔

(اسی لیئے تائی نے اپنی جان بچالی اپنی زندگی عذاب بننے سے) میرب نے کوئی جواب نا دیا بس سوچا-اور اسی وقت ارتضی کے آجانے سے روبی تتلی کی طرح اڑتی اس کے پیچھے منڈلانے لگی۔

فون پہ منگیتروں سے بات کرنا اسے اور کرن کو کبھی پسند نا رہا تھا کرن کتنے عرصے سے نوریز بھائی کو پسند کرتی تھی اسے علم تھا مگر کبھی کرن نے یا نوریز بھائی نے کال کر کے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اور جو شایان کی کال سننے کا اتفاق اسے ہوا تھا وہ ہی نہیں بھولی تھی۔

میرب اٹھو بھی تیار ہو جاؤ تمہارے سسرال والے آ رہے ہیں۔ تم نے کیا خوشی کا بخار کرا لیا ہے روبی نے شوخی سے فقرہ اچھالا میرب نے جواب نا دیا کرن بھی

آئی ہوئی مگر کچن میں کھانے کے انتظام میں لگی ہوئی تھی۔ مہمونہ نے روبی کو بیجھا میرب کو تیار کروانے کو آج اس کی شادی کی ڈیٹ رکھی جانی تھی اور یہی بات رات سے سوچ سوچ کی اسے بخار ہو گیا تھا۔ کسی کی زندگی میں مجبوری کا رشتہ بن کے شامل ہونا کس قدر اذیت ناک تھا وہ بھی اس شخص کی زندگی میں جس سے محبت ہو۔۔

میرب اٹھی اور اپنے کپڑے لے کے باتھ روم میں چلی گئی۔ واپس آئی تو روبی کو نا پا کے سکون کا سانس لیا۔ ہلکا سا میک اپ کیا بالوں کو کھلا ہی چھوڑ کے ایک تنقیدی نظر خود پہ ڈال کے باہر چل دی۔

سمیرا، قمر، زارا، مٹھائی اور پھلوں کے ٹوکرے لیئے آئے تو ایک دفعہ پھر اسے اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہونے لگا تھا کرن زارا اور روبی نے مل کے خوب اسے تنگ کیا۔ کھانا کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے سب کی مرضی سے شادی کی تاریخ دس دسمبر رکھ دی گئی تھی۔

آج سے دو ماہ پانچ دن بعد ہم آیئں گے او کے گھر پہ ہی رہنا تب تک کوئی پیغام ہو تو دے دو میں پہنچا دوں گی۔

زارا نے میرب کو کچن میں اکیلے پا کے پھر تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔

نہیں جی مجھے ڈاکیے کی ضرورت نہی پہلی بات کا جواب نہیں دیا لیکن اندر کہیں اک اداسی سی محسوس ہوئی۔

اممم سوچ لو سروس فری ہے زارا نے پھر شوخی سے کہا۔

میرب دو کپ چائے میرا دوست آیا ہے ارتضی نے کچن کے دروازے میں کھڑے کھڑے کہا اور ابھی پلٹنے ہی لگا تھا کہ میرب نے زارا کو دیکھ کہ آنکھیں شوخی سے مٹکائیں اور بولی ارتضی زارا کہہ رہی تھی کہ کوئی پیغام دینا ہو تو دے دو۔

ارتضی نے ایک نظر زارا کو اور ایک نظر میرب کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے واپس چلا گیا۔

زارا کی تو مارے حیرت کے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کیوں اب بولو نہ کچھ میرب نے اسے ٹہو کا دیا۔

توبہ بھابھی آپ نے یہ کیا کیا؟ وہ کیا سمجھیں گے؟ زارا اب تک شاک زدہ سی تھی۔

ہاہا۔۔۔۔۔جو سمجھنا تھا سمجھ لیا اب تو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔تم بڑا بول رہی تھی نا میرا

کیاحال کیاہوا تھاتم لوگوں نے اب پتہ چلا۔ میرب نے خوب ہنستے ہوئے جواب دیا۔

ہاں بڑی اچھی طرح اب زارا ارتضی کے جانے سے پہلے ہنس دینا یاد کر کے ہنس دی تھی۔

پھر جانے تک زارانے دوبارہ میرب کو نہیں چھیڑا اور اسی بات کو لے کے میرب نے دن بھر کی کسر زارا کو شوخ نظروں سے دیکھ کہ پوری کی۔

رات کو جب سونے لیٹی تو ایک خوشی اس بات کی تھی جو بھی ہے وہ شایان کے گھر اس کے پاس ہی زندگی بھر رہے گی۔ مگر پھر اسے افسوس ہونے لگا تھا وہ اسے مجبوراً بندھن میں باندھے ہوئے تھا ناپسند ہونے اور نا چاہنے کے بعد بھی۔ آہ یہ کیا کم تھا کہ باقی کی عزت خود اسے بے عزت کر کے گنوادی کتنا مشکل اور کھٹن ہو گا ساری زندگی کسی کی آنکھوں میں اپنے لیئے اجنبیت دیکھا اور کوئی بھی وہ جو زندگی ہو۔ اور اسی بات کہ افسوس میں کتنے آنسو بہا چکی تھی وہ اسے خبر نہی تھی سوچتے سوچتے اسے اب شایان پہ غصہ آرہا تھا اسے تو کہہ دیا تھا کہ مجبوری کا بندھن ہے تو پھر اپنے گھر والوں کو سادگی سے ہی سب کیوں نہ کرنے کو کہا۔

اصل میں میرب کو پریشانی اپنی اور شایان کی آخری ملاقات میں ہوئے والی آخری بات کی تھی۔

شادی کی تیاریوں میں بھی وہ بجھے ہوئے دل سے حصہ لے رہی تھی زیادہ تر وہ کرن اور مہمونہ سے کہہ دیتی جو آپ کو اچھا لگتا ہے وہی مجھے تو آپ ہی لے آئیں۔

دو دفعہ زارا اور سمیرا آنٹی اسے ساتھ لے گئیں جیولری اور لہنگا وغیرہ پسند کرنے اس نے جانے سے منع کیا تو مہمونہ نے ڈانٹ دیا کہ خوشیوں کہ موقعے پہ انکار کر کے سمیرا یا زارا کو دکھ نا دے اور بس پھر اسے جانا ہی تھا اور گئی تو سمیرا آنٹی نے جیولری، لہنگے کے علاوہ بھی کافی کچھ خریدہ۔

دوماہ پانچ دن ایسے گزرے جیسے دو ہفتے گزرے ہوں۔

مایوں، مہندی میں خوب رونق لگی تھی۔ شادی والے دن صبح فجر میں میرب کی آنکھ کھل گئی آزان ہو رہی تھی۔

حي علی الفلاح، حي علی الفلاح

میرب کے دل کو ان لفظوں نے مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچا وہ اٹھی وضو کیا جائے نماز بچھایا اور نماز

پڑھی بہت آرام سے خضوع وخشوع ک ساتھ۔ کوئی سکون ساسکون تھاجو اس وقت اسکے روح تک میں اترا تھا۔ دعا کے لیئے ہاتھ اٹھائے تو بہت سی دعاؤں کے بعد اس نے اپنے لیئے شایان کے لیئے بلکہ دونوں کے لیئے آنے والی زندگی کے پرسکون گزرنے کی اپنے شوہر کے دل میں اپنے کیئے تھوڑی سی جگہ کی اور جب اس نے اپنے اور شایان کے لیئے دعامانگنا شروع کی تو ہر وہ چیز مانگی جو دل کے نہاں خانوں میں حسرت بن کے رہتی تھی۔ اس قدر جذب سے وہ دعامانگ رہی تھی کہ جب آمین کہہ کے منہ پہ ہاتھ پھیرے اور جائے نماز اٹھارہی تو خود حیران ہوئی کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ کیا کیا دعامانگ رہی تھی کچھ دیر وہ خود ہی سوچ سوچ کہ ہنستی رہی اور پھر لیٹ گئی اور ساڑھے آٹھ کرن کے آٹھانے پہ اٹھی پھر وقت گزرتے پتہ بھی نا چلا سارے کام جلدی جلدی نپٹا کہ کرن اسے لے پارلر چلی گئی۔ اور وہاں وہ ہال پہنچیں جہاں بارات بھی پہنچنے والی تھی۔

زری کے کال والا ریڈ بھاری لہنگا اور بہت سی جیولرے اور میک اپ میں وہ بے حد حسین لگ رہی تھی مگر اسے اپنی تعریفوں کی کوئی خوشی نہیں ہورہی تھی بس سر جھکائے وہ گزرتے لمحے گن رہی تھی۔ شایان نے کالی شیروانی اور گلاب کے پھولوں کا ہار پہنا ہوا تھا جب میرب کو لاکہ اس کے پاس بیٹھایا گیا تو ہر کسی نے اس جوڑی کو سراہا۔ اقراء، کرن، روبی، اس کی کزنز نے مل کے رسمیں کی فقرے اچھالے مگر میرب نے کسی کی بات کسی رسم کو انجوائے نا کیا بلکہ جب دودھ پلائی کی رسم میں شایان کے بعد اسے دودھ پلایا گیا تو کافی ہو، ہا، کی سبھی نے اسے کوئی ہوش نہیں تھی وہ تو بس شایان کی ہنسی اور اس کی خوش لہجے میں بولنے کو آواز کو سن کے حیران تھی کہ یہ شخص کس قدر تیز ہے یا کمال کا ایکٹر ہے مجبوری میں بھی کتنا ہنس بول رہا ہے جبکہ مجھ سے زبان تک ہلانا دشوار ہو رہا ہے۔ انہیں سوچوں کو ساتھ رخصت ہو کے وہ شایان کے سنگ اس کے گھر آگئی رخصتی کے وقت اس کی آنکھیں خوب برسیں تھیں یہ تو لڑکیوں کا دل یا اللہ ہی جانتا ہے کہ وہ کس طرح کس دل سے اپنا سب کچھ چھوڑ کے کسی کے ساتھ چل دیتی ہیں یہ جانے بنا کہ آگے خوشیاں ملیں کیئں یا غم۔

بھابھی کوئی چیز چاہیئے ہو تو بتا دیں زارا نے اس کے
کمرے میں پہنچا کہ اس میک اپ سہی کرتے پوچھا۔
نہی کچھ نہیں میرب نے آہستہ سے کہا۔
سوچ لیں کچھ مس تو نہیں زارا نے شرارت سے
نظریں ادھر سے ادھر گھماتے کہا۔
میرب کو اس کی شرارت سمجھ نا آئی۔سب کچھ یہیں
ہے اور کچھ نہیں چاہیئے۔
اچھا یعنی آپ کا مطلب ہے میرا بھائی جو آپ کو ایک
نظر دیکھ کہ دل ہار گیا تھا اور بڑی محبت اور چاؤ سے بیاہ
کے لایا ہے اس کی کمی محسوس ہی نہیں ہوئی۔زارا نے
اسے کہا تو وہ آنکھیں پھاڑے زارا کو دیکھ رہی تھی کہ
اس کا بھائی جس کو پسند کرتا وہ،وہ نہیں کوئی اور ہے اور
یہ اسے وہ سمجھ رہی ہے۔
کک کس سے محبت۔۔۔۔۔۔۔۔میرب نے ہونٹوں
پہ زبان پھیرتے پوچھا۔
آپ سے۔۔۔۔۔۔پھر زارا نے اسے شایان کی
طرف کی محبت کا اسے بتایا تو اسے یقین نہ آیا کہ وہ اتنی
خوش نصیب بھی ہو سکتی ہے۔
اتنی خوش نصیب کہ وہ جس سے محبت کرتی ہے وہ

بدلے میں اس سے زیادہ اسے محبت کرتا ہے۔وہ آج
اللہ سے اپنے شوہر اپنی محبت کے لیئے دعا کر رہی تھی
کہ اللہ اس کے دل میں اس کے لیئے تھوڑی سی جگہ
دے دے اور اللہ نے اس کو سب کچھ صرف
اور صرف اسکا بنا کہ دے دیا تھا۔اس پہ سجدہء شکر تو
واجب تھا نا۔
زارا کے جانے کے بعد وہ کتنی دیر خوش ہوتی رہی پھر
اس کے ماتھے کی تیوری چڑھ گئی کچھ تو غلط تھا اگر یہ
بات ہوتی تو شایان فون پہ وہ سب کیوں کہتے۔اس کا
سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا اسی وقت شایان
اندر داخل ہوا اسلام کیا اور صوفی پہ بیٹھ گیا پانچ منٹ نہ
کچھ بولا نہ وہاں اٹھا۔بس چپ چاپ میرب کو دلہن بنا
اپنے کمرے میں بیٹھا دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں اللہ کا
شکر ادا کرتا رہا۔پھر اٹھا الماری کی دراز میں سے منہ
دکھائی کے کنگن نکال کے بیڈ پہ جا بیٹھا مما نے پسند کیئے
تھے کہہ کے اور پہنانے کو ابھی میرب کا ہاتھ پکڑنے
ہی لگا تھا کہ وہ بال اٹھی۔
پلیز شایان۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بند کریں یہ ڈرامہ
ہت ہو گیا آپ کے لیئے یہ مجبوری کا بندھن ہے نا

آپ نے تو فیصلے میں فاصلہ بھی سنایا تھا مگر پھر بھی مجبوراً آپ کو شادی کرنا پڑی تو ٹھیک ہے ہو گئی شادی اب مما کے کہنے پہ یہ مجبوری نبھانے کی ضرورت نہیں۔اس کا چہرہ لال بھبا کا ہو رہا تھا۔

شایان حیرت سے پہلے دیکھتا رہا پھر قہقہہ لگا کے ہنس دیا ااور میرب کو اس کی ذہنی حالت پہ شک گزرا۔

شایان نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کنگن پہنایا پھر دوسرے میں بھی پہنایا وہ مسلسل مسکرا رہا تھا اور میرب پریشان ہو رہی تھی۔

آئی ایم ریئلی ویری سوری۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

مجھے اس دن فون پہ وہ سب نہیں کہنا چھاہیئے تھا مگر میں کیا کرتا مجھے پہلی دفعہ کسی سے محبت ہوئی اور اس کے منہ سے کسی اور کے لیئے محبت کا نام سننا مجھ سے برداشت نا ہوا۔شایان اسے کرن کی مہندی کی رات والی اور پھر بعد میں اپنی غلط فہمی کے دور ہو جانے کی بات بتائی۔اور میرب قدرت کے اس اتفاق پہ حیرت زدا تھی جس دن اسے محبت ہوئی اس دن شایان کی محبت کا کیا عالم تھا۔

اور تم نے بھی تو مجھے بات کلیئر کرنے کا موقع نہیں دیا تھا اس دن۔زارا کی برتھ ڈے کا حوالہ دے کے میرب کے سر پہ دوستوں کی طرح ایک شت لگاتے ہوئے کہا اور میرب یاد کر کے کھکھلا کے ہنس دی۔

اب تو کلیئر ہوا نا میم کہ مجبوری کا نہیں محبت کا بندھن ہے جس کے لیئے سجدہء شکر ادا کرنا چاہیے۔میرب کو کچھ دیر پہلے کی اپنی اسی سجدے کو ادا کرنے کی بات یاد آئی تو ہنست ہوئے بولی ہا بلکل بنتا ہے۔

آؤ پھر اپنی زندگی کی ژروعات اسی سے کرتے ہیں شایان نے اپنا ہاتھ اس کی طرف پھیلاتے ہوئے کہا۔

میرب نے اٹھتے ہوئے اپنا ہاتھ اسکے ہاتھ میں دے دیا۔

انسان سمجھتا ہے کہ جس پل وہ غمگین ہے اور جس وجہ سے وہ غمگین ہے وہ شائید اسے تمام عمر غمزدہ رکھے گی ۔مگر یہ بھول جاتا ہے کہ مالک دوجہان غم کی وجہ کو بھی خوشیوں کی وہجی بنا دیا کرتی ہے اور جب ایسا ہو تو دل اپنے آپ سجدہ شکر مین جھک جاتا ہے۔

ختم شد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔واسلام

۔

از قلم شمائلہ ذاھد کراچی

جی سامعین آپ سن رھے ھیں اپنا کراچی fm اور میں ھو آپ سب کی دل عزیز ارحے. ارحم حسب معمول ماہ نور کا پروگرام سن رہا تھا اور ارسل غصہ میں پورے لان کے چکر لگا رھا تھا. ارے گھونچوں تو میرے ھاتھوں قتل ھو جائے گا. تجھے اور کوئی کام نہں ھے اس ماہ جبین کی گفتگو سننے کے علاوہ. ایسا کیا ھے اس میں. ارسل یہ سب تیرے سمجھ میں آنے والی باتیں نہیں ھیں مرے جگر. تو سمجھا دے

گھونچوں. ارسل,ارحم کو گھونچوں جبکہ ارحم ارسل کو جگر کہتا تھا

6 انچ اونچی ہیل میں اسکے دودھیا پاؤں غضب ڈھا رھے تھے وہ شان بے نیازی اسطرح خراماں خراماں قدم رکھ رہی تھی جیسے وہ کوکاف کی پری ہو.

وہ ریڈیو کراچی کے آفس سے باہر نکل رھی تھی. یک لخت اسکی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا اور وہ زمین بوس ہو ہی جاتی کہ کسی کے مضبوط بازوں نے اسے سنبھال لیا. آپ ٹھیک تو ھیں مس. جی میں ٹھیک ھوں وہ بے اختیار اس سے دور ھوئی. آپ ادھر آئیں میں ابھی ایا. یہ لیں پانی پی لیں

ارے دور کریں اسکو یہ پانی ھے زھر نہیں مس. وہ سلگ اٹھا. ارے یہ آپ نے کیا مس مس لگا رکھا ھے میرا نام ماہ نور رضوی ہے. ارحم کے دل و دماغ میں ایک ھی لفظ کی بازگشت ھو رہی. ماہ نور رضوی. ماہ نور رضوی. وہ بے اختیار دیوانہ وار اسکے پیچھے بھاگا مگر وہ گاڑی زن سے بھگاتی ھوئی اسکی نظروں سے اوجھل ھو گئ.

ارحم ارحم کہاں غائب ھو,ارسل نے ارحم کے کمرے میں دھاوا بول دیا. او مجنوں کے جاں نشین یہ کمرے میں گھپ اندھیرا کیوں کر رکھا ہے.

جو نہی ارسل نے لائٹ جلائی ارحم نے آنکھوں پر ھاتھ رکھ لیا. کوئی بات ھے یار بتانا کیوں پریشان ھے, یار آج میں نے اسے دیکھا تب سے اسکی یاد میں دل بے چین ہے ایک پل سکوں نہیں. دل اسکی ہمراہی کا طلب گار ہے

مانو تو اداس کیوں ہے. امی یہ پیار کیا ہوتا ھے. پیار کی تعریف تو بہت آسان ھے گڑیا. وہ ایک شخص جسکے سپنے آپکی آنکھوں میں بس جائیں. آپ چاہ کر بھی جس کو بھول نہ پاؤ. سمجھ جاؤ اس سے آپکو پیار ہے. آج آپ پیار کے بارے میں کیوں پوچھ رھی ھو.

ایسے ھی صبح ریڈیو پہ پروگرام ھے پیار محبت پہ. ماں کو ٹالنے کے انداز میں جواب دے کر جیسے ھی اس نے آنکھیں بند کیں اس اجنبی کا سراپا اسکی آنکھوں میں چھم سے آگیا. اس نے گھبرا کہ فٹ آنکھیں کھول لیں اسے لگا اسکا دل اس کے کانوں میں دھڑک رہا ہو. اے میرے مالک یہ کیا ھو رھا ھے مجھے.

ارحم میری ماں آنٹی سے بات کر ماہ نور کہ بارے میں.

ھاں یار کرتا ھوں بات چل میں نیچے جا رھا ھوں تو فٹافٹ فریش ھو کے آجا. ارسل دو دو سیڑیاں پھلانگ کہ ارحم کی امی کے سامنے بیٹھ گیا اور جھٹ سے سلام کیا. کیا بات ھے بیٹا جی یہ ہنسوں کی جوڑی گھر, میں. وہ آنٹی ارحم شادی کرنا چاہتا ھے. اس نے ارحم کو آتا دیکھ کر کہا! کون ہے وہ خوش نصیب جس نے میرے بیٹے کا دل چرا لیا. امی آپ رشتہ لے کے جائیں گیں نا. ارحم نے امید بھری نگاہ سے ماں کو دیکھا

مانو بیٹا آج تجھے دیکھنے لڑکے والے آرہیں ہیں. تو زرا تیار ھو جانا شام تک.

ماہ نور کا دل چھن سے ٹوٹا اور وہ غمزدہ دل سے تیار ہونے چل دی.

صبا جا مانو کو لے آ مہمان آگئے ھیں چائے وغیرہ لے آئے. ماہ نور لرزتی ٹانگوں کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ کمرے میں داخل ھوئی. آؤ بیٹی یہاں بیٹھو

میرے پاس. ماہ نور نے سبکو چائے دی اور اپنے کمرے میں بھاگ گئ. شرما گئ ھے. صبا نے کہا.

آنٹی اگر آپ اجازت دیں تو میں ماہ نور سے بات کرنا چاھتاھوں. ضرور جاؤ بیٹا اوپر پہلا کمرا اسکا ھے. دستک کی آواز پر ماہ نور نے اپنے بے دردی سے پونچ ڈالے. آنے والے نے اندر آنے کی اجازت طلب کی. جی آجائیں. اس کو دیکھ کر ماہ نور کھل اٹھی. لیکن اگلے ھی پل خوف زدا ھو گئ. آپ یہاں کیا کر رھے ہیں آپ کہ لیے میرا رشتہ آیا ھے. آپ سچ کہہ رہیں. اپنی بے اختیاری پر وہ ارحم کے سامنے شرم سار ھو گئ. ماہ نور میں آپکو بتانا چاہتاہوں کہ میں آپ کی آواز کا دیوانا تھا پھر آپکو دیکھا تو آپ نے رھاسہا چین بھی لوٹ لیا

اگر آپکو میرا ساتھ قبول ھے تو میرا ھاتھ تھام لو ارحم نے اپنے پھیلے ھوئے ھاتھ کی طرف اشارہ کیا. ماہ نور نے بنا سوچے سمجھے جھٹ سے تھام لیا جیسے وہ اسکی متائے جان ھو. ماہ نور کو یقین ھو چلا تھا کے محبت اوس کی صورت اس پہ برسنے کو تیار ہے اب خوشیاں اسکے قدم چومے گیں. چلو ارحم باقی باتیں شادی کے بعد کرنا. ارسل نے انٹری دی اور مانو باہر بھگ گئ.

از قلم شمائلہ ذاھد کراچی

☆☆☆☆☆

عنوان محبت اوس کی صورت

ہاجرہ عمران خان

آسمان دھند سے بھرا ہوا تھا فضا سرد تھی اور منجمد ہوا سے خون رگوں میں جم رہا تھا. سڑک کنارے ماڈل ٹاؤن سی بلاک میں آج غیر معمولی رش تھا......31 دسمبر کی رات تھی...نہ جانے کل طلوع ہونے والے سورج میں ایسے کیا بات تھی جو لوگوں کی خوشی سمبھالے نہی سمبھل رہی تھی

ہر ایک چہرہ روشن اور ان دیکھی امیدوں سے کھلا ہوا سا تھا....

افی کی لیے یہ رونق اور اسکا جنوں نئی بات نہی تھی...وہ بچپن سے ہی لوگوں کے اس جوش خروش اور ولولے کا شاہد تھا.... آج تو اسکا بھی دل چاہ رہا تھا کہ اس بار وہ سب سے پہلے.... نیا سال اور اسکا سورج طلوع ہوتا دیکھے.....اسنے مصمم ارادہ باندھا کہ وہ آج تمام رات جاگے گا اور اپنی آنکھوں سے افق سے نیا سورج اگتا دیکھے گا...وہ دیکھے گا کہ نئے سال کا سورج پرانے سال کے سورج سے کتنا مختلف ہے.....وہ اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ نیا سال اسکی قسمت میں کیا تبدیلی لائے گا...... کیا نئے سال کے سورج کی گود سے ایسی کرن جنم لی گی جو غربت کے مہیب اندھیروں کا وجود نگل جائے؟

افی فاقے اور ہوکے کھا کر بڑا ہوا تھا... غربت اسکی قریبی رشتے دار اور آج تک سب سے عزیز از جان دوست ثابت ہوئی تھی...

افی جب چھوٹا تھا سات سال کا..تب اسکے جوتے پاؤں سے چھوٹے، گھسے ھووے اور گرد آلود ہوتے تھے...... گرمی کی

جھلستی دوپہروں میں سٹاپ پر ڈرائیوروں کو ٹھنڈا پانی

پلاتا... پھر جب وہ پانچویں جماعت میں

تھا... غبارے بیچنے لگا... تھوڑا اور بڑا ہوا تو سڑک پر

دوڑتی کاروں کے درمیان بھاگ بھاگ کر گلاب اور

موتیے کے پھول بیچنے لگا.... اسکا جوتا ہمیشہ اس کے

پاؤں سے چھوٹا اور گرد آلود ہوتا کیونکہ نیا جوتا ایک

عیاشی ہوتا اس کے گھر کا محدود بجٹ اس بوجھ کا متحمل

نہی ہو سکتا تھا اس لیے وہ پرانا جوتا اس وقت تک پہنتا

جبتک کہ وہ ٹوٹ نہ جاتا

افی نے... ہر وہ مزدوری کی جو وہ اس سڑک پر کر سکتا

تھا اور آج کل وہ اس ٹیک اوے کے باہر کھڑا

رہتا.... ہر آنے والی کار کی طرف آرڈر لینے کیلیے تیزی

سے لپکتا اسکے ساتھ اور بھی بوہت سے لڑکے دوڑ

تے... کبھی آرڈر اسے مل جاتا کبھی کسی دوسرے کو

مگر وہ برا نہ مانتا وہ رزق اور وقت کی تقسیم پر اللہ کی

رضا میں راضی تھا.. اسکے ساتھ کام کرنے والے کئی

لڑکے اسکی طرح سٹوڈنٹ تھے.. افی صبح کالج جاتا اور

رات اس ریسٹورنٹ میں کام کرتا

آدھی رات ہونے کو تھی آسمان پر جگہ نہ پا کر دھند

زمین پر گرنے لگی درجہ حرارت مزید گر گیا اس کے

ساتھ کے کئی لڑکے ریسٹورنٹ سے ملحقہ کچن میں پناہ

لیے ہوئے تھے مگر وہ کھلے آسمان تلے مزید

گاہکوں کے انتظار میں تھا اس نے سرد ہاتھوں کو آپس

میں مسلا... انھیں بازوؤں میں چھپایا مگر سردی سے

چھٹکارا پانا نہ ممکن تھا اسی لمحے لمبا کوٹ پہنے بازو پر

لنڈے کے سویٹرز اٹھائے شازی نمودار

ہوا..... سردی لگ رہی ہے؟ اسکی حالت دیکھ کر پوچھا

؟؟؟

ہاں" اس کے دانت بج اٹھے... رات کے گیارہ بجے

تھے، کاروں کا تانتا بندھا تھا 'نہ جانے لوگوں کے پاس

اتنا

پیسا کہاں سے آتا ہے؟' اس نے کانپتے ھووے سوچا

"بھائی، ایک سویٹر لے لے". شازی نے اسے گھر کتے ہوے کہا.... معلوم تھا وہ انکار کرے گا

"مجھے ضرورت نہی" اس نے ایک کار کو آتے دیکھا

"اچھا پیسے نہ دینا، ایسے ای رکھ لے." شازی نے اپنی طرف توجہ دلائی"..."میں تیری روزی پر لات نہی مار سکتا بھائی" افی نے کار کی طرف بڑہتے ہووے کہا

"اچھا سن.... اگر صبح تک یہ والا سویٹر نہ بکا تو، تو چپ چاپ یہ رکھ لے گا" شازی پیچھے سے چلایا. افی مڑا.... مسکرایا... ہاتھ اٹھا کر انگوٹھا دکھایا.... جسکا مطلب تھا 'ڈن' جواب میں شازی نے بھی انگوٹھا اٹھا کر ڈن کا نشان بنایا. مزید کچھ وقت گزرا

12 بجنے میں ابھی کچھ دیر تھی... ایک سیاہ رنگ کی ہنڈا اکارڈ کار سے ایک اٹھارہ انیس سال کا لڑکا نکلا... اسے اشارے سے پاس بلایا.. وہ لڑکا کار سے نکلا جینز اور گرم لیدر کی جیکٹ میں ملبوس، ہاتھ میں سگریٹ

سلگائے.... کار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا" اشارے سے افی کو پاس بلایا.... اریبئن شوارما؟ اس نے سگریٹ کا کش لی کر ناک سے دھواں چھوڑتے ہوئے پوچھا" جی سر" افی نے جلدی سے مینیو بروشر اسکی طرف بڑھایا جسے اس نے ہاتھ کے اشارے سے لینے سے منع کر دیا" ایک سپائیسی...." اسکی بات منہ میں رہ گئ... ارد گرد فضا تیز انگلش دھن بج اٹھی....

لڑکے نے بات ادھوری چھوڑ کر عجلت میں جینز کی جیب سے اپنا آئ فون سیون نکالا "یس ماما؟" وہ قدرے اکتایا ہوا بولا اور دوسری طرف کی بات سننے لگا" میں نے آپ کو بتایا ہے نا جب تک پاپا مجھے نیو ایر پر میری فیورٹ سپورٹس کار لے کر دینے کا وعدہ نہیں کرتے میں گھر واپس نہی آؤں گا..... آپ چاہے کچھ بھی کہ لیں"

افی نے حیران ہو کر نئ، چمکتی دمکتی کار پر نظر دوڑائی

وہ لڑکا دوسری طرف کی بات سننے لگا" مما مرے دوست مجھے طعنے دیں گے.... مرے سب دوستوں کو انکے فادرز نے نئو

ائیر پر

سپورٹس کاریں لے کر دینی ہیں آپ انکی پرائز جان لیں تو حیران رہ جائیں.... صرف میں ہی کیوں ایک سال پرانی کار استعمال کروں... کیا مجبوری ہے میری؟؟ پاپا اتنے بڑے سرکاری افسر ہیں.... آجتک میں....نے جو مانگا وہی مجھے ملا... پھر اب کیا قیامت آگئی ہے"

آرڈر کے انتظار میں کھڑے افی نے آسمان پر دیکھا شاید وہ اپنا رب ڈھونڈ رہا تھا جو دھند میں دکھائی نہی دیا شاید...... ٹھٹھرتے ہاتھوں کو دیکھا اور بغلوں میں چھپا لیے

31 دسمبر بارہ بجے رات...... فضا روشن ہو گئی آسمان نارنجی روشنیوں سے جگمگا اٹھا..... اس کے ساتھ ہی ھنگامہ سا برپا ہو گیا لوگ فائر ورک کر رہے تھے. شرلی

،

پٹاخے، انار چلائے جا رہے تھے.... فضا میں دھند اور تمباکو کی بو گڈ مڈ ہو کر رچ بس گئی. نئے سال کی آمد کا اعلان دھوم دھام سے کیا جا رہا تھا..... ایسے میں افی نے ایک بار پھر سوچا" نہ جانے لوگوں کے پاس اتنے پیسے کہاں سے آتے ہیں".

صبح کے تین بجے سڑک کنارے نئے سال کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے اسکی آنکھ لگ گئی..... شراب میں دھت ایک انیس بیس سال کا لڑکا اپنی کالی ہنڈا سوک کار لیکر ماڈل ٹاؤن سی بلاک کے فٹ پاتھ پر چڑھ گیا...

جس وقت اسے احساس ہوا کہ اسکی کار کے پہیوں کے نیچے کوئی جاندار آگیا ہے اس کا نشہ کچھ دیر کے لیے ہرن ہوا....... رگوں میں خون جما دینے والی سردی

میں ایک جسم صبح صادق تک سسکتا رہا.... اس نے
پوری طاقت سے کار اس نرم جاندار
'چیز' کے اوپر سے گزار دی اور تیزی سے کار بھگا کر
لے گیا..... رگوں میں خون جما دینے والی سردی میں
ایک جسم صبح صادق تک سسکتا رہا......

نیا سال شروع ہو گیا تھا

صبح اس سڑک کے کنارے کہرام مچا ہوا تھا.... شازی
نے رات والا سویٹر خون میں ڈوبے اس بے جان جسم
پر ڈال دیا جو اس رات سیل ہونے سے بچ گیا تھا.

پرانا سال اپنے ساتھ پرانا سورج بھی لے
گیا.... جھٹ پٹے کا وقت شروع ہو گیا.. آسمان پر نگاہ
ڈالیں تو وہاں جہاں سے نیا سال طلوع ہونا تھا چند
کرنیں پھوٹ رہی تھیں... روشنی آسمان کے وجود
سے جنم لینے ہی والی تھی مگر نہ جانے آسمان وہ سورج
کب اگائے گا جو اس دھرتی کے تمام انسانوں کی مجبو
ریاں اپنی تپش سے بھسم کر دے گا ایسا نیا سال کب آ
ئے گا جس میں مجبوری اور غربت پچھلے سال میں رہ
جائے

سڑک کنارے مجبوری، غربت، بے بسی اور لاچاری
میں لپٹی ایک ٹھٹھری ہوئی لاش پڑی تھی

نیا سال جنم لے چکا مگر پرانے روگ ابھی مرے
نہی...

اونچ نیچ اور سٹیٹس کے اس زمانے میں خوشیاں
بانجھ ہو چکی ہیں مگر درد' بچے جنتا چلا جا رہا ہے.

نیا سال از ہاجرہ عمران خان 2017

☆☆☆☆☆

مریم کی آواز بہ زبانِ قلم:

ان کہی۔۔۔:

صالح خوش قسمتی سے ایسے گھر میں پیدا ہوئی جو کئی نسلوں سے پڑھا لکھا تھا۔ یہ لوگ کینیڈا کے رہنے والے تھے۔ اسکے اپنے گھر میں والد ڈپٹی کمشنر تھے۔ والدہ آرمی ڈاکٹر تھیں۔ بڑا بھائی میڈیکل کے آخری سال میں چھوٹا بھائی انجنیئرنگ کے تیسرے سال میں تھا۔

صالح کا پورا نام صالح نوال تھا۔ پورے گھر میں اسکا ہم خیال کوئی نہ تھا۔ فاروقی صاحب کے دوست کے بیٹے سے صالح بچپن سے منسوب تھی۔ بد قسمتی کہیئے یا اتفاق۔ یہ دونوں ایک جنس نہ رکھتے تھے۔ ہجرے تھے۔ نسبت پیدائش سے پہلے کی طے تھی۔ نبھانا کیا تھا لوگوں کو دکھانے کے لئے بندھے ہوئے تھے۔ نسیم ۔۔ نسیم فاروقی۔

دونوں میں کافی دوستی تھی۔ چھٹیوں میں فاروقی صاحب کی فیملی پاکستان آنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سب بہت خوش تھے۔ انہیں معلوم نہ تھا یہ خوشی کیسے انکو اجاڑ کے رکھ دے گی۔

"میں بھی چلوں تمہارے ساتھ"

لان کی سیڑھیوں میں بیٹھے سر نیچے جھکائے وہ دونوں آج گم صم تھے۔ الوداعی ملاقاتیں ایسی ہی ہوتی ہیں کبھی کسی نے خوشی سے کسی کو الوداع نہیں کیا۔

"اپنے ڈیڈ سے پوچھ لو گے؟؟" وہ اسکی طرف مڑ کہ بولی۔

"وہ تو مجھے پہلے سے ہی گلے سے اتارنا چاہتے ہیں" وہ رونے والا ہو گیا۔

"نسیم زاریا کہتی ہے ممی نے بیٹے کی دعا کی تھی اور بابا نے بیٹی کی۔۔۔ میں پیدا ہو گی"

"ٹھیک کہتے ہیں" نسیم نے سنجیدگی سے کہا۔ سمجھ آنے پہ صالح اسکے پیچھے بھاگی۔

"بابا نسیم بھی چلے گا ہمارے ساتھ"

وہ بیگ پیک کر کے آ گیا تھا۔ صالح نے اسکو دروازے پہ ہی روکا اور اندر بتانے گئی۔ فاروقی صاحب نے بیگم کی طرف دیکھا اور بولے "ٹھیک ہے"

ابھی تین دن ہی ہوئے تھے اسلام آباد پہنچے ہوئے۔ کچھ لوگ اور ہمسائے کی ایک عورت آئے۔

"یہی ہیں وہ دو نامرد" ہمسائی دروازے پہ ہی کھڑی ہو کے اشارہ کرتے بولی۔ وہ دونوں لان میں scrabble کھیل رہے تھے چونکے۔ ایک عجیب سی عورت کے ساتھ مونچھوں والے ڈراؤنے آدمی بھی تھے۔

"کون ہو تم لوگ" ایک آدمی تیزی سے آگے آیا اور غصے میں بولا

"انسان ہیں" نسیم نے کندھے اچکا کے کہا

"کب سے ہو یہاں۔۔ اور کون ہے ساتھ" وہ شاید اور کچھ بھی پوچھتا مگر نوکر انہیں اندر لے گیا۔

"اچھا انسپیکٹر صاحب میری ہنڈیا جل رہی ہو گی میں چلتی ہوں" سب آگ لگانے والی عورتوں کو ہنڈیا جلنے کا ڈر ہوتا ہے اگر لوگوں کے گھر جلانے سے پہلے وہ سوچ لیں تو انکی ہنڈیا کبھی نہ جلے

"فاروقی صاحب کسی بھی قسم کی تمہید سے پہلے میں آپ کو بتا دوں میں انسپیکٹر وڑائچ ہوں۔"

"میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

"کچھ مشکوک جنس کی خبر ملی تھی یہاں" وہ گھر کا جائزہ لیتے بولا

"کیا مطلب ہے آپ کا" فاروقی صاحب غصے میں آ گئے۔

"ٹھنڈے رہیئے۔۔ آپ پہلی دفعہ شاید یہاں آئے ہیں۔۔۔" اسکی بات کاٹ دی گئی

"دوسری دفعہ"

"لیکن پھر بھی آپ کو علم ہو گا ایسے لوگوں کی جگہ کہاں ہوتی ہے"

ایسے لوگ؟" ڈاکٹر صاحبہ بولیں

"جی ہاں۔۔ گستاخی معاف بیگم صاحبہ آپ نے انہیں پناہ دے رکھی ہے"

"اس بکواس کا کیا مطلب ہے یہ کوئی مفرور نہیں ہیں نا ہی ملزم یا مجرم" فاروقی صاحب اشتعال میں آ گئے

"کمشنر صاحب ہمارے ذہنوں میں جب "ہجرے" کا لفظ آتا ہے تو پیروں میں گھنگرو باندھے ہوئے ناچتے شخص کی بنتی ہے اتنی بڑی کوٹھی میں پاپ کارن کھاتے فلم دیکھتے ہوئے omg کہتے کسی teen ager کی نہیں"

"Dis gusting.. کیا آپ بھی وہی سوچ رکھتے ہیں"

جناب یہاں سوچ کوئی معنی نہیں رکھتی۔۔ میرا کام تھا آپ کا خبر دار کرنا بھلے آدمی لگتے ہو مان جاؤ ورنہ عدالت نوٹس بھجوا دے گی"

چوتھی قسط

"عدالت؟۔۔۔ کیا یہاں انصاف اسے کہتے ہیں؟؟" ڈاکٹر صاحبہ چیخی۔

"انصاف" اسے ہی کہتے ہیں۔ میری ضرورت پڑی تو یاد کیجئے گا۔" وہ وزٹنگ کارڈ ٹیبل پہ رکھتے بولا

وہ اگلی شام پھر گھر آیا۔ نا جانے کیا تاویلیں پیش کر رہا تھا۔ کل سے نسیم اور صالح سے کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ خود وہ بھی چپ تھے۔ صالح یہ جہاں بھی لے کے جائیں گے تمہارا کیا خیال ہے انکل جانے دیں گے "وہ نوڈلز کھاتے بولا انسپیکٹر نحوت سے دیکھتا دروازہ پار ہوا تھا۔

"کل نہیں لگ رہا تھا مگر آج مجھے لگ رہا ہے۔۔۔ محبت کی دیوار میں دراڑ آ گئی ہے"۔

"بڑے صاحب باہر ڈاکیہ یہ کاغذ دے گیا ہے" تنویر صاحب نے چوکیدار سے "کاغذ" لیا۔ لفافہ پھاڑا اور کاغذ نکال کے پڑھا۔ پڑھتے ہی چہرے کا رنگ بدل گیا۔

"کیا ہوا" پاس بیٹھی ڈاکٹر صاحبہ نے پوچھا

"وہی ہوا جسکا ڈر تھا"

"کل جانا ہے عدالت کا سمن آیا ہے" وہ کہہ کر کمرے سے نکل گئے۔

ڈاکٹر صاحبہ سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ نسیم اور صالح دونوں بہت excited تھے۔ اگلے دن دونوں عدالت میں لوگوں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کٹہرے میں کھڑے ہوئے دوسری "ہجرہ کونسل" کا نمائندہ تھا۔ آدھے گھنٹے کی رسمی کاروائی کے بعد اگلی تاریخ دے دی گئی عدالتوں کے چکر کب راس آئے کسی کو۔ پیشی پہ پیشی۔

یونہی دو سال گزر گئے۔ درمیان میں فاروقی صاحب اور ڈاکٹر صاحبہ کینڈا کے چکر لگاتے رہے انکی سرکاری نوکریاں تھیں۔ بچے اب بالغ بھی ہو گئے تھے اور مسئلے کا علم بھی رکھتے تھے۔ ماں باپ وعدہ لے کے چلے گئے کہ ہر 6 ماہ بعد آتے رہینگے۔

دنیا ایک جنس والوں کو نہیں چھوڑتی وہ تو پھر ہجرے تھے۔

دو سال وہ اپنے ہی اندر ٹوٹتے بکھرتے رہے۔ ان کے سامنے بہت سے ہجرے کیس ہار کے ہجرہ کمیٹی کے پاس چلے گئے تھے۔ وہ سب پاکستانی تھے۔ مگر اب بڑی آسامی تھی۔ کینیڈا کے لوگ تھے۔ ممی ڈیڈی بچے۔

جج کی تبدیلی کے آرڈر دو سال سے رکے ہوئے تھے۔ بلآخر جاری ہو گئے۔

نئے جج نے آتے ساتھ تمام کیسز کلئیر کیے۔ اور ھجرہ کونسل نے کیس جیت لیا۔

وہ لوگ عدالت میں ہی بے ہودگی مچانے لگے۔ نسیم اور صالح کو رونا نہیں آ رہا تھا وہ خود کو تیار کر بیٹھے تھے۔ کبھی ہوتا ہے ناں زندگی میں آپ کو اپنوں کہ طرف سے اتنے دکھ مل چکے ہوتے ہیں کہ غیروں کے دکھ نہیں دکھتے۔

یہ ایک پھیکا ثمر تھا۔ انکے صبر کا۔

انکا یقین خدا پہ اٹھ گیا۔ وہ جو شکر کرتے تھے ہم جیسے بھی ہیں انسان تو ہیں ناں۔۔۔ اب خدا سے (نعوذ باللہ) ناراض ہو گئے۔

ہم اپنے اور دوسروں کے کیے ہوئے رویئوں کا حساب اللہ سے لیتے ہیں۔ سارا غصہ ان پہ نکالتے ہیں۔

کسی ہجرے نے ان کے پاس آ کر تالی ماری تو وہ چونکے۔

اعلی شان گاڑی اور انکا پروٹوکول۔۔

انکی منزل ایک کوٹھی تھی۔۔ وہ کوٹھی تھی یا منکرین کی جنت؟ رنگ و خوشبو کا سماں۔۔

اسلامی پابندیوں میں رہنے والے نسیم اور صالح نے اس جگہ کے لیے نفرت محسوس کی۔ وہ نہت آرام سے اندر لائے گئے۔ گارڈز نے انہیں دو "پریوں" کے

حوالے کیا۔ وہ اوچھی حرکتیں کرنے والی بندریاں لگیں۔ ریشمی پردے۔ دبیز قالین، معطر فضا انہیں کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

"خوش آمدید" کسی نے تالی مار کے انہیں ویلکم کیا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا ہجرہ تھا۔ بال نقلی تھے یا اصلی مگر مضحکہ لگ رہے تھے۔ منہ پہ بہت سا میک اپ سجا کہ گلابی آتشی جوڑا پہنے وہ دانت نکال رہا تھا۔ بدقت انہیں بھی مسکرانا پڑا۔

"آؤ اندر۔۔ تمہارا اپنا ہی گھر ہے یہی اب جنت ہے یہی اب دوزخ۔۔ بالی" اسنے کسی کو آواز دی

اسکو لے جاؤ طبلے کی ٹریننگ دو۔۔۔ اور اس پری کو پرستان چھوڑ آؤ" صالح لڑکا دکھتا تھا ھجرے بھی دھوکہ کھا گئے۔

"ہمیں الگ مت کرو ہمیں اکٹھے رکھو پلیز" الگ ہونے کا احساس ہی تکلیف دہ تھا۔

"وہ مرد ہے تم عورت" لے کے جانے والی چیخی۔

"نہیں ہے وہ مرد اور نہیں ہوں میں عورت ہم وہیں ہیں جس کام کے لیے ہمیں پیدا کیا گیا ہے ہم وہیں ہیں جن کو ماں باپ گالی سمجھتے ہیں، ہم وہیں ہیں جن سے دستبردار ہونا بہت آسان ہے" وہ رونے لگی دروازہ کھلا بالی اندر آئی۔

" صحیح کہتی ہے یہ دونوں ایک جیسے ہیں ماں باپ نے شوق ہی بس پورے کیے ہیں"

"لو کچھ اور مانگا ہوتا چمکی تو تجھے مل جاتا" ک س ی عورت کی آواز پہ وہ چونکی۔ وہ سبز سنہری ساڑھی میں ایک بھاری جسم والی خاتون تھی۔

"چمکی؟؟" یہ چمکی کیا ہے؟ صالح نے غصے اسے دیکھا۔

"آج سے تیرا نام ہے پیاری "(نسیم دوسرے کسی کمرے میں تھا۔)اس نے گال کھینچتے ہوئے کہا۔ صالح نے اسے غور سے دیکھا

"تم ھجرہ نہیں لگتی "اس پہ وہ قہقہ لگا کر ہنسی

" تبھی تو پی پرستان چلارہی ہوں "صالح کے ذہن میں ایک بجلی کوندی

"لگتا بری کامیابی کے ساتھ چلارہی ہو۔۔ کون کون پارٹنر ہے"

"تم کچھ زیادہ فری نہیں ہورہی ؟"وہ اٹھتی ہوئی ساڑھی سئ نادیدہ شکنیں صاف کرتی بولی

"نہیں میں دراصل یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ ہم کوئی عام لوگ نہیں ہیں کینیڈا کی پڑھی لکھی سوسائٹی سے ہیں ہمیں تم اس کام میں مت رکھو جو باقیوں سے لیتی ہو "صالح کا دماغ بہت تیزی سے چل رہا تھا ساتھ ساتھ وہ کمرے کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ یہ شاید اس

عورت کا بیڈروم کے ساتھ ملحقہ ڈرائنگ روم تھا جسکو پردے سے الگ کیا گیا تھا۔

"مطلب کیا الگ ہے لڑکی تم میں "وہ جتاتے ہوئے بولی صالح کو گھن آئی مگر کچھ سوچ کہ برداشت کر گئی۔

"میں کینیڈا کی certified beutician ہوں بیوٹیشن کے بغیر تو یہ حسن جوان نہیں رہتا ناں "صالح اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرتی بولی۔ ہر عورت کی کمزوری اسکی تعریف۔ اور صالح کو اندازہ ہو گیا تھا اس نے ٹھیک جگہ ہاتھ رکھا ہے۔

"مجھے دکھ رہا ہے آپ کو آپ کے بیوٹی ٹریٹمنٹ اچھی نہیں مل رہی۔۔۔ یہ ڈائی (hair colour) آپ دیکھیے کیسے لگایا ہے اس نے روٹس ڈیمیج ہو رہی ہیں "وہ اس کے چہرے کے تاثرات دیکھے بغیر اپنی پرفارمنس پر زور دے رہی تھی۔ کن اکھیوں سے اس کے چہرے پہ دیکھا تو وہ واقعی پریشان ہو گئی۔

"رات چٹھا صاحب بھی کہہ رہے تھے کہ۔۔" وہ چپ ہوئی جیسے کوئی راز کھل گیا ہو۔

"کون۔۔ چٹھا صاحب۔۔ وہ آتے ہیں آپ کی طرف؟" صالح نے ہوا میں تیر چلایا

"ت تم ک کیسے جانتی ہو؟" اسکی ہکلاہٹ ظاہر ہو رہی تھی۔

"ڈیڈ کو ملنے آتے تھے اچھا آپ پریشان نہ ہوں میں کسی کو نہیں بتاؤں گی" صالح گھوم کے اسکے پیچھے آئی اور کندھوں سے پکڑ کے نیچے بٹھایا۔

"کیا نام ہے آپ کا؟" وہ بھی نیچے بیٹھ گئی اور جان بوجھ کہ موضوع بدلا

"زلیخہ نام ہے۔۔ یہاں سب باجی کہتے ہیں" وہ بے چین دکھ رہی تھی۔

"میرے لیے کیا حکم ہے اب باجی" صالح دل ہی دل میں محظوظ ہو رہی تھی۔ دروازہ کھلا اور صالح کسی ہجرے کے ساتھ آیا۔

"باجی اسکو کاؤنٹر پہ بٹھادوں حساب کتاب جانتا ہے۔۔ گھنگھرو والی اوقات نہیں اسکی" وہ ہاتھ ہلا ہلا کہ کہنے لگا۔

"ہاں ٹھیک ہے یہ چمکی آج سے میری بیوٹی کونسلر ہے۔ تم deplexوالی کو اب نہ بلانا" وہ اچھا کہہ کر چلا گیا۔ صالح مسکراتی ہوئی زلیخہ کے پاس گئی۔

"سب سے پہلے مجھے اپنا وارڈروب دیکھایئے" وہ نسیم کو آنکھ مار کے زلیخہ کے پیچھے چل پڑی اور نسیم ہکا بکا کھڑا رہا۔

"یہ کیا کرنا چاہ رہی ہے" نسیم رجسٹر ٹھیک کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ رات بہت سکون سے گزری تھی۔

ہوتا ہے ناں ہماری نیندیں کسی چیز کے ہونے کے ڈر سے اڑی ہوتی ہے اور جب وہ چیز ہو جاتی ہے ہم سکون میں آجاتے ہیں خوف جب انتہاء پہ جاتا ہے ختم ہو جاتا ہے۔

دوسری طرف صالح کی آنکھ نرم گرم بستر پہ کھلی۔ رات اس نے زلیخہ کو خوب چکنی چپڑی باتوں سے شیشے میں اتار لیا تھا۔ آخر ڈپٹی کمشنر کی بیٹی تھی۔

ناشتہ کمرے میں ہی کر کے ٹراوزر ٹاپ پہن کہ پونی ٹیل کر کے وہ کمرے سے باہر جانے ہی لگی تھی جب دروازے پہ دستک ہوئی اس نے کھولا۔ "باجی نے بلایا ہے" بالی ہاتھ لہرا کے برا سا منہ بنا کے بولی۔ بالی کو دکھ رہا تھا اسکی بادشاہت ختم ہو رہی ہے۔ صالح گہری سانس لے کے زلیخہ کے کمرے کی طرف بڑھی۔

"یار تمہیں بتانا بھول ہی گئی آج مجھے بہت ضروری ملنا ہے کسی سے۔۔ تمہیں 20 منٹ میں مجھے تیار کرنا ہو گا۔" زلیخہ اسے دیکھتے ہی بولی۔ صالح نے اسے دیکھا پہچان ہی نہیں پائی واقعی بیوٹیشن کو بہت محنت کرنی پڑتی ہو گی۔ وہ ایک گندمی سی بیٹھے ہوئے نقوش کی مالک تھی۔ میک اپ میں بہت دلکش لگتی تھی۔

"کہاں جانا ہے اسی حساب سے کپڑے نکالوں" اس نے وار ہی اس طرف سے کیا تھا کہ جوب دینا ہی پڑا۔

"یار اب تم سے کیا چھپانا۔۔ چٹھا صاحب بہت ضد کر رہے تھے تو۔۔" وہ باقاعدہ بلش کر رہی تھی۔ صالح کے قدم مضبوط ہو چکے تھے۔ جن کی جان جس طوطے میں ہیں وہ قبضے میں آچکا تھا۔

آدھے گھنٹے میں وہ تیار ہو گئی۔ "واہ تم نے واقعی نام کا اثر لیا چمکا کہ رکھ دیا۔۔

وہ میری بہن تمہاری دیوانی ہو رہی ہے اس کو دیکھ لینا" وہ جاتے ہوئے گال پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کس بلا کہ حوالے کر کے گئی صالح کو اندازہ نہیں تھا

"تمہاری باجی کی بہن کہاں ہیں" صالح اکتائی ہوئی بالی سے پوچھنے لگی۔ وہ مسکرائی۔

"کیوں تمہیں کیا کام ہے؟"

"زلیخہ نے کہا اس نے مجھے بلایا ہے" صالح ایک ادا سے بولی "میک اپ ہی کرانا ہو گا"

"ہاں یہ تو وہاں چلو گی تو پتہ چلے گا" وہ ذو معنی انداز میں بولی۔

یہ کوئی تین چار کنال میں گھر تھا۔ ایک طرف وہ حصہ تھا جہاں زلیخہ کا "سٹاف" اور زلیخہ خود رہتی تھی۔ ایک طرف جسے پرستان کہتے تھے وہاں ناچ گانا ہوتا تھا اور ایک طرف اسکی بہن کی رہائش گاہ تھی۔ چوتھی طرف سوئمنگ پول۔ جم خانہ اور دوسری لغویات کا اڈا تھا۔

بالی صالح کو لے کہ زلیخہ کہ بہن ناجیہ کی طرف آئی۔ لاؤنج میں بٹھا کر جاتے ہوئے کہہ گئی۔ "بھلے گھر کی لگتی ہو دھیان سے یہاں کوئی ملازم بھی نہیں آتا"

صالح گھبرا گئی۔ سورتیں اور جانے کون کون سے دعائیں پڑھنے لگی۔ کھٹاک سے کسی طرف کا دروازہ کھلا اس نے نظریں گھمائیں۔ سامنے راہداری میں کسی کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ صالح کو کرنٹ لگا اور کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ نیم برہنہ لڑکی نکلی۔ ادھر ادھر ایسے ڈول رہی تھی جیسے کوئی نشہ کیا ہو۔ صالح کو ٹانگوں پہ کھڑا ہونا دشوار ہو گیا تھا۔ (لاحول ولا قوۃ)

وہ نظریں جھکائے ہی رکھتی مگر وہ لڑکی گرنے لگی تھی اسکو سہارا دینا پڑا۔ صالح نے صوفے پی سجاوٹ کے لیے جو کپڑا بچھایا گیا تھا لڑکی کے جسم پہ ڈالا اور اسکو گھسیٹ کر صوفے پہ لائی۔

"باجی نے تمہیں بھیجا ہے کیا؟؟" وہ اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرتی پوچھ رہی تھی۔ صالح کو کراہیت محسوس ہوئی۔

"محترمہ آپ کا کمرہ کہاں ہے؟"

"میرا کمرہ؟؟ وہ تو کب کا کھو چکا۔" بہکی بہکی باتیں کرنے والی بلبل اپنے حواس کھو بیٹھی تھی۔ وہ خود اٹھی اور اسی کمرے میں گئی جہاں سے وہ نکلی تھی۔

اندر کا حال بتا رہا تھا جیسے کسی کی لڑائی ہوئی ہے سائیڈ ٹیبل پہ پڑی ایش ٹرے میں سگریٹ کے ٹکڑے تازہ تھے۔ اس نے بمشکل الماری ڈھونڈ نکالی۔ کچھ "معقول" کپڑے نکال کہ باہر آئی۔ مگر وہ تو باہر نہیں تھی۔ اسکو اوڑھائی جانے والی چادر فرش پہ گری ہوئی تھی۔ صالح نے شیشے کی دیوار سے باہر جھانکا وہ سوئمنگ پول کی طرف گرتی پڑتی جا رہی تھی۔ صالح نے دوڑ لگائی۔ "اگر اسکو کسی نے ایسے دیکھ لیا تو" وہ سوچتے ہوئے اس تک پہنچی اور اٹھا کہ واپس لائی۔ ناجیہ بہت دھان پان والی لڑکی تھی جبکہ صالح بلیک بیلٹ ہولڈر ایک مضبوط اعصاب والی تھی۔

"تمہارا نشہ ختم کرنا ہو گا" وہ کب سے کوشش کر رہی تھی ناجیہ نشے سے نکلے۔

"نشہ ختم نہیں ہوتا۔ بڑھتا رہتا ہے۔ کم ہو جاتا ہے مگر ختم نہیں ہوتا۔۔ کسی کو چرس کا نشہ ہے کسی کو دولت کا کسی کو محبت کا کسی کو کرسی کا۔۔ یہ نشہ ختم نہیں ہوتا بی بی" وہ آخر میں ہاتھ ہلاتے ہوئے اٹھ گئی۔ کافی دیر کی محنت کے بعد شکر ہے وہ اب لباس میں تھی۔

"فلاسفی بعد میں جھاڑنا۔۔ یہ بتاؤ تم نے مجھے کہاں دیکھا تھا جو زلیخہ سے کہا ہے میں تمہیں پسند کرتی ہوں "ناجیہ چلتے ہوئے رکی۔ اور قہقہ لگاتے ہوئے مڑی۔

"یہ جو زلیخہ ہے ناں بڑی ہی خراب چیز ہے۔۔ یہ ایسے ہی کرتی ہے جس کو راستے سے ہٹانا ہو اسکو میرے پاس بھیج دیتی ہے"

"اور تم کیا کرتی ہو پھر" وہ اس کے پاس آئی

"تمہیں شاید کسی نے بتایا نہیں۔۔ میں نشے میں کیا کیا کر جاتی ہوں" صالح نہیں ڈری نہ ہی حیران ہوئی۔

اسے بس دکھ ہوا زلیخہ نے اس گناؤنے کام میں بہن کو بھی نہیں چھوڑا۔ امیر پارٹیوں کے مرد اپنے پاس یا ٹرینڈ لڑکیوں کے پاس بھیجتی اور لڑکیوں کو ناجیہ کہ پاس۔۔

"میں ہجرہ ہوں" زندگی میں پہلی بار اس نے زبان سے اقرار کیا۔ میں پہچان گئی تھی۔ اسی لیئے محفوظ ہو تم" وہ واپس کمرے کی طرف بڑھی۔ صالح نے کچھ سوچا اور پیچھے لپکی

"مجھے ڈر لگتا ہے میں بھی تمہارے ساتھ سو جاؤں..... کمرے میں" وہ مصنوعی ڈر سے بولی۔

"آجاؤ جانی کیا یاد کرو گی"

رات کے کسی پہر اسکو کسی کے چلنے کی آواز آئی اور سسکیوں کی۔۔ وہ آواز کی طرف چلتی گئی ناجیہ کہ کمرے کے ساتھ والے کمرے سے آوازیں آرہی تھی

یہ تو اندازہ ہو گیا تھا وہی ہو گی کیونکہ وہ بستر پہ نہیں تھی۔ کھلی کھڑکی سے جھانکا تو کوئی اسکو انجکشن لگا رہا تھا۔ اندر کا منظر اتنا واضح نہیں تھا وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔ انجیکشن کون لگا رہا ہے۔ صالح اسی وجہ سے اس کے ساتھ سوئی تھی۔ دروازہ کھول کے اندر گئی اور لگانے والے کا بازو پکڑ کے گھمایا۔ اس کا چہرہ روشنی میں آیا تو معلوم ہوا وہ تو "بالی" ہے۔

"تم؟"

"چمکی تم ادھر کیوں آئی ہو؟"

"بالی چھوڑ دو اسے... میرے لیے اس کے بدلے تمھارے لیے کچھ ہے" ناجیہ نیم بے ہوشی میں ٹانگیں مار رہی تھی۔ "سوچو نہیں میں تمہیں زلیخہ سے آزاد کرا سکتی ہوں"

بالی نے ایک جھٹکے سے ناجیہ کا بازو چھوڑا

"مجھے پتہ ہے ناجیہ زیادہ عرصے سے نشے کی عادی نہیں ہے" وہ چاند کی روشنی میں بیٹھ گئے۔ گھر کی بیرونی سیڑھیوں پہ پڑنے والی چاندنی۔ صالح کچھ دیر مبہوت ہو کہ دیکھتی رہی۔ قدرت سے متاثر ہونے کے لیئے انسان کا مکمل ہونا کب ضروری ہے۔

وہ ناجیہ کو نیند کی گولی دے کر سلا کے باہر آئے تھے۔

"تمہیں کیسے پتہ" وہ ٹانگیں سیدھی کرتی ہنسی تھی۔

"میری ماں ڈاکٹر ہے"

"ایک وہ نمونہ (نسیم) ہے ذرا چوں چرا اں نہیں کرتا اور تم ہو کہ ہر معاملے میں ٹانگ اڑاتی ہو"

"تمہیں پتہ ہے ہجرے کون ہوتے ہیں؟" وہ سامنے پانے میں گرتی چاندنی کو دیکھتے بولی

"وہ معاشرے کا ایک بدنما دھبہ ہوتے ہیں" جواب فورا آیا تھا۔ وہ بھی وہیں دیکھ رہی تھی۔

"انسانوں کو اللہ نے جنس میں پیدا کیا ہے۔ اور ایک جنس میں نہیں بلکہ دونوں میں۔۔۔ کبھی کسی میں مردانہ غالب آجاتی ہے اور وہ مرد کہلاتا ہے اور کبھی کسی میں زنانہ۔۔ کبھی تم نے کچھ مرد دیکھے جو زنانہ علامات رکھتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے عورتوں کی طرح انکی بول چال اور مشاغل بھی عورتوں کی طرح ہوتے ہیں انکو یہ معاشرہ ہجرہ کیوں نہیں کہتا۔۔ کیوں کہ ان میں صرف زنانہ حصائل پائے جاتے ہیں عضوی طور پہ وہ مرد ہی ہوتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ tom boys لڑکیاں بھی ہوتی ہیں۔

ہجرے وہ ہوتے ہیں جن کی جنس ایک نہیں ہوتی۔ وہ آدھے مرد ہوتے ہیں اور آدھے عورت حسی بھی معنوی بھی۔ یہ ایک hormonal disorder ہے۔ مگر اس معاشرے نے ہمیں مسترد کر دیا ہے ہمیں اس طبقے کے لیے چھوڑ دیا جس کا نام بھی زبان پہ لانا نہیں چاہتے" وہ چپ ہوئی سحر ٹوٹا۔۔ بالی اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور رو رہی تھی۔

"چمکی تو بہت اچھا بولتی ہے۔ تو باہر کی دنیا دیکھ آئی ہے ناں۔۔ تیرا اسی لیے دل نہیں لگتا۔۔ ہماری یہیں پیدائش ہوئی ہے ہم نے یہیں مر جانا ہے یہ جگہ ہمارے لیے ہے چمکی" وہ رو رہی تھی اور منہ چھپا گئی تھی۔

"بالی باہر ایک دنیا ایسی ہے جو ہمیں گالی نہیں دیتی ابھی ایسے لوگ ہیں جو ہمیں اپنے جیسا سمجھتے ہیں" وہ اسے سمجھا رہی تھی اور دور چاند ڈوب رہا تھا۔

"ناجیہ یہ لوگ تمہاری جان لینا چاہتے ہیں وہ تمہاری بہن برباد کر دے گی تمہیں" وہ اس دن بھی زلیخہ کی طرف نہیں گئی نہ ہی اس نے بلایا تھا۔ بالی کو بھی صالح نے کچھ بھی بتانے سے منع کر دیا تھا۔

"تم کیوں میری مسیحا بن رہی ہو... کرنے دو برباد" صالح نے گہری سانس لی۔

"کب سے نشہ کر رہی ہو" ناجیہ کو نہیں علم تھا کہ اسکو انجیکشن لگتے ہیں۔ وہ اپنی طرف سے رات کو نیند والی گولیاں کھانے کو ہی نشہ سمجھ رہی تھی۔

"ایک ماہ بھی نہیں"

"مجھے معلوم ہو ہے یہ زلیخہ تمہاری سوتیلی بہن ہے اور تم سے بدلہ لے رہی ہے اپنی ماں کا"

"یہ سب بکواس ہے" اس نے مکھی اڑائی

"یہ ویڈیو ہے تمہارے نشے میں کیے جانے والے عمل کی... بالی کی کوئی رشتے دار آئی تھی کچھ دن پہلے تمہارے پاس" ناجیہ کے چہرے کی رنگت بدل رہی تھی۔ صالح نے ویڈیو کیم بند کیا۔

"تمہیں نشے کے انجیکشن لگتے ہیں۔ یہ دیکھو بازو اپنے۔۔ تم رات کو اپنے حواسوں میں نہیں ہوتی... پچھلے کتنے دنوں سے میں تمہیں بتا رہی ہوں وہ عورت جھونک کی طرح خون چوس رہی ہے تمہارا" صالح کو

غصہ آیا میز پہ ہاتھ مارتے اٹھ گئی۔ اور ٹیرس سے باہر آگئی۔

"صالح یہ ویڈیو میری ہے ؟؟" کافی دیر کے بعد ناجیہ اس کے پیچھے آئی

"مجھے تم نے بلایا۔۔ خود آکر نہیں مل سکتی تھی۔ ذرا خیال ہے میرا اتنی مشکل سے چھپ چھپا کے آیا ہوں"
صالح نے ناجیہ کے گھر کی چھت پہ نسیم کو بلایا تھا تو پرستان کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔ نسیم اس پہ برس رہا تھا اور وہ مالٹے کے چھلکے اتار اتار کہ الگ رکھ رہی تھی۔

"کلرک صاحب بہت گرم ہو رہے ہو"

"ابھی بھی گرم نہ ہوں؟ بتاؤ بلایا کیوں تھا"

"کتنے بے شرم ہو۔ تمہارا خون سفید ہو گیا ہے تمہارا دل لگ گیا ہے ناں یہاں ؟؟

"تو اور کیا کروں ؟" وہ اس کے ساتھ نیچے بیٹھتے ہوئے بولا

"بہت دنوں پہلے مجھے ایک لڑکی ملی۔ اس نے مجھے یہاں کہ چور دروازے بتائے ہیں"

"Dont tell me تم یہاں سے بھاگ رہی ہو"

"میری بات سنو! زلیخہ کو میں راہ کا کانٹا نظر آئی اس نے مجھے اپنی طرف سے سزا دینے لے لیے اپنی بہن کی طرف بھیجا مگر میں بھی نام کی ایک ہوں"

"کیا کہتی وہ لڑکی۔۔ کیا پتہ باجی کی جاسوس ہو"

"نہیں میں نے کنفرم کر لیا ہے"

"ٹھیک ہے جب چلنا ہو ابتا دینا۔۔" وہ ناراض ہوا

"میں نے اس لیے تمہیں نہیں بتایا تا کہ اگر میں ناکام ہو جاؤں تو تم نہ پکڑے جاؤ" صالح چل پڑی

وہ پورے رات کی چاند تھی۔ چاند اپنی چاندنی کے ساتھ پورے جوبن پہ تھا۔ صالح نے دائیں بائیں دیکھا اور دروازے سے باہر قدم رکھا۔ یہ ناجیہ کے کمرے سے ملحقہ ٹیرس کا دروازہ تھا جو پچھلی طرف باغ میں کھلتا تھا۔ یہاں سے نکلنا سب سے آسان تھا۔

سڑک پہ پہنچ کہ ناجیہ نے اپنی گاڑی سٹارٹ کی۔ "میں اس ایک ماہ کو کبھی نہیں بھولوں گا" اتنا مشکل ناجیہ اور بالی کی تیاری میں نہیں ہوئی جتنی نسیم کو منانے میں ہوئی۔

نسیم تمہیں پتہ ہے جو لڑکی مجھے ملی تھی وہ کون تھی؟"

"ناجیہ ہو گی"

"او نہوں۔۔ وہ لڑکی میں خود تھی۔ میں نے realise کیا۔ کوشش انسان کو خود کرنی ہوتی ہے۔ لوگ آپ کو کچھ بھی کہتے رہیں وہ ضروری نہیں ہوتا ضروری یہ ہے ہم خود کو کیا سمجھتے ہیں۔ اور میں خود کو اس ملعون کام کے لیے نہیں سمجھتی۔

وہ اپنے گھر کی کیاری سے مٹی کھودتے پاسپورٹ نکالتے ہوئے بولی

☆☆☆☆☆☆☆

آئٹم یا بہن

از قلم سندھیا شاہ

"ایک نئی بہن پھنسی ہے فیسبک پہ.." بائیں آنکھ کا کونا دباتے ہوئے اس نے شرارت سے ولید کو دیکھا تھا.

"خدا کو مانو یار, کتنی لڑکیوں کو پھنساؤ گے, کسی ایک سے شادی کیوں نہیں کر لیتے" ولید نے غصے کو دباتے ہوئے کہا تھا..

"شادی اور ان لڑکیوں سے... ناں یار! شادی تو میں ایسی لڑکی سے کروں گا جو بلکل میرے معیار پر پورا اترے, جس نے کبھی کسی لڑکے سے بات نہ کی ہو"

"اور تم خود!!!! کیا تم خود اس کے معیار پر پورا اتر پاؤ گے ؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں سوال کیا

"ہاہاہا! کیوں کیا کمی ہے مجھ میں! ہزاروں لڑکیاں مرتی ہیں رضار حمن پر." اس نے قہقہہ لگایا تو ولید افسوس سے اسے دیکھتا رہ گیا.

"اور دیکھو تم انہی لڑکیوں میں سے کسی سے شادی نہیں کرنا چاہتے.. کتنی مزے کی بات ہے ناں"

اس نے جیسے مزہ لیتے ہوئے کہا تھا.

"اچھا چھوڑو! آؤ تمہیں تمہاری نئی بہن سے ملواتا ہوں." کہتے ساتھ ہی اس نے لیپ ٹاپ اپنے سامنے کیا اور فیسبک اوپن کر دی.

"ہیلو" سکرین پر شو ہوا تھا اور اس کے دل کی دھڑکنیں اتھل پتھل ہونے لگی تھیں.

ایک مہینہ ہی تو ہوا تھا اسے فیسبک استعمال کرتے اور کسی لڑکے سے اس کی یہ پہلی دوستی تھی. اس لڑکے کے ہر میسج پہ اس کی ایک بیٹ مس ہوتی تھی.

شاید ہم لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں. کوئی لڑکا ذرا سی لفٹ کرا دے تو اسے محبت سمجھ لیتی ہیں. ہم سے زیادہ بیوقوف اور کون ہو گا جو جانتے بوجھتے خود کو دوزخ میں دھکیل دیتی ہیں..

اسکرین پر پھر سے ایک میسج شو ہوا اور اس کی انگلیاں بے خودی میں کی بورڈ پر چل پڑیں.

"کیا کر رہی ہو تم"

"کچھ نہیں.. ابھی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی"

"اوہو! ملانی" جواب ابھرا

"کیا مطلب? نماز پڑھنے سے ملانی ہو گئی! کیا آپ نماز نہیں پڑھتے"

"نہیں! میرے حصے کی نمازیں بھی میری بہن پڑھ لیتی ہے." جواب پھر ابھرا تھا

نہ جانے کیوں لیکن اس وقت دل کے اندر کوئی چیز انگڑائی لینے لگی تھی. کچھ دیر وہ رکی اور پھر سے اس کی انگلیاں کی بورڈ پر چل پڑی تھیں.

"آپ کی بہن اپنی پڑھتی ہو گی ناں, آپ خود پڑھا کریں, اللہ ناراض ہوتا ہے, یہ اس کا حکم ہے.

"Active 5 min ago"

وہ شاید آف لائن جا چکا تھا. اس نے بجھے دل کے ساتھ کمپیوٹر آف کیا اور اٹھ کر کچن میں چلی گئی..

لیکن اس کا دماغ ایک ہی جگہ اٹکا ہوا تھا.

"یار یہ تیری بہن ملانی ہے"!

"کون سی بہن !میری کوئی بہن نہیں ہے "ولید نے اپنے دھیان میں کہا تھا.

"ہاہاہا !ابے گدھے میری آئٹم .. تیری بہن ,وہی فیس بک والی "اس نے مکا رسید کرتے ہوئے کہا.

"اچھا وہ ..کیوں کیا کہا ہے اس نے"

"کہتی ہے تم نماز کیوں نہیں پڑھتے ,یہ اللہ کا حکم ہے بلا بالا "اس نے جیسے اس کی نقل اتاری تھی.

"ہاں تو صحیح ہی تو کہہ رہی ہے ,اور دیکھنا کہیں تیری بہن ہی نہ بن جائے"

"ہاہاہا نہیں !ایک تو ہی ہے ان سب کا بھائی .. ولید بھائی "اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا تھا.

ولید اسے دیکھ کر رہ گیا.

.....

"اپنی آواز تو سنا دو"

وہ آج جیسے ہی آن لائی ہوئی ایک دم سے میسج موصول ہوا

"کیوں میری آواز سن کر کیا کرنا ہے آپ نے"

"کرنا کیا ہے ..یونہی دل چاہ رہا تھا کہ تمہیں بولتے سنوں"

"اچھا !لیکن سوری .میں ایک غیر محرم کو اپنی آواز نہیں سنا سکتی "اس نے فورا ٹائپ کر کے بھیجا تھا.

"اوہ "..ایک سمائلی ابھری تھی..

اس وقت وہ یہ بات کرتے بھول گئی تھی کہ وہ ابھی ایک نامحرم سے ہی بات کر رہی تھی .اور اللہ نے اسکی بھی ممانعت کی ہے.

...

تین ماہ گزر چکے تھے اور وہ اب بھی گھنٹوں ایک دوسرے سے فیس بک پر بات کیا کرتے تھے .لیکن کسی نے بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا تھا.

"مجھے لگتا ہے مجھے تمھاری عادت سی ہوگئی ہے .
تم سے بات نہ کروں تو دل نہیں لگتا"

"کیا یہ بھی مجھ سے پیار کرتا ہے " اس نے خود سے سوال کیا تھا

"اتنا عرصہ ہوگیا ہے ہمیں ایک دوسرے سے بات کرتے ..اب تک تو تمہیں مجھ پر یقین ہو جانا چاہیے .اب تو اپنا چہرہ دکھا دو".

"پہلے آپ دکھائیں ..پھر میں "اس نے نیم رضا مندی دی تھی.

اس کے کہنے کی دیر تھی ,اسے ایک تصویر موصول ہوئی.

بلیک شرٹ پہنے بازو پہ کوٹ لٹجائے وہ کسی پارک میں لی گئی تصویر تھی

"ماشاالله "! بے اختیار اس کے منہ سے نکلا تھا اور اس نے ٹائپ بھی کر دیا تھا.

"میری تو دیکھ لی ,اب اپنے بھی دکھا دو "سکرین پھر سے روشن ہوئی تھی.

"اچھا میں آپ کو بھیجتی ہوں لیکن پلیز دیکھ کر ڈلیٹ کر دینا"

"اوکے !تم بھیجو تو سہی"

"Take a photo"

"Upload a photo"

اس نے "Upload a photo" پہ کلک کیا اور سامنے گیلری کھل گئی

"کون سی بھیجوں کون سی بھیجوں "اس نے ناخن دانت سے کاٹتے خودکلامی کی تھی

Sending...

ایک بار اس کا جی چاہا کینسل کر دے

"لیکن نہیں اس نے مجھ پر ٹرسٹ کیا ہے تو مجھے بھی کر لینا چاہیے, وہ کیا کرے گا میری تصویر کو"

Sent..

نہ جانے کیوں اس کا دل دھڑک رہا تھا...کوئی انجانا سا خوف کروٹ لینے لگا تھا...

.....

"وہ اپنی تصویر بھیج رہی ہے"

"وہاٹ !!تو نے اسے بھی پٹا لیا "وہ حیران ہوتے ہوئے بولا تھا

اور تم نے اس بار بھی یقینا میری تصویر ہی بھیجی ہوگی .ہے ناں"!

"ہاہاہا !کتنے ذہین ہو نا تم "رضا نے قہقہہ لگایا تھا.

سکرین روشن ہوئی تھی.

"لو تمہاری بہن کی تصویر "..بولتے بولتے اس نے جونہی سکرین کی طرف دیکھا یک لخت زلزلے کی زد میں آگیا .اسے لگا وہ سانس لینا بھول چکا ہے.

سکرین پہ اس کی اپنی بہن سائرہ کی تصویر جگمگا رہی تھی..

****

،حساب کا لمحہ آچکا تھا .اس کے اعمال اس کی جانب پلٹ آئے تھے .دوسروں کی بہن بیٹیوں کو آئٹم کہنے والے کی اپنی بہن پر آئٹم کا لیبل لگ چکا تھا.

اس نے تو اسے اپنے دوست کی تصویر بھیجی تھی .اسے وہ اگر اپنی تصویر بھیج دیتا تو......؟؟؟؟؟

کیا اوہ کبھی اس کا سامنا کر سکتا تھا؟؟؟

کیا کوئی بہن آئندہ اپنے بھائی پر یقین کر سکتی تھی ..کیا کوئی بھائی اپنی بہن سے نظر ملا کر بات کر سکتا تھا...؟؟؟ شاید نہیں.....

****

آج اسے سمجھ آئی تھی کہ آج تک وہ اس سے کوئی غلط بات کیوں نہ کر سکا تھا .کیا چیز اسے روکتی تھی.

وہ سجدے میں گرا رو رہا تھا اور اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا.

لیکن کیا ہر بات کی معافی یونہی مل جایا کرتی ہے..؟؟؟؟

☆☆☆☆☆☆☆..

اک ذرا احساس از قلم.

ہاجرہ عمران خان

..'

وہ اپنے ماں باپ کی کل کائنات تھی .نہ جانے وہ گوری تھی یا کالی موٹی بھدی تھی یا پتلی اس کی آنکھیں بڑی تھیں کہ چھوٹی اسے کچھ پتا نہی تھا .

اسے اگر کچھ علم تھا تو یہ کہ وہ خوش ہے،

بوہت خوش یا پھر بوہت زیادہ خوش، وہ ہر وقت ہنستی رہتی تھی. اس کی زندگی بھرپور تھی.اس کی قسمت کی لکیروں میں صرف خوشی عبادت تھی

اس کا نام نہ جانے کیا تھا مگر وہ تتلی کے نام سے جانی جاتی تھی .اس کی آنکھوں میں سمندر کے قطروں جتنے خواب بستے تھے .آسمان کے

سب ستاروں کی روشنی اس کی آنکھوں میں بھری تھی..

وہ ہنستی تو دن نکل آتا وہ خاموش ہوتی تو شام ہو جاتی

کائنات کے سب حسین رنگوں کو چرا لائی تھی شاید اسی لیے اس کا نام تتلی تھا.. ، سفید شفاف جھرنے کی مانند بہتی چلی جاتی ادھر سے ادھر ، ہر جگہ ....

اسکی ایک سہیلی تھی، اس کے سنگ ہنستی گاتی مگر روتی نہی تھی کیونکہ تتلی روتی نہیں تھی .. اسے آنسوؤں کا پتا ہی نہی تھا تو وہ روتی کیسے ؟

اس کی اماں اور بابا نے اسے ہنسی اور خوشی کے سروں سے تخلیق کیا تھا.وہ خزاں سے واقف ہی نہ تھی غم سے آشنا ہی نہ تھی .

سو وہ خوش رہتی.اس کے ماں باپ نے اس پر کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی.اسکول کے بعد وہ اور اسکی پکی سہیلی مومنہ مل کر چھت پر مونگ پھلی کھاتیں .. ان کے چھلکے اپنے سروں سے اچھال کر اپنی پشت پر چھلکوں کا ڈھیر بنا دیتیں .وہ نالائق نہیں تھی.اچھا پڑھتی تھی .ہر سال اچھے نمبروں سے پاس ہو جاتی.اس کی سہیلی بھی اس کے دم قدم کلاس ختم کرتی جاتی .

ایک دن اس کی تعلیم ختم ہوگئی.وہ اسکول و کالج کے سب امتحانات سے فارغ ہو گئی تو اس کے اماں ابا نے اسکی شادی کردی ....

وہ شادی کے بعد بھی خوش رہنا چاہتی تھی... مگر نہ جانے کیسے اسے جدائی کی پھانس لگ گئی.زندگی میں پہلی بار وہ اپنے ماں باپ سے جدا ہوئی، جدائی کے احساس نے

تتلی کے رنگوں کو کچھ پھیکا کر دیا.اگر اس کے دوسرے بہن بھائی ہوتے تو بھی وہ اپنے باپ اور ماں کے لیے اتنی پریشان نہ ہوتی مگر اب ہر لمحہ وہ ان کے بارے میں سوچتی رہتی بوڑھے باپ کا کوئی بیٹا نہیں تھا جو اس کے لیے کمائی کرتا اس کو گھر بیٹھے کھلاتا.اس کے لیے دوا دارو کا بندوبست کرتا.اس کے لیے بہو لاتا جو ان کی خدمت کرتی اس کے بچے ہوتے اور تتلی کے ماں باپ کا بڑھاپا اس مصروفیت میں گزر جاتا . تتلی سارا دن لا یعنی سوچوں میں گزار دیتی وہ کوشش کے باوجود ان سوچوں سے چھٹکارا نہ پا سکتی .

ایک دن جب وہ اپنے ماں باپ سے ملنے ان کے گھر جا رہی تھی اس نے گھر سے کچھ پھل اور مکھن رکھ لیا جو وہ اپنے ماں باپ کے لیے لے جانا چاہتی تھی ......وہ چادر لیکر باھر نکلی تو اس کے شوہر محب نے تمام تھیلا چارپائی پر الٹایا ہوا تھا.محب نے سخت نظروں سے تتلی کو گھورا، شرمندگی سے وہ زمین میں گڑ کر رہ گئی.پھر لاکھ اس نے وضاحتیں پیش کیں ، مگر محب کچھ سننے پر تیار نہ ہوا .اس دن کے بعد جب بھی وہ اپنے ماں باپ کے گھر جاتی اس کے سامان کی تلاشی لیتا.آتے جاتے اس کے پاس موجود رقم چیک کرتا.وہ تتلی پر اعتبار نہیں کرتا تھا" .میری ماں نے بتایا تھا کہ شادی کے بعد لڑکیاں سسرال کی چیز چوری چوری میکے دے آتی ہیں .مجھے یقین نہیں آتا میری تتلی ایسا کرسکتی ہے...میرا تو یقین ہی ختم ہوگیا تم پر ."

وہ ہر الزام اس کے سر تھوپ کر بری ذمہ ہو گیا .وہ کہہ نہ سکی" کیا میرا اس گھر کی کسی چیز پر کوئی حق نہی ہے.میں جو تمام دن نوکروں کی طرح گھربار کی دیکھ بھال کرتی ہوں، اکیلی بغیر کسی سہارے اس کی اور اسکی ماں کی خدمات

کرتی ہوں، تو کیا میں اتنا بھی اختیار نہیں رکھتی کہ اس گھر میں سے کچھ اپنی مرضی سے کسی کو دے دوں؟ "وہ سوچتی رہتی اور کڑھتی رہتی .

" میری ماں کہتی ہیں، بیٹیوں والے تو ساری عمر بیٹیوں کو دیتے ہیں ان کا گھر بھرتے ہیں تا کہ وہ سسرال میں خوشی سے زندگی بسر کر سکیں .اپنے ہاتھوں دی کر بیٹیوں کا گھر بساتے ہیں ".محب نے مزید کنکر اسکی طرف اچھالے .تو وہ نئے زخموں سے روشناس ہوئی"ماں باپ بیٹیوں اور بیٹوں پر ایک طرح کا خرچ کر کے پالتے پوستے ہیں انہیں پڑھاتے ہیں .پھر قران پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتے کہ اولاد بالغ ہو جائے تو اس پر ماں باپ کی خدمت فرض ہے یہ کہیں نہیں لکھا ہوا کہ خدمت صرف بیٹے یا بیٹی کا فرض ہے ، جو صاحب حیثیت ہو وہ یہ خدمت سرانجام دے سکتا ہے.ہم نے رسم و رواج کی بنیاد پر ہندوؤں سے الگ وطن حاصل کرلیا مگر انکی رسموں کو ترک نہی کیا .ان کے ہاں عورت کے لیے شوہر بھگوان ہوتا ہے.لڑکی پیدا ہو تو زحمت ہوتی ہے . ہم نے ہندوؤں سے علیحدگی اختیار کر لی مگر ان کی رسم و رواج کو آج بھی گلے سے لگایا ہوا ہے " تتلی سوچتی رہتی، صرف سوچنا ہی اس کے بس میں تھا.

ایک یہ رسم ہمارے معاشرے میں رائج ہے جب لڑکی شادی کرو تو اگلی صبح لڑکے والوں کے لیے ناشتہ لے کر جاؤ .نہ جانے یہ رسم کیسے رواج پا گیئی حالانکہ ہونا تو یہ چاہئے کہ لڑکے والے اگلی صبح لڑکی کے گھر والوں کو ناشتہ پر دعوت دیں تا کہ وہ اپنی بیٹی سے مل سکیں.اس طرح لڑکی والوں کی عزت میں اضافہ ہو....چاہے ناشتہ کوئی بھی کروائے کیا فرق پڑتا ہے "وہ اپنی سوچوں کی اتھاہ سے نکل نہ پاتی، وہیں ابھرتی

اور تیرتی رہتی.

وقت گزرا اور رب نے اس کی گود میں خشبو کو ڈال دیا.بیٹی کی پیدائش کے بعد تتلی ایک نئے درد سے واقف ہوئی.ماں باپ کی جدائی نے اس کے رنگوں کو ہلکا کر دیا تھا مگر بیٹی کی پیدائش کے بعد وہ مرجھا کر رہ گئی .رسم و رواج کی زنجیروں میں

کر رہ گئی.رسم ورواج کی زنجیروں میں جکڑے هووے معاشرے میں اس کی "خشبو" کیسے سانس لے پائے گی؟اس کی سوچ سانپ کا کنڈل بن کر اس کے جسم و جان کو اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے تھی....خوشبو

چار سال کی ہوئی،دادی اور اس کا باپ محب ننھی خشبو پر زندگی نثار کرتے.پانچ سالوں میں اکلوتی اولاد نے محب کو اس کے لیے حد سے زیادہ حساس بنا دیا تھا.وہ اس کو دیکھ کر دن کا آغاز کرتا اور جب وہ آنکھیں بند کے کے سو جاتی تو اس کے لیے رات ہو جاتی.وہ اس کی

سانس سے سانس لیتا شاید خدا جب باپ کا امتحان لینا چاہتا ہے تو اس کے دل پر بیٹی کی محبت اتار دیتا ہے نہ جانے تتلی کے لیے یہ سب قدرت کا انصاف تھا یا وقت کا انتقام جو وہ ہر نا انصاف زی روح سے لیا کرتا ہے.جو کچھ بھی تھا تتلی اب کھل کر سانس لیا کرتی تھی.اس کی جان تو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی ایک طرف بوڑھے ہوتے بے آسرا اماں باپ دوسری طرف اپنا گھر،شوہر اور بچی،اسے لگتا وہ منقسم سی جی رہی ہے..

تتلی ماں باپ کے گھر کچھ لے کر تو نہ جاتی مگر ان کے پاس جا کر جتنی ہو سکتی خدمت کرتی،شاید یہی اس کی کمزوریوں کا اعتراف اور ازالہ بھی تھا...

آج پیر تھا محب اپنے کام پر تھا.وہ خشبو کو تیار کر کے ماں کے گھر جانے کے لیے تیار ہوئی تھی جب اچانک دروازہ کھلا.پھلوں کے لفافوں اور بیکری کے سازو سامان کے ساتھ محب اندر داخل ہوا."تم اپنے

ماں باپ کے گھر جارہی ہونا، یہ بھی لیجاؤ، اس نے جھکی نظروں کے ساتھ خشبو کو گود میں اٹھالیا" بلکہ آؤ میں تمہیں رکشہ لے کر دیتاہوں" وہ آگے بڑھا پھر مڑا "مجھے معاف کر دینا، آج تک کی تمام کوتاہیوں اور نا انصافیوں کے لیے" اس کا چہرہ بتارہا تھا کہ وہ اپنے رویوں اور سوچ کی تنگی پر بوہت شرمندہ ہے، وہ ششدر سی اسے دیکھتی رہی، اس نے چپکے سے دل میں سوچا مجھے تمہاری شرمندگی کی ضرورت نہی، ضرورت ہے تو بس ایک ذرا احساس کی، تمہارے اعتبار کی تسلی کی، خود کے اکیلا رہ جانے سے خوف آتا ہے مجھے تنہائی کے قاتل ہاتھوں کی موت سے خوف آتا ہے. وہ اور اس کی سوچیں جو اسے کبھی تنہا نہی چھوڑتی تھیں، بیٹی کی پیدائش نے اسے خوفزدہ اور محب کو حساس بنادیا تھا، اس کی ذات پر پڑے اندھے بہرے رسم ورواج کے پردے ایک ایک کر کے چاک ہورہے تھے. تتلی آج سالوں بعد ویسے ہی مسکرائی جیسا مسکرانا وہ بھول چکی تھی اور قدم دروازے کی طرف بڑھائے جس طرف محب خشبو کو لے کر گیا تھا. وہ بھی پیچھے چل پڑی............ آج تتلی خود کو پھر سے آزاد فضاؤں میں اڑتا محسوس کر رہی تھی.

☆☆☆☆☆

اقراء ضیاء، کراچی

”چند لفظوں کی کہانی“

”غریب کا دل“

”کل دوست کو مسکراتے ہوئے دیکھا

تو دل نے وجہ معلوم کرنا چاہی،

جواب میں وہ کہنے لگی

”میں نے غریب کے دل کو امیر پایا“

بھلا وہ کیسے جناب ؟ میں نے پُوچھنا چاہا

تو کہنے لگی،

”میں نے دو ، تین دن اِک ننھے پھول کو پڑھایا“

میں نے چونک کے پوچھا،

پڑھایا ؟؟ وہ کیسے ؟؟

”وہ ننھا پھول آپ کو معمول کے مطابق جامعہ کے باہر کھڑا چھوٹی موٹی اشیاء فروخت کرتا ہوا نظر آتا ہو گا“

واہ جناب واہ ، بہت خُوب

مگر اب تک آپ نے مُسکرانے کی وجہ نہ بتائی ،میں نے دریافت کرنا چاہا،

”کیا بتاؤں یہ سُن کر میری آنکھیں بھر آئیں ، کل کی بات ہے میرے پیسے نہیں تھے،اور وہ ننھا پھول میرے ہاتھ میں پیسے تھما گیا“

اقراء ضیاء، کراچی

☆☆☆☆☆

اروشمہ خان عروش فرام بہاول پور

خواب ریت کے گھروندے

ربیعہ ایک آذاد خیال لڑکی تھی اسے اپنی عزت کا خیال تھا نہ اپنے ماں باپ کی ناموس کی پرواہ اسے محبت تھی صرف اپنی ذات سے ۰۰۰

انعم اور اس کی دوستی ایک اکیڈمی میں ہوئی جہاں انعم پڑھنے گئ وہ کسی کو بھی نہ جانتی تھی ربعیہ اور انعم کی دوستی کی بڑی وجہ یہ بھی تھی اکیڈمی میں لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے اور ربعیہ کو اکیڈمی کی یہ بات بہت پسند تھی وہ امیر باپ کی بیٹی تھی اور اس کو اپنے باپ کی دولت کا غرور تھا ہزار ہزار کے کئ نوٹ اس کے پرس میں ہر ٹائم موجود رہتے اور وہ روز نت نیے سٹائل کے کپڑے جوتے پہن کے آتی ہر ٹائم بنی ٹھنی رہتی ۰۰۰۰ وقت گزرتا رہا اور اس کی میری دوستی دن بدن بڑھتی رہی تب مجھے پتہ چلا کہ لوگ جتنا اس کے بارے میں برا بھلا کہتے وہ اتنی بھی بری نہیں ہے خوامخواہ لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں اس نے مجھے اپنے ہر راز سے آگاہ کر رکھا تھا مجھ سے ہر دکھ سکھ بانٹتی تھی ۰۰۰ ربعیہ نے بتایا کہ اس کی منگنی اس کے سگے چچازاد سے ہو چکی ہے اور وہ دونوں فون پر بات بھی کرتے ہیں اور ملتے بھی ہیں اپنے منگیتر متعلق ہر بات کرتی مجھ سے اور مجھ سے بھی پوچھتی میرے بارے میں مگر میری زندگی میں کوئ ایسی خاص بات نہیں تھی جو میں اس کو بتاتی ۰۰۰۰ انعم ایک سیدھی سادھی اور شریف لڑکی تھی اور گھر سے اکیڈمی اور اکیڈمی سے گھر ہی اس کی زندگی امتحانات شروع ہونے والے تھے جس کی وجہ سے سٹوڈنٹ آج کل باقاعدگی سے اکیڈمی آرہے تھے ربعیہ اور انعم بھی روز ہی آتی اور ڈھیروں باتیں کرتی آج جیسی ہی وہ دونوں کلاس روم سے نکلی انعم نے نوٹ کیا کہ ربعیہ کی آنکھیں کسی کو تلاش کر رہی ہیں ربعیہ کس کو ڈھونڈ رہی ہو بس یار کیا بتاوں وہ مسکرا کے بتانے لگی یار تم نے ارسلان کو دیکھا ہے کتنا

خوبصورت لڑکا ہے میں تو بس دیکھتے ہی اسکی دیوانی ہو گئ وہ جتنی خوبصورت اور اچھی تھی یہ بات کرتے ہوے وہ مجھے دنیا کی بری لڑکی لگ رہی تھی مگر میں دل میں ہی سوچ کہ اگر میں کوئ بات کروں تو برا نہ منا جاے اور میں چپ ہی رہی گھر آکے بھی میرے ذہن سے یہ بات نہیں نکلی اور میں سوچتی رہی کیسی کیسی لڑکی ہے جس کو نہ اپنے والدین کی عزت کی پرواہ نہ اپنی عزت کا خیال ۰۰۰۰ آہستہ آہستہ ارسلان اور ربعیہ کی دوستی بڑھنے لگی تو انعم ربعیہ سے دور رہنا شروع کر دیا کیوں کہ میں انعم ایک شریف گھر کی حیادار لڑکی تھی اور اس کو ایسی باتیں پسند نہیں تھیں کہ لڑکیاں پڑھائ کے نام پر ماں باپ کی عزت کا جنازہ نکالتی پھریں ایک بار تو حد ہی ہو گئ جب میں ان دونوں کو ساتھ بیٹھے دیکھا اور مجھ سے رہا نہ گیا اور میں اس سے کہا کہ تم کیسی لڑکی ہو کل تم اپنے منگیتر کے لیے مر رہی تھی ہر ٹائم اس کا نام تمھاری زبان پر رہتا تھا اور اب تم اس لڑکے ارسلان کے ساتھ اس حد تک فری ہو گئ کہ ملنے لگی ربعیہ یہ سن کر کہنے لگی میرے چچا کے پاس ہے ہی کیا وہ بہت غریب ہے میرا باپ ان لوگوں کو خرچہ پانی دیتے میں اس گھر میں کبھی خوش نہیں رہ سکتی اس لیے میں فیصلہ کیا کہ میں اپنی مرضی سے ارسلان سے شادی کروں گی وہ بہت امیر ہیں اور آگے جا کے اس نے اپنے ابو کا بزنس سمبھالنا ہے یہ میری اور ربعیہ کی آخری بات تھی اس کے بعد امتحانات میں سب مصروف ہو گے ۰۰۰ آج بہت دن بعد اس کی اور میری بات چیت ہوئ میں دیکھا وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی اور خوشی سے چہک کر کہنے لگی انعم میری منگنی ہو گئ ہے مبارک نہیں دو گئ میں خوش ہو کہ کہنے لگی مبارک ہو ارسلان اچھا لڑکا ہے

ربعیہ جھٹ سے بولی اس سے کون کر رہا شادی مجھے تو اس کی شکل دیکھنا بھی گوارا نہیں ابھی اپنی ماں بہن کے کنٹرول میں ہے شادی کے بعد تو مجھے غلام بنا کے رکھتا مجھے ایسے لڑکے پسند نہیں مگر یار تم تو ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے انعم نے حیرانگی سے

پوچھا ارے یار ٹھیک ہے وہ مجھے محبت کرتا تھا مگر مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی وہ میرے قابل ہی نہیں تھا انعم یہ دیکھو یہ میرے پاپا کے دوست کا بیٹا ہے ربعیہ نے اپنی بک سے تصویر نکال کے انعم کو دکھائی اس سے ہوئی ہے میری منگنی کیا انعم نے حیرت سے پوچھا تمھارے پاپا کیسے مان گے اور انہوں نے تمھارے چچا کو انکار کر دیا ہاں کر دیا انکار اور ویسے بھی شادی میں نے کرنی ہے میرے پاپا نے نہیں اور جب میں خوش نہیں تو وہ کیسے کر سکتے میری چاچا کے گھر شادی تو کیا تمھارے پاپا کو اس بات سے دکھ نہیں ہوا ہو گا؟۰۰۰۰دکھ کیوں ہو گا جب میرے ماں باپ خود لو میرج کر سکتے تو میں کیوں نہیں کر سکتی انعم نے ربعیہ کی باتیں سن کر سر پکڑ لیا اور سوچنے لگی کہتے ہیں ماں باپ کو بیٹے تنگ کرتے ہیں مگر ربعیہ جیسی بیٹیاں بھی مصیبت سے کم نہں ہوتی امتحان شروع ہو گے ربعہ اب بھی اپنی اور منگیتر کی ناتیں سناتی مگر اب انعم کو اس کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کیوں کہ وہ اس کے دل سے اتر چکی تھی انعم اپنے ماموں کے ساتھ آتی پیپر دے کے چلی جاتی اور ربعیہ رکی رہتی پتہ نہیں کب جاتی تھی اور کیوں رکی رہتی انعم نے پوچھنے کی کوشش نہیں کی آج وہ پیپر کر کے جیسے باہر آئی ربعیہ اس کے سامنے آگئی اور کہنے لگی انعم تم مجھ سے کیوں ناراض ہو بات بھی نہیں کرتی اتنے میں انعم کے ماموں آگے اور وہ کوئی جواب دے بنا چلی گئی یہ ان دونوں کی آخری ملاقات تھی

امتحانات کے کچھ عرصے بعد انعم کی شادی اس کے ماموں زاد سے ہو گئی اللہ نے شادی کے ایک سال بعد اس کو بیٹی دی مگر اس کی عمر کم تھی پیدائش کے کچھ دن بعد فوت ہو گئی اور انعم کے لیے یہ صدمہ بہت بڑا تھا وہ ہر ٹٹم اداس اور روتی رہتی ایک دن اس کی سہیلی جو اس اکیڈمی میں ٹیچر تھی جہاں کبھی انعم پڑھتی تھی اس کو اپنے ساتھ چلنے کا کہا کہ کچھ دل بہل جاے گا تمھارا اور انعم اس کے ساتھ اکیڈمی چلی گئی وہاں ربعیہ کی بہن آمنہ ملی وہ نویں جماعت کی طالبہ تھی انعم نے

اس سے ربعیہ کا پوچھا کیسی ہے وہ تو وہ کہنے لگی پتہ نہیں آپی کیسی ہیں ہم ان سے نہیں ملتے ... نہیں ملتے کیا مطلب ؟ کہنے لگی باجی آپ کو نہیں پتہ آپی گھر سے بھاگ گئ تھیں کیا اپنے منگیتر کے ساتھ مگر کیوں تمھارے پاپا نے خود منگنی کی تھی باجی وہ اپنے منگیتر کے ساتھ نہیں ہمارے ہمسائے علی کے ساتھ بھاگ گئ تھی میرا دماغ زور سے گھومنے لگا وہ کہنے لگی ان کی وجہ سے میرے پاپا کو فالج ہو گیا وہ پاپا کو دیکھنے آئ تھی مگر پاپا نے ملنے سے انکار کر دیا اور ہم سب کو بھی ملنے سے سختی سے منا کر دیا ربعیہ کے بارے سن کر میری آنکھوں میں آنسوں آ گے وہ جیسی بھی تھی پھر بھی میری دوست تھی آمنہ بتانی لگی کہ وہ اپنے گھر خوش نہیں بہت بار فون کر کے واپس آنا چاہتی مگر پاپا ان کی بات سننے کو تیار نہیں

ربعیہ کے بارے سن کر انعم بہت پریشان ہو گئ اور اس کے لیے دعا کرنے لگی میری زندگی ہنسی خوشی گزرنے لگی مگر ربعیہ کا حال برا ہوا ظاہر ہے جو لڑکی اپنے والدین کی عزت کچل کر خوابوں کے محل بنائے گی تو وہ ریت کے گھروندے ہی ثابت ہوں گے میں اس کو بہت سمجھاتی تھی اس کو اپنی دوست مانا تھا اس لیے فکر کرتی تھی مگر اس کو میری باتیں سمجھ نہیں آتی تھی یا پھر وہ جان بوجھ کہ سمجھنا نہ چاہتی تھی کہ وہ جس راستے پر چل رہی وہ ٹھیک راستہ نہیں میں نے زندگی کا سیدھا اور سچا راستہ اختیار کیا اور اپنی مرادوں کو پا لیا جبکہ اس نے زندگی کے ۔ٹیڑھے میڑھے راستوں کو چنا اور ڈوبتی ابھرتی بالآخر بھنور میں جا پھسی جس لڑکے سے شادی کی اس نے وفا نہ کی ایک بیٹی کی پیدائش کے بعد وہ بہت زیادہ تنگدستی میں گھر گئ بچی کے لیے دودھ کے بھی پیسے نہیں ہوتے اس کے شوہر نے اس کو بے یارو مددگار چھوڑ دیا تنگ آ کر وہ ایک فلاحی ادارے میں چلی گئ وہاں صفائ کا کام کرتی تو اس کی بچی کو دودھ وغیرہ مل جاتا ان سب باتوں کا پتہ مجھے اپنے خاوند کی بابت پتہ چلا وہ ایک فلاح ادارے کے سربراہ تھے جہاں ربعیہ کام کرتی میں اس سے ملنے چلی

گئ اپنے شوہر کے ساتھ وہ میرے گلے لگ کہ بہت
روئ اور مجھے کہا کہ میں جا کہ اس کے پاپا سے بات
کروں میں اور میرے شوہر نے اس کے والدین کو
سمجھایا تو وہ آکر فلاحی ادارے سے اس کو لے گیے اور
معاف بھی کر دیا آج ربعیہ ایک سکول میں ٹیچر ہے وہ
نوکری کر کے اپنا اور اپنی بچی کا پیٹ پال رہی ہے سچ
ہے جو لڑکیاں اپنے والدین کی عزت کا خیال نہیں
کرتی وہ معاشرے میں بڑی مشکل سے عزت پا سکتی
ہیں کیونکہ کامیابیوں کے لیے والدین کی دعایئں بہت
ضروری ہیں #اروشمہ خان عروش فرام بہاول پور

نام قیصر عباس

ولد محمد فاروق

منزل

ہیجان انگیز جذبات ابھرے تو خیالات حسرت اور افسردگی کا جامہ پہنے آواز کی صورت میں نکلے جس سے سنسان فضا میں سکوت کا عالم ٹوٹ گیا۔ "یار ایسے لگتا ہے جیسے سورج آج ہم سے کسی بات پہ خفا ہو کر آگ بگولا ہوا کھڑا ہے فلک پر کہیں سے بھی امڈتا ہوا ابر آرہا ہے اور نہ ہی ابر کا کوئی آوارہ خرام ٹکڑا جو سورج کے سامنے آکر، کچھ دیر کے لیے اس کی جھلسا دینے والی شعاعوں کو، دھرتی پر پڑنے سے روک لے پھر بیزار ہو کر چل یار اور گرمی برداشت نہیں ہوتی ہے" بس کچھ دیر اور دوسرا بولا" "اتنے پیسے دے کر مشکل سے یہ نوکری لگوائی تھی سالوں نے کہاں پر پھینک دیا ہے کمائی نہ کچھ الٹا مصیبت" اس پر دوسرا ہنس پڑا" سالے تو یہاں ہنس رہا ہے وہاں سیٹھ میرے باپ کے پیچھے پڑا ہوا ہے کہ کب اس کا قرض چکتا ہو گا پھر افسردہ ہو کر" سالے کا سود بھی بڑھتا جا رہا ہے"۔ اس پر دوسرے نے کوئی جواب نہ دیا اور بھنویں سکیڑ کر دور سے کالی چادر میں آتی ہوئی عورت کو دیکھنے لگا" چال ڈھال اور جسم کے ڈیل ڈول سے تو وہی لگتی ہے" "کہاں؟" "وہ دیکھ" پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے دوسرا بولا" "ہاں!" جب وہ پاس سے گزر کر، کچھ فاصلہ طے کر گئی تو وہ اس کا تعاقب کرتے ہوئے چل پڑے۔

دربار کی چوکھٹ پر پہنچتے ہی اس کی آنکھوں سے اشک ٹپک پڑے وہ نم آلود آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اندر داخل ہوئی اور مرقد سے لپٹ کر اشک بہانے اور اپنے دردِ غم اور زمانے کی ستم ظریفیاں بیاں کرنے لگی پیچھے سے وہ دونوں بھی آپہنچے اور سر چڑھ کر بولے" چلو تمہیں صاحب بلا رہا ہے۔" ان

کے قدموں کی آہٹ سن کر وہ خاموش ہو گئی تھی اور اس نے اپنا سر سجدے میں جھکا لیا تھا لیکن ان کی آواز کے کانوں میں پڑتے ہی وہ ہڑبڑا کر سرعت سے اشک صاف کرتے ہوئے اٹھ گئی اور استفسارانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی "کیا ہماری چوری کا سامان مل گیا ہے؟" ان میں سے ایک نے کہا" اسی لیے تو آئے ہیں کہ تم تھانے میں آکر اپنے سامان کی تسلی کر لو۔ " "وہ خوشی سے پھول کر بولی میں آپ کا کس طرح سے شکریہ ادا کروں!۔" "ابھی کچھ نقدی ہے تو ہمارا کر دو اور پھر دربار والے کا ادا کر دینا وہ تو کل بھی یہیں ہونگے ویسے بھی وہ درگاہ والوں کو تھوڑا ہی ملتے ہیں مجاوروں کے کام آتے ہیں" اس پر دوسرا مسکرایا مگر ساتھ ہی ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے اس سے کہ رہا ہو جلدی کرو اسے لے چلو۔ جبکہ وہ پہلے کی باتوں پر اس کو گھٹیا اور حرصی گردانتے ہوئے اس کی گفتگو ختم ہونے تک دیکھتی رہی اور پھر روکھا سا منہ بنا کر پیسے دیتے ہوئے ان کے ساتھ چل پڑی۔

جیسے ہی وہ تھانے دار کے پاس گئی تھانیدار اس پر برس پڑا اور اسے ایسی ایسی سنانے لگا کہ آس پاس کھڑے لوگوں کے کانوں کے کیڑے جھڑنے لگے وہ شرم سے آب آب ہو گئی اور آنچل میں منہ چھپا کر روتے ہوئے کہنے لگی "یہ سراسر الزام ہے میں اپنی اولاد کی قسم کھا کر کہتی ہوں یہ سراسر الزام ہے۔۔" لیکن وہ طعن و تشنیع کرتا رہا اور پھر اس نے اس کے رخسار پر طماچے رسید کرنا شروع کر دیے اور سیل کے اندر بند کر دیا۔

دن ڈھل گیا رات چھا گئی لیکن اسے رہائی نہ ملی اور نہ ہی اسے امید نظر آرہی تھی سوائے ایک راستے کے مگر اس کا ضمیر اسے ہرگز ہرگز اپنانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا کچھ دیر بعد تھانیدار آیا اور منت سماجت کرنے لگا" پلیز مجھے معاف کر دو میں بھگوان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آئندہ آپ کو کچھ نہیں کہوں گا میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں پلیز میری شکایت ان سے نہ کرنا"۔ شیوانی تجسس میں پڑ گئی پھر جب اس نے اسے

دیکھا تو مزید تجسس میں پڑ گئی کہ یہ نوجوان کون ہے اور جب نوجوان نے اس کے چہرے کی جانب دیکھا تو چونک اٹھا اور پھر دوسرے ہی لمحے سیخ پا ہو کر تھانیدار پر برس پڑا "میں ابھی پاپا سے کہہ کر تمہاری وردی اتروا تا ہوں" "سر سر اندر سر غلطی ہو گئی میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں آئندہ ایسا نہیں ہو گا آپ ڈی۔ایس۔پی صاحب سے کچھ مت کہنا" "دور ہٹ" اندر اس کو دھتکارتا ہوا شیوانی کو ساتھ لے کر چل پڑا۔

جیسے ہی اس کی فون پر بات ختم ہوئی شیوانی جو کافی دیر سے حیرت میں مبتلا تھی اندر سے گویا ہوئی "اے اجنبی میں حالات کی ستائی ہوئی ہوں مجھے سچ سچ بتانا کہ تم کون ہو؟، کہاں سے آئے ہو؟، اور یہ کہ میری مدد کیوں کر رہے ہو؟"۔ "آپ نے تو ایک ہی سانس میں مجھ پر کئی سوال داغ دیے ہیں پہلے آپ رکشے میں بیٹھیں پھر میں آپ کو سب تفصیل سے بتاتا ہوں" اس نے ایک آٹو والے کو روکتے ہوئے کہا۔ پھر بیٹھتے ہی اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری، تھوک نگلا اور گلا صاف کر کے لب کشا ہوا "وہ میں۔۔وہ۔۔" "ہاں ہاں کہو" شیوانی نے اسے شک بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ میں۔۔ آپ کی لڑکی سے بے انتہا۔۔" اس سے پہلے کہ وہ سرعت سے اپنی بات مکمل کرتا شیوانی نے فوراً اس کی بات کاٹ دی اور کہا "بس۔۔! چپ ہو جاؤ" "لیکن وہ۔۔۔" پھر اس نے شیوانی کے چہرے کا تاثر دیکھا تو چپ سادھنے میں ہی بھلائی جانی کہ کہیں بات بگڑ ہی نہ جائے۔ کچھ ہی دیر بعد گھر بھی آ گیا شیوانی نیچے اترتے ہوئے اس کی جانب دیکھ کر "بولی آئے ہو تو کھانا کھا کر جانا"۔ اندر اس کی سمت دیکھتے ہوئے نیچے اتر آیا اور آٹو والے کو کرایا دے کر اس کے پیچھے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

دستک ہوتے ہی آواز آئی "کون" "میں ہوں انجلی" فوراً دروازہ کھل گیا۔ جونہی لڑکیوں کی نظر ماں کے چہرے پر چھپی انگلیوں کے نشان پر پڑی تو وہ تڑپ

اٹھیں اور آبدیدہ ہوتے ہوئے استفسار کرنے لگیں کہ "یہ کس نے کیا ہے؟ آپ کچھ بولتی کیوں نہیں؟ کہیں یہ۔۔" شیوانی نے آنکھوں سے اندر کی طرف اشارہ کر کے انھیں خاموش رہنے کا کہا۔" اسی اثناء ایک گول لپٹا ہوا کاغذ آکر گرا۔ انجلی نے اسے اٹھایا اور پڑھنے لگی وہ جوں جوں کاغذ پر تحریر عبارت پڑھتی جار ہی تھی اس کا رنگ اڑتا جارہا تھا اندر نے اس کا فق ہوتا رنگ دیکھ کر کاغذ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور پڑھنا شروع کر دیا اور پھر پڑھ کر شیوانی کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا" اس کمینے رکشے والے نے۔۔۔ پھر لمبا سانس کھینچ کر آنٹی ہمارے پاس ٹائم کم ہے"۔ شیوانی نے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھا اور پھر دھیمے لہجے میں طنزیہ انداز میں بولی" اندر تمہارا باپ تو ڈی ۔ایس۔پی ہے پھر۔۔؟" جواب سن کر اندر پھیکے سے انداز میں مسکرایا اور بولا" ہاں آنٹی شیوانی جی لیکن وہ یہاں کہ نہیں ہیں اگر وہ کہ بھی دیں تو آپ تو پولیس والوں کو جانتی ہی ہیں۔ پولیس کے پہنچنے سے پہلے منسٹر کا بیٹا یہاں پہنچ جائے گا دیکھ لیں؟"۔ شیوانی نے کن نظروں سے اسے دیکھا اور پھر لڑکیوں کو ضری سامان اٹھا کر چلنے کا کہا چند گھڑی بعد شیوانی اپنی لڑکیوں کے ساتھ اپنا ضروری سامان اٹھا کر لائی اور اندر سے بولی" پہلے گیتا پر ہاتھ رکھ کے قسم اٹھاؤ کہ تم ہمیں دھو کہ نہیں دو گے اندر نے بلا جھجھک قسم اٹھالی"۔ اور پھر وہ چل پڑے۔

اندر موبائل پر نمبر ڈائل کر کے جونہی بات کرنے لگا شیوانی نے فوراً سپیکر اون کرنے کا کہا اندر نے اون کر دیا اور اون کر کے ان سے متعلق ایسے بتلایا جیسے اب ان کو ساتھ لے کر چلے گا۔ کال ختم ہوتے ہی شیوانی متفکر ہو کر بولی" اگرچہ وہ خفیا ایجنسی کا آدمی ہے مگر اس کی بھی کیا گارنٹی ہے" اندر نے اس کی طرف تشویش بھری نظروں سے دیکھا اور کہا" کہیں آپ کا ارادہ اس گھنے اور خوف ناک جنگل سے جانے کا تو نہیں ہے" شیوانی نے کوئی جواب نہ دیا اندر ایسے جیسے کچھ سمجھ گیا ہو اور پھر دوسرے ہی لمحے چونک کر

بولا" مجھے یاد آیا" لڑکیاں جو جنگل کے نام سے گھبرا گئیں تھی بولیں "کیا؟" "یہاں میرے دوست کی ایک دوست ہے جو یہاں کے نامی گرامی غنڈے کی بیٹی ہے وہ اکثر اس کے متعلق گفتگو کرتا رہتا ہے اس سے اس کو مدد کرنے کا کہتا ہوں" شیوانی لڑکیوں کی طرف دیکھ کر جو کچھ بولنے ہی والیں تھی لیکن ماں کے اس طرح دیکھنے سے خاموش ہو گئیں " ٹھیک ہے " اندر نے کال کر کے اسے کہا تو اس نے ذرا سی حیرت ،ذرا سے غصے اور ذرا سی تکرار کے بعد کانفرنس کال کر کے اپنی گرل فرینڈ سے اس کا رابطہ کروا دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لڑکی اپنی گاڑی لے کر ان کے پاس آگئی شیوانی نے ایک نظر گاڑی اور لڑکی کی جانب دیکھا اور پھر کالی شیشوں والی گاڑی میں کسی قدر تحفظ محسوس کرتے ہوئے اپنی لڑکیوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔

پھر وہ ان کو کافی حد تک دور اور محفوظ مقام پر ٹھہرا کر واپس چلی گئی کیونکہ اسے صبح ہونے سے پہلے گھر لوٹنا تھا۔ سونے سے پہلے اندر نے کسی کو ایس ایم ایس کرنا چاہا مگر پھر یہ محسوس کرتے ہوئے فون بند کر کے سو گیا کہ شیوانی اس پر نگاہ رکھے ہوئے ہے۔

صبح شیوانی نے اندر کے بیدار ہوتے ہی اس سے کہا کہ " ہم ناشتہ کرتے ہی یہاں سے نکل جائیں گے اور دوسری بات یہ کہ میری لڑکی کی طرف اتنا مت دیکھا کرو۔ جیسے ہی وہ ہر طرح سے محفوظ ہو جائیں گے وہ خود اپنی بیٹی سے اس کی شادی کر دے گی میں نہیں چاہتی کہ اس سے پہلے کچھ ایسا ویسا ہو اور ہاں آخری بات اپنا موبائل فون مجھے دے دو" اندر اسے موبائل فون دے کر واش روم چلا گیا جب باہر نکلا تو شیوانی پلکوں میں بوندیں پروئے کھڑی تھی اندر سوچ میں ڈوب گیا لیکن جونہی اس کی نظر اس کے ہاتھ میں موجود اخبار پر پڑی تو اس نے دل ہی دل میں اس لڑکی کو شاباش دینا شروع کر دی جو رات انھیں چھوڑنے آئی تھی" ویلڈن مدھو ویلڈن تم نے میرا اشارہ سمجھ ہی لیا"،لیکن چہرے پر وہی تفکر کا تاثر قائم رکھا"اندر خود پر ضبط رکھنا اگر ان لوگوں کو علم ہو گیا تو ہو سکتا ہے

وہ ہمارے ساتھ چلیں یا ڈر جائیں اب میں تجھے لے جاؤں گی، محفوظ مقام پر۔'' ۔ یہ کہتے ہوئے شیوانی نے اخبار اس کی جانب بڑھادیا اندر ذرا سا پریشان ہو کر اخبار پر لکھی خبر دیکھ کے واپس واش روم چلا گیا اور نل کھول کر دل میں منسٹر کو دل کھول کر کوسنے لگا جس کا ایک طرف مطالبہ تھا کہ اس کے بچے کی زندگی بچالی جائے یعنی اس کے لڑکے کی انجلی سے شادی کروادی جائے اور دوسرا یہ کہ انجلی اور اس کے گھر والوں کی رضامندی سے کرائی جائے کچھ دیر بعد وہ دوبارہ منہ دھو کر اور خشک کر کے سوائے پلکوں والی جگہ کے منہ لٹکائے غم زدہ حالت میں باہر آگیا اور پھر اندر چلا گیا کچھ دیر بعد جیسے اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا ہو باہر آیا اور اخبار جیب میں ڈالتے ہوئے چل پڑا۔

کھانے کی میز پر بیٹھتے ہوئے شیوانی نے ایک نظر اندر کی طرف دیکھا اور پھر میز بانوں سے مخاطب ہوئی ''اس اخبار میں دراصل ہمارے مخالفوں کے جیتنے کی خبر چھپی تھی اس لیے میں فوراً اندر کو دکھانے چلی گئی تھی مگر اندر نے اسے پڑھتے ہی فوراً آگ لگادی اور اس کی راکھ واش روم میں بہادی مجھے افسوس ہے کہ ہماری وجہ سے آپ کا اخبار ضائع ہو گیا''۔ میز بانوں نے اس بات کا بالکل بھی برا نہ منایا بلکہ ان کے ہارنے پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا کہ وہ دل چھوٹا نہ کریں بھگوان نے چاہا تو اگلے الیکشن میں ضرور جیت جائیں گے'' جبکہ انجلی اور اس کی بہن اندر اور پھر اپنی ماں کی طرف دیکھنے لگیں کہ آخر ماجرہ کیا ہے۔۔؟

ناشتے سے فراغت کے بعد وہ اجازت لے کر چل پڑے۔ راستے میں شیوانی نے بیٹیوں کو ساری بات بتلائی اور تمام موبائل سمیں اور وہ بھی جو اندر سے لیا تھا اور مزید سمیں لے کر دریا میں پھینک دیں۔ اندر حیرت سے کچھ بولنے لگا تو اس نے اشارے سے اطمینان رکھنے کا کہا۔ اندر خاموش ہو گیا۔ اور پھر جہاں وہ لے کر چلی چلا گیا جہاں ٹھہرایا ٹھہر گیا۔

ایک روز جب وقت کافی گزر گیا اس پہ اطمینان رکھ کے شیوانی نے اسے کچھ ضروری سامان لانے کے لیے

بازار بھیجا اس نے موقع ملتے ہی سب سے پہلے مگر محتاط ہو کر اپنے باس کو فون کیا اور سارا ماجرا کہ سنایا باس نے سب سن کر اسے جلد معاملہ نمٹانے کا کہا اور منسٹر کا نمبر بھیجتے ہوئے کہا کہ " جلد نیا موبائل خرید کر منسٹر سے رابطہ کرو وہ بہت بے چین ہے "۔ منسٹر سے رابطہ کر کے جب اس پر یہ واہوا کہ کوئی چالبازی نہیں تھی بلکہ وہ اس کے لڑکے کی غصے اور جلد بازی میں کی گئی بیوقوفی تھی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ پھر اس نے اس بات کا شکر ادا کیا کہ وہ اسے چالبازی سمجھ کر نکل کھڑا ہوا و گرنہ شاید جان سے جاتا رہتا۔ بات جاری تھی کہ منسٹر کا لڑکا بھی آگیا اس نے چھوٹتے ہی فون پر دھمکیاں دینا شروع کر دیں بڑی مشکل سے اندر نے اور اس کے باپ نے اسے مطمئن کیا اور اندر نے اس سے وعدہ کیا کہ وہ ابھی جا کر اپنی ترکیب آزمائی کرتا ہے اور تمہیں خفیہ موبائل رکھ کے ایک ایک لفظ سناتا ہے بس تم نے خاموش رہنا ہے و گرنہ سارا کھیل بگڑ جائے گا"۔

اپنے منصوبے کے مطابق وہ افسردہ سا چہرہ لے کر ان کے پاس گیا شیوانی نے دیکھتے ہی اس سے اداسی کی وجہ دریافت کی تو جان بوجھ کر بوکھلاتے ہوئے ایسی ویسی باتیں کرنے لگا۔ شیوانی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا" میری طرف دیکھو اور صحیح صحیح بتاؤ کہ کیا ہوا ہے" "کچھ نہیں ایک دوکان میں ایک فلم کا ایسا سین دیکھ لیا تھا جس سے مجھے وہ یاد آگیا"۔ شیوانی "کون" "بس چھوڑیں آپ، وہ تھا ایک فیس بک پر دوست" "اب کچھ بتاؤ گے بھی یا یونہی پہیلیاں بجھاتے رہو گے" دھیمے لہجے میں "وہ ۔۔ماں جی۔۔ فیس بک پر میرا دوست بنا تھا اسی کے زریعے سے، مجھے آپ تک رسائی ہوئی تھی وہ غور سے اس کی طرف دیکھنے لگی اس نے اپنی بات جاری رکھی "اس نے آپ لوگوں کی بڑے مندر کے پاس فوٹو کھینچ کر، فیس بک پر اپ لوڈ کی تھی جس میں اس نے انجلی اور آپ لوگوں سے محبت کا اظہار کیا تھا پھر نجانے اسے کیا ہوا کہ اس نے کبھی بھی آپ لوگوں

کے بارے میں کسی بھی قسم کی اپ لوڈیا بات نہیں کی
۔ہاں البتہ میرے مسلسل پوچھنے پر صرف اتنا لکھا تھا
کہ اسے محبت ہے ان سے ان کی رسوائی سے
نہیں"۔شیوانی نے انجلی کی طرف دیکھا انجلی نے نفی
میں سر ہلا دیا۔پھر اس نے اندر کی طرف دیکھا اور
بولی" کون ہے وہ" اندر" نہیں جانتا البتہ۔۔۔ فیس
بک پر سے اس کی فوٹو دکھا سکتا ہوں"" نام ؟" "نام
عامر خان لکھا ہوا تھا اصل میں یہ اس کا نام نہیں تھا وہ
خود کہتا تھا اس نے یہ عامر خان سے محبت کی وجہ سے
لکھا ہوا ہے" شیوانی نے اس کے معصوم سے بناوٹی
چہرے کی جانب دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے کہا" جاؤ لے
آؤ موبائل اور اسکی تصویر دکھاؤ شاید کوئی۔۔۔"اور
پھر خاموش ہو گئی۔
تصویر دیکھتے ہی شیوانی، انجلی اور اس کی بہن اندر کی
طرف دیکھنے لگیں۔"کیا ہوا؟ ہے تو بھلا چنگا اور
خوبصورت بھی اور خوب سیرت بھی اگر آپ کو پسند
نہیں ہے تو آپ کی مرضی لیکن مجھے اس طرح سے

مت دیکھیں۔ویسے۔۔اس میں۔۔۔کیا۔۔خرابی
ہے" اندر نے ان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا"خرابی
۔۔۔!شیوانی نے بھڑکتے ہوئے کہا پھر مزید بگڑتے
ہوئے کہا" یہی تو وہ ہے جس کی وجہ سے ہمیں یہ سب
دیکھنا پڑ رہا ہے"" آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہو گی
ذرا غور سے دیکھیے نیلی شرٹ اور سفید ہیٹ والا۔بڑا
بھلا مانس اور تہذیب والا ہے"شیوانی نے پہلے لڑکیوں
کی سمت دیکھا اور پھر اندر کی طرف دیکھ کر بولی"
ہاں یہی تو یہ اسی منسٹر کا لڑکا ہے جو انجلی کو حاصل کرنے
کے لیے ہر اوچھے ہتھکنڈے استعمال کر رہا
ہے"۔اندر یہ سن کر سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور پھر کچھ دیر
بعد گویا ہوا" یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اپنے سے کم
حثیت والے گھرانے میں منسٹر اپنے بیٹے کی شادی نہ
کرنا چاہتا ہو اور بیٹے کی طرف سے مجبور ہو کر یہ سب
کر رہا ہو جیسے اکثر لالچی اور انا پرست ماں باپ کرتے
ہیں""نہیں وہ۔۔۔"اور پھر خاموش ہو گئی۔۔"لگتا
ہے آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔اصل بات کیا ہے

""نہیں کوئی ایسی بات نہیں ہے" شیوانی نے جھلا کر جواب دیا۔ "نہ بتائیں کوئی بات نہیں اندر نے روٹھنے والے انداز میں کہا اور ایک طرف جا کر بیٹھ گیا"۔

"میں کشمیر کے ایک برہمن گھرانے سے ہوں ایک روز میں اور میری سہیلی کرشمہ ٹیوشن پڑھ کر گھر لوٹ رہے تھے کہ ہمیں رستے میں آرمی کے کچھ سپاہی مل گئے پہلے تو وہ ہم سے چھیڑ چھاڑ کرتے رہے اور پھر بد تمیزی اور زبردستی کرنے لگے ہم نے انھیں بتایا بھی کہ ہم ہندو ہیں اور اپنے قرابت والوں کے نام بھی بتائے لیکن ان کی آنکھوں پر ہوس کی پٹی چڑھی ہوئی تھی جب کوئی چارہ نہیں رہا تو میں نے قاسم کو آواز دی جو میرے سختی سے منع کرنے کے باوجود بھی چھپ چھپ کر میرا پیچھا کیا کرتا تھا پھر اس کی آواز بھر آئی لیکن افسوس بدقسمتی سے وہ نہ آیا۔ کچھ دیر بعد اچانک گولیاں چلنے کی آواز آئی فوجی غار سے باہر نکل نکل کر بھاگنے لگے اور ہم گھاں ایک کونے میں سہم کر بیٹھ گئیں ۔یہ قاسم ہی تھا جو شاید کسی نے میری آواز اس تک پہنچادی تھی یا کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا تھا آ پہنچا اس کی آنکھوں میں نفرت کی چنگاریاں اور رنج و غم کے جذبات تھے جو امڈ کر پانی کی صورت میں باہر آرہے تھے اور شدتِ کرب کے باعث اس کے لب کپکپا رہے تھے وہ چادر لیے ہمارے پاس آیا میں روتی ہوئی اس سے لپٹ گئی اور میری سہیلی بھی۔ پھر ایک فوجی پر جو ابھی تک کراہ رہا تھا اس نے میرے ہاتھ میں گن تھما کر فائر کھول دیے اور میں نے بھی اس وقت تک ٹریگر سے ہاتھ نہیں ہٹایا جب تک کہ گولیاں ختم نہیں ہو گئیں۔

پھر وہ مجھے اور میری سہیلی کو سنبھال کر فوراً وہاں سے نکل کھڑا ہوا اس سے پہلے کہ فوج یا پولیس پہنچتی ۔تھوڑی دور نکل کر میری سہیلی نے ہمیں اچانک ایک طرف دھکہ دے دیا اور دوڑ کر پہاڑی سے چھلانگ لگا دی۔ میں چلائی لیکن قاسم نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور مجھے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور پھر وہ مجھے وہاں سے لے کر چل دیا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس خوف سے

کہ کہیں ان کی وجہ سے کشمیر میں ظلم وبربریت نہ بڑھ جائے۔

ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر دربدر کی خاک چھانتے، چھپتے چھپاتے پھرنے لگے اور پھر پیچھے کسی سے رابطہ بھی نہ کیا۔یوں ہی چھپتے چھپاتے ہم اس منسٹر کے علاقے میں آ گئے لیکن بدقسمتی ہمارا یہاں بھی پیچھا کر رہی تھی۔ایک روز کسی نے اس منسٹر کو ہمارے بارے میں خبر دی تو اس نے ہمیں اٹھوالیا" اتنا کہ کر وہ رونے لگی" اس کے لوگوں سے ہاتھاپائی کرنے پر اس نے میرے سہاگ کو ہماری آنکھوں کے سامنے بڑی بے دردی سے ماردیا اور انجلی کو اپنے قبضے میں رکھ کر مجھ سے زیادتی کرنے لگا پھر وہ خاموش ہو گئی اور آنچل سے آنسو صاف کرنے لگی لڑکیاں از خود روتے ہوئے ماں کو دلاسہ دینے لگیں اندر نے بھی رخ بدل کر پرنم آنکھوں سے شیوانی کی طرف دیکھا۔شیوانی آنسو پونچھ کر پھر اپنی روداد سنانے لگی۔'

'قریباً تین ماہ بعد لکوامار جانے سے اس نے مجھ کو اور انجلی کو رہا کر دیا اور منت سماجت سے یہیں ٹھہرالیا تاکہ وہ اپنی غلطی سدھار سکے۔ہمارا ہر طرح سے خیال رکھ کے۔۔"پہلے گولی اور پھر ڈیڈی ڈیڈی اور پھر دروازہ کھلنے اور مالک مالک کی آوازیں آنے لگیں۔

اندر نے ہڑبڑا کر موبائل نکالا اور کال کاٹ دی اسی اثناء اس کے بوس کی بھی کال آ گئی۔اندر کبھی ان کی طرف دیکھتا تو کبھی موبائل کی طرف" اتنا بڑا دھوکہ۔۔""پوجا تم پیچھے ہٹو میں بات کرتی ہوں" پھر شیوانی اپنی جانب آتے ہوئے ایک مرد کو دیکھ کر رک گئی۔

اندر بھی اس کی سمت دیکھنے لگا۔وہ دور سے ہی ہانپتا ہوا پکارا" تم کال کیوں نہیں اٹھا رہے ہو؟۔ذرا قریب آکر سانسیں بحال کرتے ہوئے" پتا ہے سر کب سے تمہارے نمبر پر کال کر رہیں۔۔۔"

اندر کا تعلق ایسی تنظیم سے تھا جو خفیہ طور پر اپنی پارٹی کے لیے کام سراانجام دیتی تھی مثلاً گائے وغیرہ ذبح کر کے الزام مسلمانوں پر لگا کر قتلِ عام کرانا یا پھر نسلی، لسانی، مذہبی، وطنی، علاقائی اور دیگر مذہبی

ومعاشرتی وجوہات کی بنا پر ملک میں دنگے فساد کرانا تاکہ ان کی پارٹی کے مکروح وخبیث عزائم ومفادات پورے ہو سکیں۔ خود اندر نے ایسے بہت سے کام سر انجام دیے تھے اور وہ ایسے ہی ایک مقصد کے لیے اس دن بھی باقاعدہ دربار میں بھیس بدل کے چھپ کر بیٹھا تھا اس نے شیوانی کی تمام ملک ومذہب کے خلاف اشتعالی وجذباتی گفتگو ریکارڈ کر کے تنظیم کے سربراہان کو بھیج دی تھی لیکن پھر اسے یہ منسٹر کے لڑکے والا کام سونپ دیا گیا اس کا اصل نام بھی یہ نہیں تھا۔

''ہیلو''۔'' اندر''۔''جی سر''۔''تمہاری ساری گفتگو ٹریک کر لی گئی ہے انھیں جلدی سے ختم کر دو ایجنسی کے آدمی کبھی بھی تم تک پہنچ سکتے ہیں ویسے بھی منسٹر مر گیا ہے یا مارا گیا ہے اس کا لڑکا کہتا ہے کہ'' جب اس کے باپ کے بارے میں بات ہونے لگی تو اس نے کال کاٹنی چاہی مگر اس نے فون اٹھا لیا اور وہ اسے کمرے میں بند کر کے باہر چلا گیا کچھ دیر کے بعد گولی چلنے کی آواز آئی اس نے دروازہ کھول کر دیکھا تو سامنے فرش پر اس کا باپ خون میں لت پت پڑا تھا'' بہر حال اب حالات نے اور رخ اختیار کر لیا ہے ہمارے پاس انھیں مارنے کے سوا کوئی اور چارہ نہیں بچا ہے جلدی کرو جتیش بھی تمہارے اشارے کا منتظر ہے'' اس نے جتیش کی طرف دیکھا اور پھر ان کی طرف دیکھا جن کا دل ٹوٹ چکا تھا جن کے مظلوم ومعصوم چہروں کے غم زدہ بھرائے ہوئے نینوں سے اشک چھلک چھلک کر گر رہے تھے اور اس سے ساتھ ہی ساتھ دھوکہ دینے پر گلا بھی کر رہے تھے اور گہرے رنج زدہ بھی تھے۔ اندر نے فوراً پسٹل نکالا اور دھائیں دھائیں گولیاں چلا دیں وہ دھڑام سے زمین پر گر گئے'' یہ تو نے کیا کیا ماں!'' پوجا روتے ہوئے چلائی۔ انجلی بت بنی کھڑی رہ گئی۔ شیوانی'' میں سمجھی تم ہم پر'' اور پھر وہ اور اس کی لڑکیاں اندر کی طرف روتے ہوئے دوڑیں۔

اندر'' جلدی۔۔ یہاں سے۔۔ بھاگ۔۔۔۔۔''

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔•

'مصنف۔۔۔ محسن عتیق

شہر۔۔۔ بھکر

آزمائش اک نعمت"

بیش قیمتی گاڑی کے بیش قیمتی ٹائروں کی خوفناک چرچراہٹ لوگوں کا دھیان اپنی طرف مرکوز کرنے میں کامیاب ہوگ ٸ۔ ہر آنکھ چمکتی گاڑی کو اپنے حصار میں لیے ہوے تھی۔ زد میں آنے والے کی پرواہ بھلا کس کو تھی۔ پھر شاید ترس آیا یا اُس گاڑی کو قریب سے دیکھنے کا شوق؟؟؟ ایک ہجوم تھا جو اُس جگہ آن پہنچا۔

گاڑی کے ٹھیک سامنے سرخ پوشاک پہنے وہ لیٹا تھا۔ بلکے یوں کہیے کہ اُس گاڑی کی زد میں آکر لٹایا گیا تھا۔ عجیب سرخ پوشاک تھی۔۔۔ بڑی سے بڑی ہوتی جارہی تھی۔۔۔ زمیں کو تر کرتی جارہی تھی۔ دور ایمبولینس کے شور نے الگ واویلا مچارکھا تھا۔ کبھی تو ایسے لگتا جیسے ابھی کہیں سے کوئ ڈائریکٹر آنکلے گا اور کہے گا کٹ۔۔۔! لیکن [illegible] نہیں آیا۔۔۔ ہاں ایمبولنس ضرور آئ اور شاید یہی برق رفتاری اُس کی روح کو آدھے آسمان سے واپس کھینچ لاٸ۔

جیسے ایک سٹوڈنٹ امتحان پاس کر کے نائیول یانئ کلاس میں پہنچ جاتا ہے بلکل اسی طرح خدا کی طرف سے آنے والی آزمائشوں اور امتحانات کو پچھاڑتے ہی انسان کی طبیعت میں نکھار آجاتا ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔ اُس کی سوچ کی تنگ نظری میں وسعت آجاتی ہے۔ بلال کو بھی خدا نے کچھ ایسے ہی امتحان میں ڈالا تھا۔ زندگی تو اُسے دے دی گئ لیکن ایک ٹانگ سے وہ محروم کر دیا گیا۔ ملنے والے اُسے آئ زندگی کی مبارک نہیں بلکے لنگڑا ہونے کا افسوس کرتے۔ ہر بار اُن سے ملنے کے بعد وہ ایک اندھے کنویں میں دھکیل دیا جاتا۔ لڑھکتے لڑھکتے وہ ایک ایسی جگہ پہنچ گیا جہاں سانس لینا تک دشوار تھا۔ چاروں طرف نااُمیدی کی ٹھوس دیواریں تھیں جو تنگ سے

تنگ ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں روشنی کا بھوت بھی آس پاس نہ بھٹکتا تھا۔

جب انسان خود کو کسی کا محتاج بنا لے تو اکثر منزل کی طرف اُٹھتے قدم بھی ساکت ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی ایک بیساکھی کا محتاج ہو چکا تھا۔ اُس لکڑی کے ٹکڑے کو وہ اپنی حیات سمجھ بیٹھا تھا۔ اُس کی عمر کے لڑکے جب اُس کے پاس سے بھاگتے ہوئے گزرتے تو وہ بھی اُس لکڑی کے ٹکڑے کو اپنی ٹانگ سمجھ کر دوڑنے کی سعی کرتا۔ اُس کا مزاق اُڑایا جاتا، الٹے سیدھے القابات سے پکارا جاتا اور جواب میں وہ صرف رو دیتا۔

ہر وقت رونا اب اُس کی وہ عادت تھی جس سے اُس کے گھر والے بھی عاجز آ چکے تھے۔ اپنے زندہ بچ جانے پر خدا کا شکر تو در کنار وہ ناشکری کے میدانوں میں سب سے اگلے گھوڑے کی لگام تھامے اُلٹی سمت کو جا رہا تھا۔

کالج۔۔۔ کتابیں۔۔۔! یہ وہ نام تھے جو لبوں کی دیوار پھلانگتے ہی ایک بھیانک مخلوق بن کر اُسے ڈرایا کرتے۔ یہ خوف اُسے اتنا دور لے آیا کہ واپسی کا سوچتے ہی وہ کپکپانے لگتا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُس کے گھر والوں نے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا۔ سب نے اُس سے منہ موڑ لیا۔ لیکن اب بھی کوئی تھا جو اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اُس اندھے کنویں میں بھی اُس کے ساتھ تھا اور اُس قبر میں بھی جہاں سانس سے بھی سانس لیا نہ جاتا۔ وہ اُس کی بند سوچوں میں بھی تھا اور اُس میدان میں بھی جہاں وہ ناشکری کے گھوڑے دوڑایا کرتا۔ اُسے سب یاد ہیں لیکن اُسے بھولنے کی بھول بلال جیسے اکثر کر جاتے ہیں۔ پستی میں جھانکتی بلال کی سوچوں کا رُخ اب اُس نے بلندی کی طرف موڑنا تھا۔ وہ اندھا کنواں اب روشن ہونے والا تھا اور وہ قبر ریزہ ریزہ۔۔۔!

طبیعت میں ناسازی آج پھر اُسے اُس درخت کے پاس لے آئی جہاں وہ ہر راہ گزر کو اپنا محرومیوں بھرا لفافہ پیش کرتا اور اُس کے عوض وہ اسے بتاتے کہ وہ کتنا بدنصیب ہے اور وہ سب کتنے خوش نصیب۔۔۔!

لفافے دینے کا عمل ابھی جاری تھا کہ اچانک ایک کوا کہیں سے اُڑ کر وہاں آن بیٹھا۔

ارے کیا تمہیں بھی لفافہ چاہیے؟؟؟ویسے کافی وزنی ہے۔وہ بولا

دیکھو تمہارے خدا نے میرے ساتھ کیا کر دیا؟؟؟یہ دیکھو مجھ سے میری ٹانگ ہی چھین لی۔وہ تو دینے ولا ہے پھر مجھ سے لینے میں کیا مصلحت ہو سکتی ہے بھلا بتاؤ؟؟؟تمہارے پاس تو سب کچھ ہے آنکھیں ہیں، پر ہیں، ٹانگیں؟؟؟

یہ وہ لفظ تھا جو وہ صحیح طرح بول نہیں پایا۔اُسے ایسا لگا جیسے اب وہ کبھی بول نہیں پائے گا۔محرومی کی چوٹ وہ کوا ابھی کھا چکا تھا۔بلال کے چہرے کا رنگ ایسے اُڑا جیسے وہ بھی پلٹے گا نہیں۔حیرت کی دنیا میں اُسے چند ثانیے ہی گزرے ہوں گے کہ وہ کوا اُس سے مخاطب ہوا۔

اے بنی نو انسان۔۔۔!کیوں تو اس قدر ناشکرا ہے؟؟؟دیکھ ذرا مجھے دیکھ، میری بھی صرف ایک ہی ٹانگ ہے لیکن میں اُس شے کیلئے روتا نہیں بلکتا نہیں جو اُس کی امانت ہے۔میری آنکھوں میں جھانک کر دیکھ کہیں محرومی کے آثار نظر آتے ہیں تجھ کو؟؟؟بیشک تیری نظریں ناکام لوٹیں گی کیونکے میں اسے محرومی نہیں سمجھتا۔تو لوگوں سے خوف کھاتا ہے نہ؟؟؟ذرا میری آنکھوں میں جھانک کر اُس فخر کا جایزہ لے جو میں اپنے لیے محسوس کرتا ہوں۔ذرا دیکھ ان چرند پرند کو۔۔۔انہیں میری معذوری سے کوئی سروکار نہیں۔میرے اس فخر کی دیواریں اتنی اونچی ہیں کہ وہ اُس پار کچھ دیکھ ہی نہیں پاتے۔میں آج آزاد ہوں ان ہواؤں میں بغیر کسی خوف کہ اُڑتا ہوں۔اپنی محرومیوں بھرا لفافہ تو اپنے پاس رکھ۔۔۔!

میں روز فلک سے اس سرسبز درخت کو دیکھا کرتا تھا۔آج اسی کی فریاد پر تیرے پاس آیا ہوں۔جب سے تو آیا ہے اس درخت پے خزاں نے ڈیرا ڈال رکھا ہے۔خود کو بدل نہیں سکتا تو اس درخت سے اس کی حیات تو نہ چھین۔تیری منزل تجھے پکار رہی ہے۔اُٹھ

اور نکل جا اُس طرف۔۔۔یہ نہ ہو کہ تیری یہ مایوسی اور ناشکری اس جنگل میں ویرانے کا سبب بنے۔ چلا جا یہاں سے اور اسے بے آباد نہ کر۔

بلال کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب آ چکا تھا۔ وہ کوا اُسے آئنہ دکھا گیا تھا۔ وہ اُسے زندگی جینے کے اسلوب سکھا گیا تھا۔ وہ اُس اندھے کنویں میں روشنی کا گولا بن کر آیا اور اُس قبر کو اپنے الفاظ کے ٹکوں سے توڑ کر اب واپس جا چکا تھا۔

اب وہ پہلے والا بلال نہ تھا۔ حالات کی گردش اُسے نئے مقام پر لے آئے۔ جو اُسے کوئی اور نہیں سکھا پایا وہ یہ وقت سکھا گیا۔ اچانک اُس کے پاس سے کچھ لڑکوں کا ٹولا گزرا۔ وہ پھر سے اُس پر ہنسنے لگے۔ لیکن آج پہلی بار اُسے اُن پر ترس آیا۔ اُن کی ہنسی سے محظوظ ہوتا وہ کچھ یوں ہنسا کہ پھر فنا ہو گیا۔۔۔ اس دنیا سے نہیں بلکے ہر اُس سوچ سے جو اُسے پستیوں میں دھکیلتی تھی۔

اہل دانش لکھتے ہیں کہ اُس دن ایک ایسے بلال کا جنم ہوا جس کی سرحدوں کا تعین کرنا لگ بھگ ناممکن تھا۔

مصنف۔۔۔ محسن عتیق

شہر۔۔۔ بھکر

افسانہ باپ کی شفقت

از قلم صوفیہ کنول

رات کا سما تھا لائٹ اوف تھی چاند اپنی تمام تر کرنوں
سے گلیوں کو پوری طرح روشن کئے ہوئے تھا گاؤں کی
تمام تر عورتیں اور لڑکیاں گاؤں سے ذرا باہر لمبی
چوڑی گلیوں کو پارک بنائے ہوئے موسم گرما کی اس
خوبصورت شام کو لطف اندوز کر رہی تھی جن میں مے
اور میری مما بھی شامل تھی۔ میرے دل کا موسم جبکہ
بہت افسردہ اور غمگین تھا باوجود اس کے مجھے یہ شام
بہت خوبصورت لگ رہی تھی جسکی وجہ یہ بھی تھی کہ
میری اب تک کی تمام زندگی شہر میں گزری تھی
میرے لئے یہ سب کچھ نیا تھا اتنے میں میری نظر
سامنے لگی چاول کی فصل پر پڑی جسکی بالئیں ہلکی ہلکی
ہوا سے آپس میں ٹکرا رہی تھی اور 3 / 4 دن میں
کاٹنے لائق تھی مینے سُنا تھا کہ چاول کی کچی پکی فصل
بہت میٹی اور مزے کی ہوتی ہے۔ مینے مما سے کہا مما
مجھے کچھ بالئیں لا کر دے مینے کھانی ہے سنا ہے بہت
میٹی ہوتی ہیں۔ مما یہ کہہ کر منع کر دیا نہیں سونیا بیٹا
ایسے چوڑی ہو جاتی ہیں اور کسی سے چند بالئیں مانگو مجھے
شرم آتی ہے تم رہنے دوں۔ کچھ دیر میں ہم گھر آ گئے
جو تھوڑے ہی فاصلے پر واقع تھا۔ اگلی صبح میں گھر کی
ڈسٹینگ کر رہی تھی کہ اچانک مما نے دروازے پر
پکارا سونیا، سونیا بھاگ کر آؤ جلدی آؤ بیٹا تمہیں کچھ
دکھاؤں۔ مے بھاگ کر دروازے تک گئی تو تھوڑی
دور سامنے کی طرف غور سے دیکھا تو میری آنکھوں
میں بے اختیار آنسو آ گئے جو لڑیں کی طرح یکے بعد
دیگرے میری رخساروں پر گرنے لگے یہ آنسو خوشی
کے بھی تھے اور میری ندامت کے بھی میری
آنکھوں کے سامنے میرے ضعیف العمر والِد محترم
تھے جن کی چند ہی دن پہلے گرنے سے ایک ٹانگ ڈیمج
ہوئی تھی اور وہ ابھی لاٹھی کے سہارے سے آہستہ
آہستہ چلتے تھے۔ وہ اپنی بیماری کی حالت میں اپنی
تکلیف کو نظر انداز کر کے لچکتی ٹانگ سے ٹیڑھی

میڈی زمین پر میرے لئے چاول کی فصل کی کچی بالئیں زمین پر سے اکٹھی کر رہے تھے۔ وہ انسان جس نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھلایا تھا ہمیشہ محنت کی کمائی سے ہمیں پالا آج اس لاچاری میں میرے لئے زمین سے بالئیں اکٹھی کر رہے تھے مما نے انہیں صبح ہی بتایا کہ رات میں کچی بالئیں مانگ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں پاپا بہت سی بالئیں لئے گھر آ گئے اور اپنے ہاتھوں سے مسل کر چاول نکال کر مجھے کھانے کو دیئے اور بولے باپ چاہے کتنا بھی لاچار کیو نہ ہو جائے اپنی اولاد کی خواہشیں پوری کرنے کے لئے گلیوں میں صدا کرنے سے بھی نہیں شرماتا۔ میں اپنے کمرے میں چلی گئی اور اس قدر روئی۔ میری آنکھوں کے آنسوؤں تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ مجھے بہت شرمندگی ہو رہی تھی خود پر میں کس کے لئے کس کی محبت ٹھکرا کر گھر سے بھاگنے والی تھی۔ ایک طرف نوید کی محبت؛ جو کہا کرتا تھا تم زندگی ہو میری جس دن تم نے چھوڑ دیا یہ ختم ہو جائے گی۔ میرے ایک بار اس کے ساتھ بھاگنے سے انکار کرنے پر اسکی ساری محبت نفرت میں بدل گئی اور اسنے دوبارہ میرے اس کے ساتھ بھاگنے پر اقرار کے باوجود مجھے اپنی لائف میں کوئی جگہ نہ دی بلکہ برعکس اس کے مجھ سے بہت بدتمیزی سے بات کی کہ دفا ہو جاؤ اب میری لائف سے جب مینے کہا تب کیو منع کیا تھا اب میری زندگی میں تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں۔ دوسری طرف والدین کی محبت جو ہمارے اتنی غلطیاں کرنے کے باوجود بڑتی ہی رہتی ہے کبھی کم نہیں ہوتی میں روتے ہوئے خدا کا شکر ادا کر رہی تھی جس نے نوید کا رویہ بدل کر مجھے بہت بڑا گناہ کرنے سے بچا لیا۔ اُس دن کے بعد میں کبھی نہیں روئی اور پانچ وقت کی نماز کی پابند رہتی ہوں۔ اپنی بہنوں کو پیغام دینا چاہوں گی آج کل کوئی کس سے سچا پیار نہیں کرتا۔ آج کل کے لڑکوں کی میٹھی اور چکنی چوپڑی باتوں میں آکر اپنی بچپن سے ماں باپ کی انمول محبت کو کبھی مت کھونہ۔

از قلم صوفیہ کنول

تو کیوں پڑھتے ہیں آپ نماز ؟

نہ پڑھا کریں میری طرح,

بس حاضری لگانے کیلیے پڑھتا ہوں

چاہتا ہوں کہ حاضری لگتی رہے

محبوب کو پتہ تو چلے کہ آیا ہے

چاہے سبق یاد نہیں

کلاس میں تو حاضر ہے

حاضری لگتی رہی تو یقین ہے کہ

امتحان میں بھی بِٹھالیا جاؤں

گا

۳۳ نمبر تو آ ہی جایئں گے

۳۳ نمبر کا مطلب ہے پاس ہو گیا

پاس کیا ہوا گویا اُس نے پاس بُلا لیا

خدا اور محبت از قلم ہاشم ندیم

انتخاب: آبرِوُ نبیلہ اقبال

☆☆☆☆

حقیر زدہ ھوں لیکن میری کم ظرفی کی داستانیں آسمان سے بھی بلند ہیں میری حقیقت سے اور میرے دل میں چھپے ہر چور سے بس تو ہی واقف ہے میرے گناھوں کی فہرست کتنی بھی طویل سہی تیری بے کراں رحمت سے کم ہے سو میری منافقت بھری توبہ و معافی کو یہ جانتے ہوئے بھی قبول فرما کہ توبہ کرتے وقت بھی میرے دل کا چور مجھے تیری نافرمانی پر مستقل اکساتا رہتا ہے پھر بھی تجھے تیرے پیارے

حبیب صلی اللہ علیہ والیہ وسلم کا واسطہ میری لاج رکھنا
میرے عیبوں پر اور میری جہالت پر پردہ ڈالے رکھنا
میرے مولا تیرا ہی آسرا ہے تو ہی عیبوں کا پردہ دار
ہے میری جھولی میں سو چھید ہیں پھر بھی یہ جھولی
تیرے سامنے پھیلی ہوئی ہے اسے بھر دے میرے
مالک آمین

اقتباس عبدل اللہ

از قلم ہاشم ندیم

انتخاب

ثناء شہزاد

☆☆☆☆

ہاشم ندیم کے ناول پری زاد سے اقتباس..

دنیا کتنی ترقی کر گئی ہے چاند ستاروں پر کمند ڈالنے کی ضرورت نہیں رہی کیوں کہ وہاں انسان کے قدم پہنچ چُکے ہیں_ صدیوں کے فاصلے لمحوں میں طے ہونے لگے ہیں ہر کسی کو ہر لمحہ ہر رابطہ میسر ہے مشین ہماری زندگی پر حاوی ہو چکی ہے محبت کی روایتی داستانوں کو لوگ گزرے زمانوں کا قصہ کہتے ہیں ہیر رانجھا، سسی پنوں، سوہنی ماہیوال، شیریں فرہاد الف لیلٰی کی کہانیاں لگتی ہیں محبت ڈیجیٹل ہونے لگی ہے انسان عروج کی کتنی منزلیں طے کر چُکا ہے، مگر پہلی نظر !!!!! آج بھی اپنے اندر وہی زمانے بھر کے عجائبات چُھپائے بیٹھی ہے کوئی سائنس دان آج تک اس پہلی نظر کے ڈنک کا علاج نہیں ڈھونڈ پایا کوئی تریاق دریافت نہیں ہوا نظر کے اس زہر کا آج تک، ہر خرابی کی جڑ یہی ایک پہلی نظر ہو تو ہے نئے زمانے کے نئے لوگ لاکھ انکار

کریں لاکھ مذاق اڑائیں مگر سچ یہی ہے کہ محبت اور نظر کا چولی دامن کا ساتھ ہے پھر چاہے یہ نظر کبھی بھی اور کسی بھی طور ہماری زندگیوں میں وارد ہو جائے۔۔۔۔۔۔۔

ریحانہ اعجاز

ڈیفینس کراچی

☆☆☆☆

محبت چاہے کیسی بھی ہو سجدہ کرنا سیکھا ہی دیتی ہے.

اقتباس: ہاشم ندیم کے ناول "عبد اللہ"

سدرہ ہاشم بہاولپور

ہم زندگی بھر اس بے وفا زندگی کے لئے کتنی بھاگ دوڑ کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، دھوکے دیتے ہیں، ایزا دیتے ہیں لیکن ہمارا آخری حاصل یہی موت ہوتی ہے۔

میرا جی چاہا کہ اپنی طرح کے ان سب انسانوں کو جو اس زندگی کی دوڑ میں خود اپنے آپ کو، اپنے رشتوں کو اور جیو اور جینے دو کو اُصولوں کو بھول چکے ہیں، آن سب سے بس ایک ہی سوال پوچھوں "

کیا یہ بے وفا زندگی واقعی اس قابل ہے، جس سے تم نے پیار کیا؟

ہاشم ندیم کے ناول عبد اللہ سے اقتباس۔۔

سندھیا شاہ

☆☆☆☆☆

کاش دنیا کے سارے بیرونی آئینے بھی ٹوٹ جاتے اور ہم میں سے ہر ایک کا من کا آئینہ باہر کمرے میں لگ جاتا تو یہ دنیا کتنی خوبصورت ہو جاتی.....

کون جانے ہمارے بیچ کتنے دل جلے ہوگے بھی ہوں جو آئینہ توڑنے کی نہ جانے آنکھیں پھوڑنے کی آس دل میں رکھتے ہوگے. اگر انسان کی خوبصورتی کو ماپنے کا پیمانہ صرف یہ بے وفا نگاہیں ہی ہیں تو کاش ہم بے بصارت ہی ہوتے.

ہاشم ندیم کی ناول "عبد اللہ" سے اقتباس

انتخاب: خدیجہ کشمیر ضلع سرینگر مقبوضہ کشمیر

☆☆☆☆☆

سارا کھیل انہی چوبیس گھنٹوں کو ٹالنے کا ہے چاہے بہترین سے بہترین ملنے کی بے چینی میں کاٹ لیں یا پھر جو کچھ میسر ہے اسی پہ صبر و شکر کر کے بتا دیں۔

دن بھر شکوے کرتے رہیں یا پھر سجدہ شکر میں بسر کریں۔

یہ چوبیس گھنٹے بہر حال گزر ہی جاتے ہیں۔

خدا اور محبت از ہاشم ندیم

زہرہ جبین لطیف۔ ضلع جہلم

☆☆☆☆

سلطان بابا تو دعا مانگنے کے بعد اس طرح بے فکر ہو گئے تھے جسے خدا ان کی ہر دعا سن ہی تو لے گا۔ اچانک میرے ذہن مین ایک کوندا سا لپکا۔ کہیں یہ اٹل یقین ہی کسی دعا کی قبولیت کا اصل کلیہ تو نہیں؟

کہین ہماری دعائیں اس لیے تو رد نہی ہو جاتی کے ہم اندر سے بے یقین اور بد دل ہوتے ہیں؟

ہم جس سے مانگ رہے ہوتے ہیں خود اس کی سخاوت
اور خزانے پر ہمارا اعتماد متزلزل ہوتا ہے۔ پھر دعا
قبول نہ ہونے کا شکوہ کیسا؟

از: عبداللہ --- ہاشم ندیم

انتخاب: ثوبیہ اجمل ساہیوال

☆☆☆☆☆

ہاشم ندیم کے ناول عبداللہ کے یونٹ تربیت سے

"وحی شرعی کا سلسلہ آخری پیغمبر (ص) کے ساتھ ہی
موقوف ہو گیا ہے. باقی رہ گئے دو ذرائع. ان
میں سے پہلا ہے کشف جس کا تعلق حسیات
سے ہے جس میں کسی شخص کو با قاعدہ علم
غیب، یا مستقبل میں پیش آنے والے واقعات
کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ اس واقعے
کو اپنی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہوا دیکھ سکتا
ہے. ایسے انسان کو کاشف کہتے ہیں اور اس کا یہ کمال
کشف کہلاتا ہے. جب کہ تیسرے زریعے کو "الہام"
کہا جاتا ہے. الہام کا تعلق وجدانیات سے ہوتا
ہے. وجدان یعنی انسان کو باقاعدہ کچھ نظر تو نہ آئے،
پر خدا کی طرف سے اس کے دل میں ایک خیال ڈال
دیا جاتا ہے کہ فلاں واقعہ کچھ یوں ہوا ہو گا، یا فلاں
شخص کس

حال میں ہو گا، یا فلاں دو راستوں میں سے ایک راستہ
اسے اس کی کامیابی کے راستے پر لے کر جائے گا. لیکن
یہ سب اللہ کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اپنے کن
خاص بندوں کو الہام، یا کشف کے مرتبے کے لیے
چنتا ہے".

انتخاب. حاجرہ عمران خان

ناول: خدا اور محبت سے اقتباس

از قلم:ھاشم ندیم

☆☆☆☆☆☆☆☆

آج مجھے ایک لمحے میں ہی خدائی کا مطلب سمجھ میں آگیا تھا۔۔۔۔۔۔۔جب ایک انسان کا پیار آپ کو اس احساس سے دوچار کر سکتا ہے تو ازل سے لے کر ابد تک آنے والوں انسانوں کی بندگی کا احساس کیا ہوتا ہو گا۔ آج میں نے جانا تھا کہ خدا کو بندگی اس قدر پسند کیوں ہے۔

انتخاب: سائرہ حسین

☆☆☆☆

یاخدا! تو جانتا ہے کہ میں تیری کائنات کا سب سے حقیر ذرہ ہوں، لیکن میری کم ظرفی کی داستانیں آسمان سے بھی بلند ہیں۔ میری حقیقت سے اور میرے دل میں چھپے ہر چور سے بس تو ہی واقف ہے۔ میرے گناہوں کی فہرست کتنی بھی طویل سہی، تیری بے کراں رحمت سے کم ہے۔ سو، میری منافقت بھری توبہ و معافی کو یہ جانتے ہوئے بھی قبول فرما کہ توبہ کرتے وقت بھی میرے دل کا چور مجھے تیری نافرمانی پر مستقل اکساتا رہتا ہے۔ پھر بھی تجھے تیرے پیارے صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ، میری لاج رکھنا۔ میرے عیبوں پر اور میری جہالت پر پردہ ڈالے رکھنا۔ میرے مولا! تیرا ہی آسرا ہے، تو ہی عیبوں کا پردہ دار ہے۔ میری جھولی میں سو چھید ہیں، پھر بھی یہ جھولی تیرے سامنے پھیلی ہوئی ہے۔ اسے بھر دے میرے مالک

(ہاشم ندیم کے ناول "عبداللہ" سے اقتباس)

غلام یسن.

ہم زندگی بھر اس بے وفا زندگی کے لئے کتنی بھاگ دوڑ کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں، دھوکے دیتے ہیں، ایزا دیتے ہیں لیکن ہمارا آخری حاصل یہی موت ہوتی ہے۔ میرا جی چاہا کہ اپنی طرح کے ان سب انسانوں کو

جو اس زندگی کی دوڑ میں خود اپنے آپ کو، اپنے رشتوں کو اور جیو اور جینے دو کو اُصولوں کو بھول چکے ہیں، آن سب سے بس ایک ہی سوال پوچھوں "کیا یہ بے وفا زندگی واقعی اس قابل ہے، جس سے تم نے پیار کیا؟

عبد اللہ سے اقتباس۔۔۔۔۔۔

انتخاب: عروسہ حیا

شہر: ڈسکہ سیالکوٹ

☆☆☆☆

جھگڑا خدا کا تو تھا ہی نہیں کہ خدا تو ازل سے ہم سب کا ایک ہی ہے۔ فرق تو پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا ہے۔ اسلام تو ہمیشہ اور ہمیشہ کے لیے نازل ہوا تھا۔ حضرت آدم علیہ اسلام سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر مذہب اسلام ہی کی ایک شکل تھی۔ ہاں مگر آخری نبی الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا طرہ امتیاز مسلمانوں کے حصے میں آیا اور یہی یہود کی ہم سے منافرت کی بنیادی وجہ بھی تھی۔ صدیوں تک یہ تاج یہود کے پاس رہا اور اللہ انہیں اُن کی بے تحاشا نافرمانیوں کے باوجود نبیوں کی فرمائش پر معاف کرتا رہا، لیکن پھر یہ امتیاز ان سے آخر کار چھین گیا۔ چودہ صدیاں گزرنے کے باوجود آج بھی یہود کہیں نہ کہیں مسلمانوں کو ہی اس ذلت کا سبب سمجھتے ہیں۔ اس عرصے میں انہوں نے دھوکے سے اپنے لیے ایک زمین کا ٹکڑا تو حاصل کر لیا، لیکن اپنا قبلہ وہ ہمیشہ کے لیے کھو چکے تھے۔ اور ہمارے قبلے کو کبھی انہوں نے دل سے تسلیم نہیں کیا۔

اقتباس: ہاشم ندیم کے ناول "عبد اللہ" کے باب "آخری مسیحا" سے

نور بخاری

مبارک ہو مبارک ہو مبارک ہو

داستان دل اپریل سے کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے

اب آپ داستان دل اپنے گھر، ہوسٹل، آفس، کالج کے ساتھ ساتھ دنیا کے کسی بھی کونے میں حاصل کر سکتے ہیں، تو ابھی اپنا نام ممبر شپ میں فائنل کروائیں

معلومات ممبر شپ:

سالانہ بمعہ ڈاک خرچ	:	1200/-
چھ ماہ بمعہ ڈاک خرچ	:	600/-
تین ماہ	:	300/-

(ممبر شپ 03225494228 اس نمبر پر موبی کیش اکاونٹ میں جمع کروا کہ اپنا ایڈریس اسی نمبر پر واٹس اپ یا مسیج میں سینڈ کریں)

مزید معلومات کے لیے: 03225494228 واٹس اپ / موبائل نمبر

محبت کی اِنتہا چاہتا ہوں

ورکنگ بیگ کندھے پر لٹکائے وہ آج بھی اپنے چہرے پر سنجیدگی کا ماسک پہنے برق رفتاری سے اپنے گھر کی طرف گامزن تھا۔ راستے کی دھول یا بے ہنگم آوازوں کا شور جہاں راہگیروں کے مزاج کو بگاڑنے میں پیش پیش تھا وہیں چوراہے پر موجود رکشوں، گاڑیوں اور بسوں کے ڈرائیور اپنی سواریوں کو پارک کرنے میں ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ چار قدم کے فاصلے پر ہی اس نے ایک بوڑھی ماں کو کھڑی پایا۔ اس کے سامنے تین رکشے والے الجھ رہے تھے۔ غالباً اس بوڑھی ماں نے سواری کے لئے ایک رکشہ روکا تھا اور تینوں آٹھہرے اب لالچ میں آکر ایک دوسرے سے الجھ پڑے۔ بوڑھی ماں ان کو خاموش کروانے میں ناکام محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اپنا بیگ پشت کے پیچھے دھکیلتے ہوئے آگے بڑھا

”رزق کے لئے لڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا۔ جو رزق قسمت میں لکھ دیا گیا ہے اسے کوئی چھین تو نہیں سکتا لیکن آپس کا جھگڑا اس رزق سے برکت کو ضرور کم کر سکتا ہے۔“ اس نے دوٹوک لہجے میں ان رکشے والوں کو سنائی تو انہوں نے تیکھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا

" اوئے پی ایم۔۔۔ پرائم منسٹر ہو گا تو اپنے گھر کا۔۔۔ یہ چوراہا ہے۔۔ یہاں تیری حکومت نہیں چلنے والی۔۔" ایک ڈرائیور جو غالباً نیا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے دوسرے کا گریبان چھوڑ کر ایک جھرجھری لی اور اس کو مخاطب کیا۔ بس یہ سننا تھا کہ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر ایک گہری نگاہ ان تینوں پر ڈالی۔ پہلا رکشا ڈرائیور پہلی نظر میں ہی اس نو دو گیارہ ہو گیا۔ دوسرے پر نگاہ ڈالی تو وہ بھی بدکتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ اب تیسرے کی باری تھی۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

" ایسے کیا گھور رہا ہے؟" چہرے پر شکن نمودار ہوئے مگر وہ یک ٹک اسے گھورتا رہا۔ پیچھے سے ایک ڈرائیور نے آکر اس کے کان میں سرگوشی کی۔

" خیریت چاہتا ہے تو پیچھے ہٹ جا۔۔ اگر اس لڑکے کو غصہ آگیا ناں پھر کبھی تو اس چوراہے پر رکشہ کھڑا کرنے کی ہمت نہیں کرے گا۔۔" یہ آواز اتنی مدہم نہ تھی کہ وہ اسے سن نہ سکتا۔ مگر لاعلمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کو لگاتار گھورتا رہا۔ رکشہ ڈرائیور نے تھوک نگلا اور بڑبڑاتا ہوا چل دیا۔ اس کے جانے کے بعد اس نے اپنے گرد و نواح میں نظر دوڑائی تو لوگوں کا ایک ہجوم جمع تھا

" یہاں کوئی تماشا نہیں لگا اور نہ ہی کوئی جلوس ہے۔۔ جا کر اپنا کام کرو۔۔" اس کے لہجے کی سختی کوئی برداشت نہ کر سکا۔ ایک ثانیہ بھی نہ لگا سب کو منتشر ہونے میں۔ ایک پل کے لئے خاموشی چھا گئی۔ اس نے بوڑھی ماں کی طرف دیکھا اور ایک رکشہ ڈرائیور اپنے پاس بلایا جو کچھ فاصلے پر سگریٹ سلگا رہا تھا۔ اس کے ایک اشارے پر دوڑتا ہوا آیا۔

" بلایا پی ایم۔۔۔" اس کی سانسیں جیسے تلوار کی نوک پر اٹکی ہوئی تھیں۔

" بوڑھی ماں کو جہاں جانا ہے۔۔ چھوڑ کر آؤ۔۔" یہ کہا اور دوبارہ اپنے گھر کی طرف چل دیا۔ رکشہ ڈریئور نے اثبات میں سر ہلایا اور بوڑھی ماں کا سامان اٹھا کر اپنے رکشے کی طرف بڑھا

" شکریہ بیٹا!" اس بوڑھی ماں نے اس کی بلائیں لینا چاہیں مگر وہ پہلے ہی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔
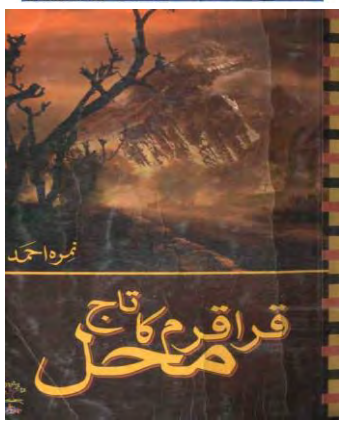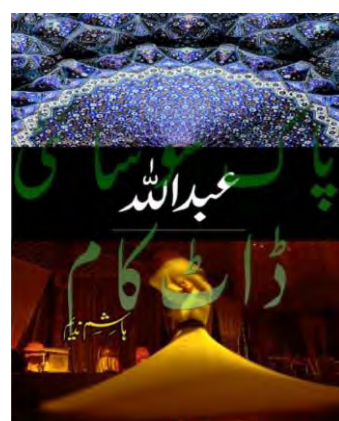
تو یہ تھا ہمارا ہیرو۔۔ جو اپنے محلے میں پی ایم کے نام سے مشہور ہے۔ اصل نام کیا ہے؟ شاید وہ خود بھی بھول جاتا اگر

آئی ڈی کارڈ کی سہولت نہ ہوتی اور یا پھر اس کی جاب کسی اور نوعیت کی ہوتی۔ لیکن اصل پہنچان آفس سے گھر آتے آتے کہیں کھو جاتی یا پھر شاید راستے میں ہی رہ جاتی اور گھر پہنچتے پہنچتے وہ صرف پی ایم رہ جاتا۔ لوگ اسے پی ایم کیوں کہتے ہیں؟ آخر اس کی زندگی کیسی ہے؟ کیا واقعی وہ ہمارے ملک کے سیاستدانوں کی طرح گرم مزاج اور تند لہجہ رکھتا ہے یا پھر اصل بات کچھ اور ہے؟ لوگ اس سے کیوں ڈرتے ہیں؟ کیا وہ ایک امیر گھرانے تعلق رکھتا ہے یا پھر کسی بدمعاشوں کے گینگ سے اس کا تعلق ہے؟ یہ ڈر ہے یا عزت۔۔ کئی سوال ہیں جن کا جواب اس محلے میں پہلی بار قدم رکھنے والے سوچتے ہیں۔۔ اور یہی جواب شاید وہ خود بھی تراشنے کی کوشش کرتا ہے؟ آخر وہ کیوں ہے پی ایم؟
ان سب سوالوں کا جواب جاننے کے لئے ایک بار اس کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو پھر شروع کرتے ہیں نئی کہانی، نئی زندگی کے ساتھ۔

* * *

وہ اب اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دائیں شانے پر بیگ لٹکائے، سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے، آس پاس کے ماحول پر نہ چاہتے ہوئے نظر رکھے بس وہ اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ دکانیں جو اس کے گھر تک ایک سیریز میں تھیں مجال ہیں ان کے مالکوں نے اپنی دکانوں سے ایک انچ بھی آگے کچھ سامان رکھا ہوا ہو۔ پوری سڑک جو حکومت نے راہگیروں اور ٹریفک کے لئے مخصوص کی تھی۔ وہ انہی کے لئے مخصوس تھی۔ دکانداروں کا ان پر کوئی حق نہیں تھا۔ ایک دوبار دکانداروں نے اپنی دکان کی چیزوں کو فٹ پر رکھنے کی کوشش کی پھر جو ان کا حال ہوا، اس کی خبر پورے محلے کو تھا۔ اب بڑا کیا، بچہ کیا۔ سب پی ایم کو جانتے تھے۔ وہ کوئی ایم پی اے یا ایم این اے نہیں تھا اور نہ ہی کوئی رشتے دار اس کا حکومتی عہدے دار تھا۔ یہ تو بس ایک خطاب تھا جو اس کے گھر سے جاری ہوا اور پورے محلے میں مشہور ہو گیا۔ وہ تیز قدموں سے آگے ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ گھر سے فاصلہ اب بہت کم رہ گیا تھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ کوئی اس پر نظر رکھے ہوئے ہے۔ اس کے گھر کا دروازہ ماشاء اللہ کیا کہنے۔۔ مجال ہے ایک لفظ بھی کچھ لکھا ہوا نظر آجائے۔
دروازے کے ساتھ ایک بورڈ تھا۔ جس پر لکھنے کی اجازت تھے مگر دروازے کی خوبصورتی کو چھونے کی بھی اجازت
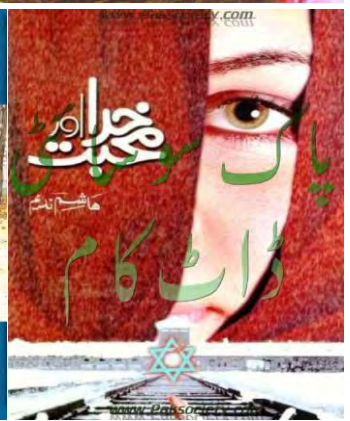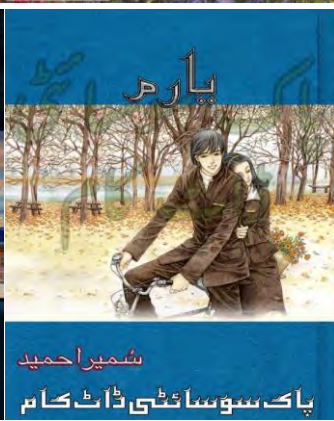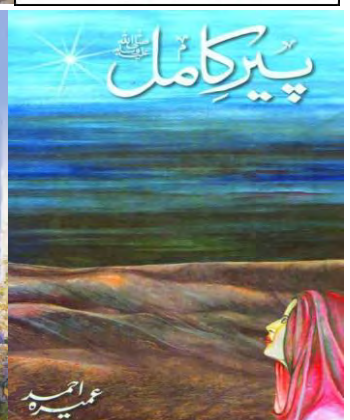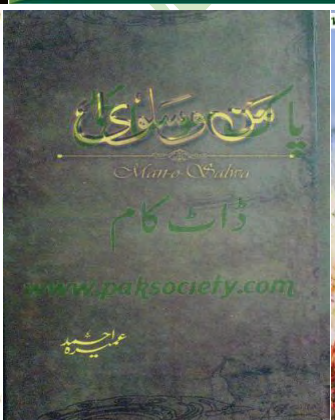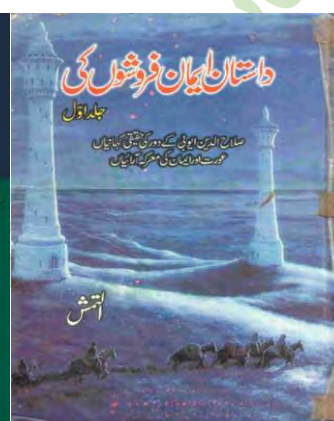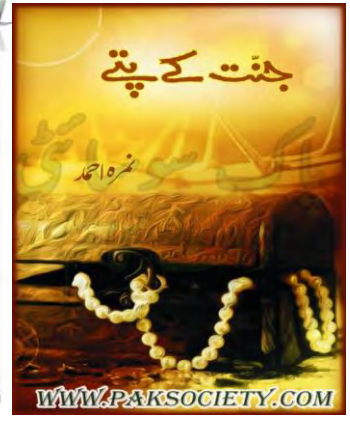
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-

اس وقت سے کسی کو نہ ہوئی جب سے اس نے ایک پورے محلے کے سامنے کمرشل بوائے کو ذلیل کیا تھا۔ وہ بے چارہ بس اپنی کمپنی کا نشان دروازے پر ثبت کرنا چاہتا تھا لیکن جو لفظوں سے دھلائی ہوئی بے چارے کی، اس دن کے بعد وہ کبھی اس محلے میں نظر نہ آیا اور دوسروں کو نصیحت مل گئی۔ اسی شام اس نے دروازے کے دائیں جانب ایک بورڈ لگا دیا اور ساتھ ہی ایک چاک رکھ دیا۔ اب اگر کسی اور کا گھر ہوتا تو شائد ایک گھنٹے بعد یہ بورڈ نظر نہ آتا لیکن یہ گھر تو اس محلے کے پی ایم کا تھا۔ بورڈ تو در کنار کسی کو چاک چھونے کا بھی حوصلہ نہ ہوا۔ آتے جاتے کوئی بھی اس چاک کو دیکھتا اور وہاں سے گزر جاتا۔ چور بھی گھر دیکھ کر چوری کرتے ہیں، شائد یہ کہاوت عین درست تھی۔

" پی ایم آ گیا۔۔" یہ سب کو آگاہ کرنے کے لئے نعرہ لگایا گیا۔ نعرہ لگانے والا اور کون ہو سکتا تھا؟ سوائے منتہا کے۔۔ جس کا گھر ساتھ ہی تھا۔ وہ اکثر گھر کے کام کاج کرنے کے بعد اس کے گھر کا رخ کرتی اور یہیں بسیرہ کر لیتی۔ کہنے کو تو وہ محض پڑوسن تھی مگر اس گھر کے باسیوں کے ساتھ اس کا کچھ گہرا ہی تعلق تھا۔ باہر سے آنے والا اس کو بھی اسی گھر کا حصہ سمجھتا تھا۔ یہ نعرہ سنتے ہی سب گھر والوں کی جیسے جان اٹک گئی۔ سب کو آگاہ کرتے ہی اس نے دروازے کو لاک کیا اور صحن میں بکھری چیزوں کو سب کے ساتھ مل کو سمیٹنا شروع کیا۔

"جلدی کرو۔۔۔ ارے دلاور جلدی ہاتھ چلاؤ ناں۔۔" یہ دانیہ کی آواز تھی جو اس کی بیوی تھی۔

" چلا تو رہا ہوں ہاتھ۔۔۔ اب کیا کروں پاؤں سے بھی کپڑے سمیٹوں؟" اس نے چڑ کر کہا تھا

" دلاور بھائی یہ باجی کو کوسنے کا نہیں بلکہ کپڑوں کو چھپانے کا وقت ہے۔۔۔ پی ایم بس ایک منٹ میں دروازے پر دستک دینا شروع ہو جائے گا۔۔" منتہا نے اب ہاتھ میں تھامے کپڑوں کو عریشہ پر دے مارا اور خود رسٹ واچ پر نظریں جمائے الٹی گنتی شروع کر دی۔

" منتہا کی بچی۔۔۔" وہ جھلائی مگر کوسنے سے زیادہ اس نے سمیٹنے میں وقت کو صرف کرنا زیادہ مناسب سمجھا۔

"امی۔۔ آپ بھی مدد کریں۔۔" دانیہ نے کہا تو نور جہاں بھی سب کے ساتھ کپڑوں کو سمیٹنے لگی۔

"تم یہ سب اچھا نہیں کر رہے۔۔۔" اتنے میں کمرے سے فضل صاحب وہیل چیئر پر بیٹھے باہر آئے۔ ایک یہی تو تھے

جو پورے گھر میں پی ایم کو سمجھتے تھے مگر ان کو کون سمجھے؟ سوائے پی ایم کے

"آپ تو بس خاموش رہیں۔۔۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔۔" نور جہاں نے انہیں خاموش کروا دیا۔ ایک بار پھر وہ بس بڑبڑا کر رہ گئے۔ شکست خوردہ انسان کی طرح انہوں نے گردن جھٹکی اور دوبارہ اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔ وہ اب ہونے والے ہنگامے کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس بیٹے کو یوں جلتے کڑھتے دیکھنا اب ان کے لئے ناقابل برداشت ہو چکا تھا۔

"بس تیس سیکنڈ رہتے ہیں۔۔" منتہا نے کہا تو سب کے ہاتھ پاؤں میں برق کی سی تیزی آگئی مگر کہتے ہیں ناں جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ ان سب کے ساتھ بھی یہی ہو رہا تھا۔ وہ جتنا سمیٹنے کی کوشش کرتے۔ سوٹ اتنے ہی بکھر جاتے۔ کبھی ایک چارپائی پر تو کبھی دوسری چارپائی پر رکھتے۔

" تم سب کی یہ حالت دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے پی ایم آرہا ہے۔۔" یہ تسلیم کی آواز تھی جو کہ نور جہاں کی نند اور رانا فضل صاحب کی چھوٹی بہن تھی۔ تسلیم یہاں آئی تو چند دن رہنے کی نیت سے تھی مگر پھر یہیں پر بسیرا کر لیا۔ اوپر کے پورشن میں اپنی دو بیٹیوں حور اور نور کے ساتھ رہتی تھیں۔ ایک تیسری بیٹی بھی تھی مگر وہ فی الحال ملک سے باہر تھی۔ اس لئے وہ ان سب چکروں سے فی الحال تو آزاد تھی مگر مستقبل کی کس کو خبر؟ خیر بات ہو رہی تھی کہ تسلیم کی جو کہ پی ایم کی پھپھو ہیں۔ شادی کے پانچ سال بعد شوہر کی ایک حادثے میں موت ہو گئی۔ سسرال کو خیر آباد کہا اور اپنی تینوں بیٹیوں کو لے کر اپنے میکے چلی آئی۔ فضل صاحب نے بھی چھوٹی بہن سمجھتے ہوئے اسے اوپر والے پورشن میں رہنے کی اجازت دے دی مگر آنے والے حالات کی کس کو خبر تھی؟ کہتے ہیں ناں نزدیک رہنے سے اکثر رشتوں میں کھوٹ آجاتی ہے۔ یہی کچھ ان کے ساتھ بھی ہوا تسلیم نے اس گھر پر اپنا حق جمانا شروع کر دیا مگر جہاں نند تیز ہو پھر بھلا بھابی کہاں پیچھے رہ سکتی ہے؟ نور جہاں بھی اس کو ایک کی دو سناتی۔ نند بھابی کے جھگڑے میں جو منصف بنتا وہ ہمارا پی ایم ہوتا۔ اس کی ایک آواز پر سب کو جیسے سانپ سونگھ جاتا۔ تسلیم اپنے کمرے میں گھس جاتی اور نور جہاں اپنے کمرے میں۔ باقی بھی کچھ ایسا ہی کرتے۔ دانیہ تو اس نند بھابی کے جھگڑے میں کودنا پسند ہی نہ کرتی کیونکہ وہ خود

بھی تو آخر اس گھر کی بیٹی ہی تھی۔ اسے اچھی طرح تھا اگر اس نے نور جہاں کی حمایت کی تو پی ایم اسے اپنے شوہر سمیت گھر سے جانے کو کہہ دے گا۔ اس لئے وہ اکثر خاموش رہتی مگر پی ایم کی غیر موجودگی میں تسلیم پھپھو کو ایک ایک بات کا جواب دیتی۔ عریشہ تو خیر تھی ہی چھوٹی۔۔ اس سے کیا گلہ مگر جیسا رنگ ویسا ڈھنگ۔۔ اپنی بڑی بہن دانیہ سے بس یہی کچھ اس نے سیکھا تھا۔ ویسے تو کالج پڑھنے جاتی تھی مگر سوائے عشق و معشوقی کے کچھ نہ سیکھتی۔ پی ایم فی الحال اس بات سے لاعلم تھا۔ پی ایم ہی نہیں باقی کے گھر والے بھی لاعلم تھے۔ اب بات ہو جائے پی ایم کے بڑے بھائی عرفان کی۔ کام کے نہ کاج کے دشمن اناج کے۔ ویسے تو ہمارے پی ایم سے عمر میں پورے پندرہ سال بڑے ہیں مگر عقل سے پندرہ سال چھوٹے۔ ایسا نہیں کہ ذہنی توازن ٹھیک نہیں۔ ذہنی توازن تو اتنا تیز ہے کہ پیسوں کا نام سن کر خواب خرگوش کی نیند سوتے ہوئے بیدار ہو جائیں مگر کام کا نام سن کر ایسے بیماریاں ان کا رخ کرتیں جیسے پتا نہیں کتنے عرصے سے بیمار ہوں۔ بس آوارہ گردی کرنا ان کا شیوہ ہے۔ آج کل موصوف پیٹ کے درد کا بہانہ لئے پی ایم کا سامنا کرتے ہیں۔ اب ان کی بیوی سمیرا سے بھی مل لیجیے۔ جب شوہرِ نامدار کاہل ہوں تو بیوی بھلا کیسے کمیری مل سکتی تھی؟ ان سے بھی زیادہ ہڈ حرام اور کام چور سے پالا پڑا۔ مگر عرفان صاحب کا بھلا کیا جاتا ہے؟ انہیں تو بس عیش و عشرت کا سامان چاہیے تھا۔

اب بڑوں کے بعد باری آتی ہے بچوں کی انس اور روشنی کی۔ روشنی پانچ سال کی ہے اور دانیہ اور دلاور کی بیٹی ہے جبکہ انس عرفان اور سمیرا کا بیٹا ہے۔ عمر ماشاء اللہ سے دس برس ہے اور پڑھائی میں بھی اچھا ہے۔ بس یہ دو بچے اور فضل صاحب ہیں جو پی ایم کے بعد اس گھر میں باشعور دیکھائی دیتے ہیں باقی تو بس۔۔۔ اللہ ہی حافظ ہے۔

''اوہ۔۔۔ لگتا ہے کچھ زیادہ ہی مصروفیات ہیں جو جواب دینا بھی مناسب نہیں سمجھا گیا۔۔'' ایک بار پھر تسلیم نے طنز کیا تھا۔ جس پر نور جہاں کا پارہ چڑھ گیا۔ اس نے جواب دینے کے لئے ابھی منہ کھولا ہی تھا کہ عریشہ نے خاموش کروا دیا۔

''امی۔۔ پہلے کام۔۔۔'' طنزیہ گردن جھٹکتے ہوئے اس نے کپڑے چارپائی کے پیچھے پھینک دیے اور پھر چارپائی کھڑی

کرتے ہوئے اس پر ایک پرانی سی بوسیدہ چادر اڑیس دی تا کہ پی ایم کی نظروں سے کسی بھی طرح چھپایا جا سکے۔

" پانچ۔۔۔ چار۔۔۔ تین۔۔۔۔ دو۔۔۔ ایک۔۔۔" جیسے ہی منتہا کی کاؤنٹ ڈاؤن ختم ہوئی دروازے پر دستک ہوئی۔

" لو جی ڈرامہ شروع۔۔۔ نور حور۔۔۔ آؤ ذرا۔۔۔ لائیو ٹیلی کاسٹ ہے۔۔" اس نے اپنی بیٹیوں کو بلایا تو وہ دونوں بھی دوڑی چلی آئیں اور دیوار سے نیچے جھانکنے لگیں۔ نور جہاں کا ایک بار پھر پارہ چڑھا مگر اس بار دانیہ نے خاموش کروایا۔

دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی

" جا کر دروازہ کھولو۔۔۔" دلاور نے کہا تو منتہا نے ایک بار پھر پوچھا

"کھول دوں؟" اس نے تصدیق چاہی۔ پھر سے دستک ہوئی تو سب نے اثبات میں گردن ہلائی تو منتہا نے جھٹ سے دروازہ کھولا تو پی ایم نے گھور کر سامنے دیکھا تو ہمیشہ کی طرح اسے اپنے گھر ہی پایا

"تم کبھی اپنے گھر بھی نظر آجایا کرو۔۔۔"

" اگر تم وہاں آنے کا وعدہ کرو تو روز وہاں تمہارا انتظار کروں گی۔۔۔" وہ بھی حاضر دماغ تھی۔ جھٹ جواب دیا۔ اس سے الجھنا بے کار تھا۔ اس لئے گردن جھٹکتے ہوئے اس کو پیچھے کیا اور اور آگے بڑھا تو سب کو ایک لائن میں لگا ہوا پایا۔ نور جہاں سب کی نمائندگی کے لئے سب سے آگے کھڑی تھی۔

"پی ایم تم آگئے؟" دانیہ نے پوچھا

" نہیں راستے میں ہوں۔۔۔" فی الفور تردید کی۔

" عریشہ ذرا پانی دو۔۔۔" اس نے اپنا بیگ بچھی چارپائی پر رکھا اور بیٹھ کر اپنے جوتے کے تسمے کھولنے لگا۔ یہ جوتے غالباً کئی سال پرانے تھے۔ دیکھ کر تو یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا مگر چونکہ انہیں پی ایم کے پاؤں میں سمانا نصیب ہوا تھا لہذا، ان کی حالت کئی بہتر تھی۔ چمک دمک رگڑنے سے کچھ دیر کے لئے لوٹائی جا سکتی تھی۔ تسمے کھول کر اس نے جرابیں اتارنے کے لئے ہاتھ بڑھایا مگر کوئی بھی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔

" عریشہ۔۔ میں نے پانی مانگا ہے۔۔۔" اس بار اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا

" بھائی۔۔۔پانی۔۔۔"اس نے تصدیق چاہی تو اس نے گھور کر عریشہ کی طرف دیکھا اور پھر دوبارہ جراب اتارنے میں مصروف ہوا۔

" عریشہ پانی دو۔۔۔" دانیہ نے جبڑے بھینچتے ہوئے کہا

" باجی۔۔۔کپڑے۔۔۔" اس نے تقریباً سرگوشی کی تھی۔دانیہ نے کن انکھیوں سے پیچھے کی طرف دیکھا تو اس کے ہاتھ کپڑوں میں الجھے ہوئے تھے۔دانیہ کا بھی کچھ یہی حال تھا۔نور جہاں ہٹتی تو چارپائی کی پینیدیوں سے کپڑوں کا ڈھیر صاف نظر آتا۔اب بچی منتہا تھی۔سو وہ کچن میں گئی اور پانی لے آئی۔

" یہ لو۔۔۔" اس نے گلاس آگے بڑھایا تو ایک بار پھر پی ایم نے اس کو گھورا

" میں نے تمہیں کہا تھا پانی لانے کو۔۔۔"اس کے لہجے کی سفاکیت واضح تھی مگر منتہا پر اثر ہو تو تب ناں۔۔!!وہ تو جیسے اس کی عادی تھی۔

"تمہیں تو پانی پینے سے مطلب ہونا چاہئے۔۔"منتہا نے کہا

" مگر جس کو جو کام سونپا جائے،اسے وہی کرنا چاہئے۔۔"اس نے اگلے ہی لمحے عریشہ کو تنبیہہ کی جو نظریں چراتے ہوئے ہواؤں میں دیکھ رہی تھی۔

"تو وہی تو کر رہی ہوں۔۔" وہ ایک بار پھر اپنی ڈگر پر چلنے لگی۔یعنی دلِ نامراد کے ہاتھوں۔۔۔جی ہاں!منتہا صاحبہ اپنے دل کی سرزمین پی ایم کے حوالے کر چکی تھیں اور اسے اپنی جان۔۔۔اپنی شان مانتی تھیں مگر پی ایم ٹھہرا ان محبت کے چکروں سے کوسوں دور کا راہی۔اس کے لئے ان سب کاموں کے لئے کہاں وقت تھا؟اسے تو اپنی ذمہ داریوں سے ہی فرصت مل جائے۔وہی بہت ہے۔ہمیشہ کی طرح ایک گہرہ نگاہ نے منتہا کو اپنی گردن جھٹکنے پر مجبور کر دیا۔

" اور آپ سب یہ لائن میں کیوں کھڑے ہیں؟ چلیں جا کر اپنا کام کریں سب۔۔۔"

" وہی تو کر رہے ہیں۔۔۔" دلاور نے کہا

" مطلب؟" اس نے تشویش والے لہجے میں پوچھا

"مم مطلب۔۔۔ کک کچھ نہیں۔۔" سب نے دلاور کی پھسلی زبان کو سنبھالا اور بات کو ٹالنا چاہا مگر ایک لیڈر وہی ہوتا ہے جو ذرا سی غلطی سے بھی خطرے کی بو سونگھ لے۔ پی ایم بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ پانی کا ایک گھونٹ بھرتے ہوئے وہ اٹھا اور جوتی کو پاؤں میں اڑیستے ہوئے ان کی طرف بڑھا۔

" تت تم۔۔ یہاں کیوں آرہے ہو؟ جا کر آرام کر لو۔۔۔" نور جہاں نے کہا

"دیکھنے آرہا ہوں کہ آپ سب کیا چھپا رہے ہیں؟" اس نے پیچھے کی طرف جانا چاہا تو دلاور نے اس کا بازو پکڑ لیا

" یار۔۔!! تجھے ہم پر یقین نہیں ہے۔۔۔"

" بالکل بھی نہیں۔۔۔" سپاٹ لہجے میں نفی میں گردن ہلادی۔ اس نے ذرا جھانکا تو وہاں کپڑوں کا ایک ڈھیر نظر آیا اور مگر ان کو چادر سے ڈھانپا ہوا تھا۔

" یہ کپڑے؟" اس نے آگے بڑھنا چاہا مگر نور جہاں آگے بڑھی

" ارے۔۔ آگے کہاں بڑھ رہا ہے۔ یہ سب پرانے کپڑے ہیں، ہم نے سوچا کہ ان کو بیچ کر کچھ پیسے وغیرہ ہی جمع کر لیے جائیں۔۔" نور جہاں کی اس بات پر تسلیم کو تو جیسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ سب نے اوپر کی طرف دیکھا۔

"منحوس ماری۔۔۔ سب کچھ نہ اُگل دے۔۔۔" نور جہاں بڑبڑائی

"سوری سوری۔۔" تسلیم نے کہا تو پی ایم کی نظریں دوبارہ نور جہاں پر تکنز ہو گئیں

" آپ کو پورا یقین ہے؟" اس نے مشکوک انداز میں تصدیق چاہی تھی

"اور کیا؟ تجھے اپنی ماں پر یقین نہیں ہے کیا؟" اس نے منہ چڑھا کر کہا تو پی ایم نے اپنی نظروں کا محور دانیہ کی طرف کیا تو اس نے عریشہ کی طرف دیکھا، عریشہ نے بھی اپنی نظریں چرا لیں۔ دلاور تو جیسے پیدا ہی ڈھیٹ ہوا تھا۔ معصوم سی شکل بنا کر اسے اپنے جال میں پھانسا چاہا اور شاید کسی حد تک کامیاب بھی ہو چکا تھا۔ تبھی وہ اب گردن اثبات میں ہلاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

"خدا کا شکر ہے۔۔بلا ٹلی۔۔" عریشہ نے گہری سانس لی مگر تبھی بلا واپس پلٹ آئی اور اس کو بلانے والا کوئی اور نہیں عرفان تھا۔

"امی۔۔دیکھ میں چار جوڑے اور لے آیا۔۔بڑی مشکل سے ایک ہزار روپے میں دیئے اس نے۔۔۔" عرفان اور سمیرا کپڑوں کے شاپر ہاتھوں میں لئے جوش و خروش کے ساتھ گھر میں تو داخل ہوئے مگر اندر داخل ہوتے ہی جیسے ان کے جسم سے جان نک گئی۔ایک ہزار روپے سن کر وہ الٹے پاؤں لوٹ آیا۔اس کو سامنے دیکھ کر دونوں کے ہاتھوں سے شاپر نیچے گر گئے۔

"چھوٹے۔۔۔تُو۔۔" عرفان کو جیسے ہچکی بندھ گئی

"کیا کہا آپ نے ابھی ابھی۔۔۔ایک ہزار۔۔۔" وہ اب عرفان کی طرف بڑھنے لگا۔صرف دو چار قدم ہی چلا تھا کہ پیچھے سے ایک بچہ بھاگتا ہوا دلہیز پر آیا

"یہ رانا استفہام اعظم کون ہے ؟" اس بچے کا سوال سن کر تو جیسے سب کے جسم سے جان نکل گئی۔نا کا جھوٹ سامنے آنے والا تھا۔سمیرا نے ہمت کی اور آگے بڑھنا چاہا مگر پی ایم آگے بڑھا

"میں ہوں رانا استفہام اعظم۔۔۔کیا کام ہے تمہیں ؟" یہ نام تھا پی ایم کا۔

"جی یہ صاحب نے بل بھیجا ہے۔۔۔کہا تھا کہ جلدی سے بھر دیجیے گا۔۔" ایک پرچی اس کے ہاتھوں میں تھمائی اور پھر یہ جا اور وہ جا۔۔پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔استفہام اعظم نے پرچی کی طرف دیکھا تو جیسے اس کے ہوش اڑ گئے۔ چھے ہزار کا بل اس کے ہاتھوں میں تھا۔وہ اس پرچی کو اپنے ہاتھوں میں بھینچتا ہوا پلٹا۔

"لو جی۔۔اب چلے گی فلم۔۔۔" حور نے دھیرے سے کہا اور پورے انہاک سے نیچے دیکھنے لگی

"کیا ہے یہ ؟" اس نے سخت لہجے میں کہا مگر کوئی جواب نہ آیا

"میں نے پوچھا کیا ہے یہ ؟" اس بار وہ جھلا کر بولا تھا۔عریشہ کو جیسے ہچکی بندھ گئی۔ایک لمحے کے لئے منتہا بھی کانپ گئی۔

" بیٹا! ذرا چارپائی کے پیچھے کپڑا تو اٹھا کر دیکھو۔۔۔" تسلیم نے لقمہ دیا تو اعظم نے آگے بڑھ کر کپڑا ہٹانا چاہا

" اعظم یار۔۔۔" دلاور نے ہاتھ پکڑا تو اس نے گھور کر دلاور کی طرف دیکھا تو اس کے ہاتھوں کی گرفت کمزور ہو گئی۔ آگے بڑھ کر کپڑا ہٹایا تو کپڑوں کا نیچے نئے جوڑوں کا ایک ڈھیر نظر آیا۔ جسے دیکھ کر وہ آگ بگولا ہو گیا۔

"یہ پرانے کپڑے ہیں؟" اس نے دھیرے سے کہا جو کہ لاوا کے پھٹنے کی طرف پہلا قدم تھا۔

" یہ تسلیم تو فساد کی جڑ ہے۔۔ اس کی زبان تو۔۔۔" نور جہاں نے تسلیم کو کوسا تو اعظم نے خاموش کروا دیا

"امی۔۔ پھپھو نے بالکل صحیح کیا۔۔ آپ مجھ سے بات کریں۔۔ کیا ہے یہ سب کچھ؟" اس نے پوچھا مگر سب خاموش رہے

"آپ سب کو کچھ سنائی نہیں دیتا کیا؟ میں کچھ پوچھ رہا ہوں۔۔۔ پیسے کچھ زیادہ ہی فالتو آ گئے تھے؟ یا پھر آپ نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ پیسے درخت پر اگتے ہیں کہ جب چاہا جتنے چاہا توڑ لئے اور بے کار کاموں می اجاڑ دیئے۔۔" وہ جھلا کر بولنے لگا۔

" اعظم۔۔۔ یہ بے کار نہیں ہے۔۔۔ وہ دراصل پرانے سوٹ پھٹ گئے تھے، بس اس لئے۔۔" یہ دانیہ کے الفاظ تھے۔ اس بار کوئی بھی اسے پی ایم کہہ کر مخاطب کرنے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ غصے میں سب اس کو نام سے پکارتے، کیونکہ اگر اس حالت میں اسے پی ایم کہہ کر پکارنا آ بیل مجھے مارنا کے مترادف تھا۔

"دانیہ باجی۔۔۔ جھوٹ کم بولیں۔۔ پچھلے مہینے جو ایک ہزار روپے مجھ سے لئے تھے آپ نے سوت خریدنے کے لئے وہ کہاں گئے؟ ان سے سوٹ نہیں خریدے تھے کیا؟"

" وہ میں اپنی شرٹ لے آیا تھا۔۔" دلاور نے دھیرے سے کہا

"حرام کی کمائی ہے جو ہر ہفتے آپ اپنے لئے شرٹ لے آتے ہیں؟ اگر پینٹ شرٹ میں گھومنے کا زیادہ ہی شوق ہے تو خود کمائیں اور ہر ہفتے کیا، ہر روز نئے نئے کپڑے خریدیں۔۔۔" اس نے ایک ہی جملے میں دلاور کو جھاڑ کر رکھ دیا۔ اس نے اپنی نگاہیں نیچے کی تو نور جہاں آگے بڑھی

" اے اعظم۔۔تجھے پتا بھی ہے کس سے بات کر رہا ہے تُو؟ تیرا بہنوئی ہے یہ۔۔ بہنوئیوں سے ایسے بات کرتا ہے کوئی؟" نور جہاں نے اسے ملامت کرنا چاہا مگر اس پر کہاں اثر ہونے والا تھا

"بہنوئی ہے تو عزت سے کہا ہے کہ اپنا بوجھ خود اٹھانا سیکھ لیں۔۔۔ سسرال سے اپنے قدم کبھی اپنے گھر کی طرف بھی بڑھا لیا کریں۔۔"

" اعظم تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ دلاور نے اپنے گھر والوں کے خلاف جا کر مجھ سے شادی کی تھی۔۔۔تو پھر۔۔۔" دانیہ نے کچھ کہنا چاہا مگر ایک بار پھر اعظم نے مداخلت کی

"تو پھر۔۔۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اور آپ کو یہاں رہنے کا سرٹیفکیٹ مل گیا۔۔انسان کے بازو بھی کچھ چیز ہیں مگر نہیں۔۔۔ آپ دونوں کو تو جیسے۔۔۔"

" اعظم۔۔۔"نور جہاں نے خاموش کروایا۔

"بس یہی مجبوری ہے میری۔۔۔ آپ سب ایک طرف اور میں ایک طرف۔۔۔مجھے تو جیسے گدھا سمجھ رکھا ہے آپ لوگوں نے جو صبح سے شام تک آپ لوگوں کا بوجھ اٹھائے پھرتا رہے گا۔ کبھی آپ لوگوں نے سوچا بھی ہے کہ میں کتنی مشکل سے آپ لوگوں کا بوجھ اٹھاتا ہوں۔۔پورے گیارہ ہزار ایک سو گیارہ روپے تنخواہ ہے میری۔اس تنخواہ میں بجلی کا بل، گیس کا بل، پانی کا بل، راشن کا خرچہ، انس اور روشنی کے سکول کی فیسیں، عریشہ کے کالج کا خرچہ بمشکل پورا ہوتا ہے اور اوپر سے آپ لوگوں کی بے جا خواہشیں۔۔۔ کبھی ادھر پیسہ برباد کر دیا، تو کبھی ادھر۔ پیسوں کو جمع کرنا سیکھا بھی ہے آپ لوگوں نے؟ کبھی خود پیسے کمائیں تو پتا چلے۔۔۔"

"چھوٹے۔۔اب تو اپنے کمانے کا طعنہ دے رہا ہے۔۔"عرفان نے کہا تو اعظم اب اس کی طرف متوجہ ہوا

" جی ہاں بھائی صاحب۔۔!!یہ طعنہ ہی ہے۔۔ مگر آپ کو تو کوئی اثر ہو گا ہی نہیں۔۔۔ آپ لوگ تو ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے کان سے نکال دیتے ہیں۔۔بس میں ہی پاگل ہوں جو آپ لوگوں سے مغز خوری کر رہا ہوں۔"

" صحیح کہا۔۔۔" تسلیم نے زیر لب کہا مگر خاموشی اس قدر تھی کہ سب کی سماعت تک یہ الفاظ پہنچ گئے۔

"سب سے مراد۔۔۔سب ہیں۔۔۔" اس نے اگلے ہی لمحے تسلیم پھپھو کو بھی لپیٹ میں لے لیا۔ اپنی بے عزتی برداشت نہ کر سکی اور گردن جھٹکتے ہوئے پیچھے ہٹ گئی

"چلو لڑکیو! ان کا تو روز کا کام ہے۔۔" یہ سنتے ہی حور اور نور بھی پیچھے ہٹ گئیں

"چل غلطی ہو گئی۔۔۔معاف کر دے بچوں کو۔۔۔" نور جہاں نے بات کو ٹالنا چاہا

" اتنی آسانی سے تو معاف نہیں کرنے والا۔۔۔" اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا تو سب اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے

" اگلے ماہ جو آپ سب کو شاکر بھائی کی شادی پر جانے کے لئے ایک ایک ہزار ملنے والا تھا۔۔وہ اب نہیں ملے گا۔۔سنا آپ لوگوں نے۔۔" یہ سننے کی دیر تھی کہ سب کے رنگ فق ہو گئے۔ ایسا لگا جیسے ان سے جینے کی وجہ چھین لی گئی ہو۔ آخر چھے ماہ کے بعد اعظم انہیں ایک ایک ہزار دینے والا تھا۔ اب اس کی امید دم توڑنے لگی تھی

"اعظم۔۔۔" دانیہ نے کہا

" ایک لفظ بھی اگر کسی نے بولا تو سزا مزید بڑھ سکتی ہے۔۔" اس نے سخت لہجے میں کہا تو سب کے لبوں پر جیسے مہر لگ گئی۔ سب اعظم کی خصلت سے اچھی طرح واقف تھے۔ یہ وقت سزا کو کم کروانے کا نہیں تھا۔ یہ کہہ کر وہ واپس اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو اس کی نظر وال کلاک پر گئی۔ دو بج چکے تھے۔ جس پر اس کا غصہ ایک بار پھر دہکنے لگا

" آپ سب کچھ بھول تو نہیں رہے؟" سب نے نفی میں گردن ہلا دی مگر لبوں سے ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا

" یاد تو تب رہے گا ناں جب اپنے بے کار کاموں سے فرصت ملے گی۔ بچوں کو سکول سے چھٹی ہوئی آدھا گھنٹا ہو چکا ہے مگر مجال ہے کہ کسی کو بچوں کا یاد بھی ہو۔۔۔" یہ سن کر جیسے عرفان اور دلاور کے جسم میں جھرجھری ہوئی۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ اب ان کی کلاس لگنے والی ہے مگر اس بار ایسا کچھ نہ ہوا۔ وہ کمرے کی طرف پلٹنے کی بجائے واپس صحن میں آیا اور اسی حالت میں دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ دلاور اور عرفان نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تو گردن جھٹک دی۔ عرفان آگے بڑھا اور لبوں کو بھینچتے ہوئے کچھ بولنا چاہا

" اب بولیے۔۔" اس نے اکتاہٹ والے لہجے میں کہا

"تُو ہماری کلاس نہیں لے گا۔۔۔اس بات پر؟" عرفان نے کہا

" آج تک میری کلاس کا آپ دونوں پر اثر ہوا ہے جو آج ہو گا۔۔" یہ کہہ کر وہ دہلیز پار کر گیا جب کہ لاشعوری طور پر عرفان کے لبوں سے یہ الفاظ جاری ہوئے

" یہ تو تُو نے ٹھیک کہا چھوٹے۔۔۔"

* * *

رات کا سماں تھا۔ تارے آسمان پر چمک رہے تھے۔ گھر کے مکین سب سے بے نیاز ہو کر اپنے اپنے کمروں میں ایسے خراٹے لے رہے تھے جیسے زمانے کے پیچ و تاب سے ان کا کوئی واسطہ نہیں مگر انہی مکینوں میں ایک مکین ایسا بھی تھا۔ جو سب سے بے نیاز ہو کر اپنے کمرے میں سٹڈی ٹیبل پر بیٹھا ایک کاپی پر کچھ لکھ رہا تھا۔ لیمپ کی روشنی اگرچہ زیادہ نہ تھی مگر لکھنے اور پڑھنے کے لئے کافی تھی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا۔ جہاں سے رات کی تازہ ہوا کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ پیچھے دیوار پر اس کا سایہ کسی اسی کی دہائی کا اپنا دکھ رسنا رہا تھا۔ ایک عجیب سی تاسف کمرے کے در و دیوار پر نمایاں تھا۔ اس نے پنسل کو منہ میں دبایا اور کچھ سوچنے لگا

"ایک ہزار تو بل کے چلے گئے۔۔۔" بل کے بارے میں سوچ کر اس کے چہرے پر ذرا غصے کے تاثر نمایاں ہوئے لیکن وہ ضبط کر گیا۔ اس نے کھڑکی سے باہر ذرا اندھیرے میں کچھ تراشنا چاہا مگر ہمیشہ کی طرح اندھیرا رہا۔ روشنی کی کوئی سبیل اس کا مقدر نہ بنی۔ چہرے پر کوئی کہانیاں بنتی دیکھائی دیں مگر وہ کہانیاں فقط تاثر تک نمایاں تھیں۔ حقیقت میں قدم رکھنے کی انہیں جازت نہ تھی۔ تبھی اسے باہر کچھ کھٹکا محسوس ہوا۔ اس نے وہ کاپی ٹیبل پر رکھی اور پھر چیئر کو پیچھے کی طرف کھسکا کر اٹھ بیٹھا۔ سب سے پہلے لیمپ بند کیا۔ لیمپ بجنے کی دیر تھی کہ کمرے میں ہر سو اندھیرا چھا گیا مگر اسے ذرا بھی وحشت نہ ہوئی۔ وہ تو شاید اس کا عادی تھا۔ اندازے سے دروازے کی طرف بڑھا اور اس اندھیر کمرے سے باہر نکل آیا۔ آواز کچن سے آئی تھی۔ وہ کچن کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچن میں قدم رکھتا اس کی نظر

عرفان کے کمرے کی طرف گئی۔ وہ جل کر خاک ہو گیا۔

" اس گھر کے لوگوں نے تو جیسے کانوں میں روئیاں دی ہوئی ہیں۔۔۔ مجال ہے میری باتوں پر کان بھی دھڑیں۔۔" وہ جل بھن کر بڑبڑا رہا تھا۔

" اعظم تم ہو۔۔۔" یہ فضل صاحب تھے۔ ان کی آواز سن کر وہ قدرے نرم ہوتا دیکھائی دیا۔

"جی ابو۔۔ میں ہوں۔۔ آپ یہاں کسی کام سے آئے تھے۔ اس نے لائٹ آن کی تو کمرے میں ہر سو روشنی پھیل گئی۔ فضل صاحب جگ سے پانی گلاس میں انڈیل رہے تھے۔

"بیٹا یہ لائٹ آن کیوں کر دی؟ دیکھائی تو دے رہا تھا۔۔" فضل صاحب نے کہا تو وہ گردن جھٹکتے ہوئے آگے بڑھا

" جنہیں لائٹ بند کرنے کو کہتا ہوں وہ تو رات رات بھر اپنے کمرے کی روشنیوں کو جلا کر سوتے ہیں تو پھر آپ کیوں اتنی کنجوسی کر رہے ہیں؟" وہ جل بھن کر کہہ رہا تھا۔ پانی کا گلاس فضل صاحب کو دیا اور سٹینڈ سے دوسرا گلاس نکال کر اپنے لئے بھی پانی انڈیلا۔

"کیونکہ مجھے تمہاری پرواہ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ کیسے تم سب کا پیٹ پالتے ہو؟ کیسے اس گھر کی باگ دوڑ کو سنبھالے ہوئے ہو؟ کیسے اس گھر کی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو پورا کرنے کی خاطر اپنی صحت تک بھی پرواہ نہیں کرتے" انہوں نے بھی جلے ہوئے لہجے میں کہا تھا لیکن ہمدری ضرور شامل تھی۔

" ایک کے کرنے سے کیا ہو گا؟" اس کا دل بری طرح جل رہا تھا۔

" بہت کچھ ہوتا ہے۔۔ ایک کے کرنے سے ہی سب کچھ ہوتا ہے۔ آخر تم بھی تو اکیلے ہی سب کچھ کرتے ہو۔ سب کی خواہشوں کو پورا کرنے کے خاطر جی جان لگا دیتے ہو۔۔" فضل صاحب نے پانی پی کر گلاس ٹیبل پر رکھا اور پھر اعظم کی طرف دیکھا جو شیلف کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا پانی پی رہا تھا۔

"جی جان اور میں۔۔۔ ہنوں۔۔۔ جب جان پر پڑتی ہے تو سب کچھ کرنا ہی پڑتا ہے۔" گردن جھٹکتے ہوئے اس نے کہا تھا اور پھر پانی کا گلاس واپس شیلف پر رکھا اور ان کی طرف متوجہ ہوا

" اور آئندہ اندھیرے میں ادھر ادھر پھرنے کی ضرورت نہیں ہے آپ کو۔ لائٹ جلالیا کریں۔۔ آپ کی خاطر تو پورے گھر کی وائرنگ نیچے کروائی ہے تاکہ آپ کو مشکل نہ ہو۔" اس کے لہجے میں قدرے نرمی تھا مگر وہ اس نرمی کا احساس دلانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اب کچن کے دروازے کی طرف چل دیا۔ لائٹ ویسے ہی روشن رہنے دی جس پر فضل صاحب ہلکا سا مسکرادیئے۔

" میرا بیٹا۔۔!! کتنا ہی اپنے من کی باتوں کو چھپانے کی کوشش کرلے مگر مجھ سے نہیں چھپا سکتا۔۔" وہ وہیل چیئر کو گھسراتے ہوئے تقریباً آگے بڑھے تھے۔ لائٹ آف کی اور اپنے کمرے میں جانے کی بجائے اعظم کے کمرے کی طرف چل دیئے۔ کمرے کا دروازہ ابھی بھی ادھ کھلا تھا۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولا تو ایک بار پھر اسے اسی سٹڈی ٹیبل پر بیٹھا پایا جہاں وہ ہر رات بیٹھ کر دن بھر کے خرچے کی جمع تفریق کرتا تھا۔

"ابو۔۔ آپ۔۔ اندر آیئے۔۔" دروازے سے ہی عکس کو پہچان لیا۔ فوراً ہاتھ بڑھا کر لائٹ روشن کی اور لیمپ بجھا دیا۔ فضل صاحب آگے بڑھے اور اس کے بالکل پاس ہوگئے۔

" اگر برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں؟" انہوں نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ایک بار پھر وہی سوال داغنا چاہا تھا تبھی وہ قدرے جھجکا اور آنکھیں چرا کر کاپی کے ورق الٹنے لگا۔

" اگر آپ وہی سوال پوچھنا چاہتے ہیں تو پلیز۔۔۔ اس سوال کا جواب میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔"اس کی آواز میں ہمیشہ کی طرح وہی لرزا تھا۔ جسے وہ بچپن سے دیکھتے آرہے تھے۔ ایک باپ ہوتے ہوئے بھی انہیں ہمیشہ کی طرح اس کی پہنچان حاصل کرنے کے لئے اس کے جواب کا انتظار تھا۔ اگرچہ وہ ہر بار جواب دیتا مگر نہ جانے کیوں اس کے جواب سے بھی ان کا دل مطمئن نہ ہوتا بلکہ ایک کشمکش جنم لیتی اور پھر یہ کشمکش بڑھتی رہتی۔ آج بھی اسی کشمکش کو کم کرنے وہ اس کے پاس آئے تھے۔

" جواب تو دیتے ہو مگر نا جانے کیوں میرا دل مطمئن نہیں ہوتا۔۔ دل کہتا ہے کوئی بات تو ہے جو تم ہم سب سے چھپا رہے ہو۔" انہوں نے اس کا چہرہ اپنی طرف کرنا چاہا

''ابو۔۔۔ آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے؟ پہلے تو آپ مجھے یہ بتائیں؟'' اس نے الٹا سوال داغ دیا

''کیونکہ اگر ایسا ہے تو میں تمہارا مجرم ہوں۔۔۔ میں کیا اس گھر کا ایک ایک فرد تمہارا مجرم ہے۔'' ان کی آنکھوں میں ایک نمی ابھر آئی تھی جس پر اسے طنزیہ مسکرانا چاہیئے تھا مگر اس نے ایسا کچھ نہ کیا۔ اس کا لہجہ پہلے کی طرح ہی جارحانہ تھا

'' اور ایسا آپ کو کیوں لگتا ہے؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا

''کیونکہ میر اصہیب ایسا نہیں تھا۔ میر اصہیب تو زندگی کو جینا جانتا تھا۔ ہنسنا جانتا تھا اور مسکرانا جانتا تھا۔ اس کے لئے اپنی زندگی ایک نعمت تھی۔ وہ اپنی زندگی کو عالیشان بنانا چاہتا تھا۔ اس چھوٹی سی زندگی میں بلندی کی انتہا کو چھونا چاہتا تھا۔ آنکھوں میں سپنے پرونے سے لے کر ان کو تعبیر بخشنے تک وہ حوصلوں کی اڑان بھرنا جانتا تھا اور۔۔۔'' وہ کچھ کہتے کہتے اٹک سے گئے تھے۔ یادوں نے دل پر دستک دی تو آنکھوں [illegible] آنسو تیرنے لگے۔

''اور کیا؟'' اس کا لہجہ اب بھی جارحانہ تھا

'' اور۔۔۔ تم اچھی طرح جانتے ہو میں کیا کہنا چاہتا ہوں۔۔'' اس بات پر اس کا دل پگھلنے کو چاہ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو امڈنے کو تیار تھے مگر نا جانے وہ کس مٹی سے بنا تھا؟ جذبات کو کیسے ضبط کئے ہوئے تھا؟ چہرے پر نرمی کی جگہ سختی کو ابھارا

''سب سے پہلے تو یہ بتائیں کیا میں آپ کا بیٹا نہیں ہوں؟'' اس نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا

''کیوں نہیں۔۔۔ تم دونوں میرے بیٹے تھے۔۔''

'' تو بس۔۔ بس یہ سمجھیے میں ہی آپ کا بیٹا ہوں۔۔ رانا اسفہام اعظم۔۔۔'' اس نے نظریں پھیرتے ہوئے کاپی کو بند کی اور اسے اٹھا کر دراز میں رکھ دیا۔

''اور رانا صہیب اعظم۔۔۔؟؟''

'' وہ مر چکا ہے۔۔۔'' اس کے لہجے میں سفاکیت تھی۔ تبھی وہ دوبارہ پلٹا تو آنکھوں میں بے اعتنائی صاف تھی

" مجھے اب نیند آ رہی ہے۔ رات کافی ہو چکی ہے۔ آپ بھی جا کر سو جائیں۔۔ اب صبح آفس بھی جانا ہے۔۔۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا تو وہ باہر چل دیئے۔ ان کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے لائٹ آف کر دی اور ہمیشہ کی طرح یہ کمرہ ایک بار پھر اندھیرے میں ڈوب گیا اگرچہ باقی پورے گھر کے کمرے اس وقت روشن تھے۔ فضل صاحب نے وہیل چیئر کو آگے کھسکایا تو اندھیرے میں اس کا ہاتھ سٹول سے جا لگا۔ آواز خاموشی میں گونجی تو آگے بڑھ کر کسی نے لائیٹ آن کر دی۔ فضل صاحب نے پیچھے پلٹ کر دیکھا تو اعظم اپنے کمرے کا دروازہ بند کر رہا تھا۔ چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ چھا گئی۔

"سب کے بارے میں کتنا سوچتا ہے تُو۔۔۔ زبان سے کڑوا سہی۔۔ مگر دل تو آج بھی نرم ہے۔۔ بس تیری یہی نرمی ہی مجھے شک میں مبتلا کرتی ہے۔ میرا دل پکار پکار کر کہتا ہے کہ تو استفہام نہیں صہیب ہے۔ ہنستا مسکراتا۔۔۔ زندگی کو اپنے ڈھنگ سے جیتا صہیب۔۔۔" آنکھوں میں یادوں نے ایک پل کے لئے آنسوؤں کو جگہ دی تو رخسار پر بھی ان کی ایک جھلک نظر آنے لگی۔ انہوں نے پلٹ کر واپس اپنی راہ لے لی۔

* * *

ہمیشہ کی طرح وہی لباس زیب تن کیا۔ ایک اونچا سا آسمانی رنگ کا کُرتا اور گہرے نیلے رنگ کی جینز۔ بازوؤں کو کہنی تک فولڈ کئے ہوئے۔ درمیان سے بالوں کی چیر خود بخود نکل آتی تھی اور وہی بند تسمے والے جوتے جو وہ تقریباً پچھلے دو سال سے پہنتا آ رہا تھا۔ کندھے پر بھی وہی بیگ لٹکایا جس میں چند فائلیں ہوتیں۔۔۔ سٹڈی ٹیبل کی طرف بڑھ کر دراز سے اپنا معمولی سا موبائل نکالا۔

" دنیا بدل چکی ہے۔۔ اور تم ہو کے یہی گھسا پٹا موبائل لے کر پھر رہے ہو۔۔ نو کیا گیارہ دس۔۔۔ بھلا آج کل چائنا کے بھی اتنے موبائل مل جاتے ہیں بندہ وہی رکھ۔۔ ذرا شان بڑھ جاتی ہے۔" موبائل کو چھوتے ہی اس کے کانوں میں اپنے باس کی آواز گونجی تھی۔

" ہنوں۔۔۔ چائنا کا موبائل۔۔۔ پہلے خرچے کم ہیں جو ایک خرچہ اور بڑھانے کا مشورہ دیتے رہتے ہیں۔۔" دل میں

کڑھتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ تبھی اس نے ایک پرانی سی گھڑی اپنے بائیں ہاتھ میں باندھی جو دیکھنے میں نہ تو جاذب نظر تھی اور نہ ہی کسی مہنگے برانڈ کی معلوم ہوتی تھی۔ مگر وقت بالکل ٹھیک دیتی ہے اور یہی تو چاہیئے تھا اعظم کو۔ اب وہ اپنے کمرے سے باہر قدم رکھ چکا تھا۔ پلٹ کمرے کا دروازہ لاک کیا اور کچن کی طرف چل دیا۔ جہاں سے پہلے ہی شور شرابے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ وہ عجلت کے ساتھ کچن میں داخل ہوا تو کچن کے دروازے پر ہی اس کے قدم منجمد ہو گئے۔ ہمیشہ کی طرح وہی ہڑبڑاہٹ تھی۔

" آرام سے کھایئے۔۔۔ کوئی آپ کے منہ کا نوالہ چھین کر نہیں بھاگ جائے گا" اس نے گردن جھٹکتے ہوئے کہا اور شیلف کی طرف بڑھ کر ایک کپ اٹھایا۔

"تجھ سے مطلب؟ تُو اپنا کام کر۔۔۔ کم سے کم ہمارے کھانے پر تو نظر نہ رکھا کر۔۔۔" دانیہ نے جل بھن کر کہا تھا۔

اعظم نے آگے بڑھ کر چائے کپ میں ڈالنے کے لئے دیگچی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کو یہ دیکھ کر ایک دھچکا لگا کہ وہ خالی تھی۔ یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ شاید اسی لئے اپنے غصے کو ضبط کر گیا۔

"امی۔۔ میری چائے ناشتے بنانے کی تو کوشش بھی نہیں کی ہو گی آپ لوگوں نے۔۔؟؟" اس نے پلٹ کر کہا تھا

"وہ۔۔ وہ۔۔۔ میں بھول گئی۔۔" دانیہ کا نوالہ حلق میں پھنسا لیکن اگلے ہی لمحے بڑی ہی ڈھٹائی کے ساتھ جھوٹ بول دیا۔ کچن کا کام زیادہ تر دانیہ ہی سنبھالتی تھی۔

"ماموں۔۔۔ ماما جھوٹ بول رہی ہیں۔۔۔" روشنی نے مداخلت کی تو دانیہ نے آنکھیں دیکھا کر خاموش کروانا چاہا تو دبک کر بیٹھ گئی۔

"آپ کو پتا ہے چاچو۔۔ پھپھو کہہ رہی تھیں کہ اس پی ایم نے ہمیں کل بلاوجہ ڈانٹ پلائی تھی ناں۔۔ اس لئے آج اس کے لیے ناشتہ بھی نہیں بنانا۔۔" انس کی بات سن کر اعظم ایک پل کے لئے کچھ نہ کہہ سکا۔

" تُو اپنی چونچ بند بھی رکھا کر۔۔۔ پی ایم کے چمچے۔۔" عرفان نے انس کو ٹوکا

" آپ میرے بیٹے کو کیوں ٹوک رہے ہیں؟ صحیح تو کہا ہے میرے بیٹے نے۔۔۔ صرف چند سوٹ ہی تو خریدے تھے ہم

نے۔۔جو اتنی سنا دی۔۔" سمیرا نے اپنے بیٹے کے بالوں کو سنوارا

" اور کچھ ہو نہیں جائے گا اگر ایک دن کچھ کھائے گا نہیں۔۔ آخر اسے بھی تو پتا چلے کہ کسی کا دل توڑنا کتنی بری بات ہے۔۔" دانیہ نے بے نیازی کے ساتھ کہا تھا۔

"تم کب سدھرو گے۔؟ یہ مت بھولو کہ جو تم کھا رہے ہو۔۔۔وہ بھی اسی کا کمایا ہوا ہے۔۔" فضل صاحب کچن میں عین اسی وقت داخل ہوئے تھے۔

"رہنے دیجیے ابو۔۔۔یہ سلوک پہلی بار تو برتا نہیں جا رہا میرے ساتھ۔۔ آخر میں ٹھہرا اس گھر کا پی ایم۔۔گھر کی عوام کبھی اپنے حاکم کے ساتھ ہوئی بھی ہے۔۔۔ہنوں۔۔ چلو بچو۔۔ تمہیں سکول سے دیر ہو رہی ہے۔۔"اس نے بچوں کے بیگ اپنے دوسرے کندھے پر لٹکاتے ہوئے کہا تھا

" آج بھی باہر سے ہی ناشتہ کرنا پڑے گا۔۔۔"

" باہر۔۔۔" سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔یک زباں ہو کر بولے تھے

" باہر ڈھابے سے۔۔۔کسی ہاٹل وغیرہ سے نہیں۔۔جو سب کے منہ سے رال ٹپکنے لگ گئی۔۔" اس نے پلٹ کر کراخت لہجے میں جواب دیا تو سب کو ذرا سکھ کا سانس لیا۔

" تیرا کیا بھروسہ۔۔" نور جہاں بڑبڑائی تھی۔اس بات نے اسے بہت ٹھیس پہنچائی تھی۔

" بے فکر رہیں۔۔۔مجھے احساس ہے کہ پیسے کیسے کمائے جاتے ہیں؟ آپ کی طرح نہیں۔۔۔" وہ جل بھن کر کہہ رہا تھا۔

"چلو بچو۔۔۔" اس نے دونوں ہاتھوں میں انس اور روشنی کا ہاتھ تھاما اور کچن سے نکل دیا۔نور جہاں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے گردن جھٹکی اور دوبارہ ناشتے میں مصروف ہو گئی۔

"کچھ تو شرم کرو۔۔تم سب۔۔وہ اس گھر کا بیٹا ہے اور اس گھر کا واحد کفیل۔۔۔اسی کا کمایا کھاتے ہو اور اسے کو گھر سے بھوکا بھیجتے تمہیں شرم نہیں آتی۔۔" فضل صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔انہیں اعظم کے لئے بہت

برا الگ رہا تھا جو آج پھر بنا کچھ کھائے کام پر چل دیا تھا۔ انہیں بخوبی علم تھا کہ اس نے گھر والوں کے سامنے تو کہہ دیا کہ وہ ڈھابے سے کھانا کھالے گا مگر وہ جانتے تھے کہ وہ ایسا نہیں کریگا۔ دوپہر تک وہ کچھ نہیں کھائے گا یا شاید شام تک۔۔ ایک ایک پیسہ کو بچانا وہ جانتا تھا۔ خود بھوکا رہ لیتا مگر اس گھر والوں کے اخراجات کو اپنی جان سے بڑھ کر برداشت کرتا۔ انہوں نے باہر پلٹ کر دیکھا تو وہ گھر سے باہر قدم رکھ رہا تھا۔ انس کا بالکل باپ کی طرح ہاتھ تھامے وہ اسے کچھ نصیحت کر رہا تھا۔ وہ نصیحت جو شاید اس کے سگے باپ نے بھی نہیں کی ہوگی۔ ہر فرض کو وہ خود نبھا رہا تھا۔ سب سے بے نیاز ہو کر۔۔

''اب زیادہ فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ آکر ناشتہ کر لو۔۔ چھوڑو اسے۔۔۔'' نور جہاں نے ایک بار پھر گردن جھٹکی تو یہ گردن جھکا کر رہ گئے اور اپنی حالت زار پر افسوس کا اظہار کیا۔

* * *

وہ عجلت کے ساتھ کیبن کی طرف بڑھ رہا تھا جو اس کے اکیلے کا نہیں تھا۔ بلکہ اس کے دو کولیگ بھی اس کے ساتھ وہ کیبن شئیر کرتے تھے۔ اس نے جیسے ہی اپنے کیبن کا دروازہ کھولا تو انہیں ٹیبل پر بیٹھے گپے ہانکتے ہوئے پایا۔ وہ فقط گردن جھٹک کر رہ گیا۔

'' لو جی ہمارے پرائم منسٹر صاحب آ گئے۔''نوید نے جملہ کسا تو ولید نے قہقہ لگایا جبکہ اعظم خاموشی سے اپنے ٹیبل کی طرف بڑھا

''لگتا ہے آج پھر ہمارے پرائم منسٹر ذرا غصے میں ہیں۔۔۔'' نوید ایک جست لگاتے ہوئے اعظم کی طرف بڑھا

''غصہ تو ہونگے ناں۔۔۔ جب کوئی ان کے احکام کی نافرمانی کرنے گا۔۔۔'' ولید نے لقمہ دیا تو اعظم نے پلٹ کر گھورا جیسے انہیں خاموش کروانا چاہتا ہو

'' لو جی۔۔ تم غصہ ہو گئے۔۔۔ پرائم منسٹر صاحب۔۔!'' نوید نے اس کے شانے کو چھوا تو اس نے جھٹک دیا اور اپنا بیگ ٹیبل پر رکھا

" ویسے یار۔۔ ہمیں یہاں پر کام کرتے پانچ سال ہو گئے ہیں۔۔ اور ان پانچ سالوں میں ہم نے کبھی تمہیں ہنستے ہوئے دیکھنا تو در کنار مسکراتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔۔۔" نوید اب ذرا سنجیدہ ہوا تھا

" ہاں یار۔۔ ذرا کچھ مسکرا بھی بات کر لیا کر۔۔ میں بھی تو دیکھوں کہ ہمارا یہ پرائم منسٹر کیسا لگتا ہے مسکراتے ہوئے۔۔" ولید نے آگے بڑھ کر اس کی گالوں کو ذرا نوچا تو اس نے ہاتھوں کو پیچھے جھٹکا

" یہ اول فول بکنا بند کرو۔۔۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا

" یہ ہنسنے ہنسانے کی باتیں کرنا اول فول بکنا ہے؟" ولید نے کہا

" میرے نزدیک ہے۔۔ یہ جو ہنسنا مسکرانا ہے ناں۔۔ اس لوگوں کا کام ہے جنہیں زندگی سے فرصت میسر ہو یا پھر جن کی زندگی میں محبت ہو۔۔۔" پہلی بار وہ سپاٹ لہجے میں گویا ہونے کی بجائے ذرا سنجیدہ لہجے میں گویا ہوا تھا۔ اس کا دل بری طرح گھائل تھا وہ اپنا دکھ اسنانا چاہتا تھا۔ تبھی ایک لامحدود یادوں کے سمندر میں غرق ہوتے ہوئے گویا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں انتہا کی خشک سالی تھی۔ یادوں کا بھنور تھا، رشتوں کی محرومیاں تھی اور کچھ بچھڑے اپنے۔۔۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ولید ذرا چونکا تھا

"مطلب بھلا مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔۔ میں تو خود ان سب کا مطلب ڈھونڈ رہا ہوں۔۔" آنکھوں میں ایک نمی تیرتی محسوس ہوئی۔ اس نے اپنا چہرہ دیوار کی طرف موڑ لیا

"اچھا چھوڑ ان باتوں کو۔۔۔ یہ بتا کہ کب تو اپنی مسکراہٹ کو ہمیں دیکھانے کا شرف بخشے گا۔۔" نوید نے کہا تھا

"جب محبت کی انتہا مل جائے گی۔۔۔" ایک آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلا تھا۔ اعظم کی بات سن کر دونوں بری طرح چونکے تھے۔

* * *

جاری ہے

داستان دل کتابی شکل میں شائع ہو رہا جو اپنے گھر، کالج، ہوسٹل، دفتر کے ایڈریس پر ہر ماہ حاصل کرنا چاہتا ہے وہ

03225494228 واٹس اپ پر رابطہ کریں شکریہ

حاجی صاحب

ملک بلال

مانسہرہ

حاجی صاحب نماز، روزے کے بڑے پابند ہیں۔ کچھ روز پہلے ہی حج ادائیگی کے بعد لوٹے۔ حاجی صاحب سے مل کر خیریت دریافت کی۔ وہاں ایک بزرگ بھی بیٹھے تھے، جو حاجی صاحب کو مبارکباد دینے آئے تھے۔ یہ میری پڑوس میں رہتے ہیں، حاجی صاحب نے بزرگ کا تعارف کروایا، بہت غریب ہیں، جہیز نہ ہونے کی وجہ سے جوان بیٹیاں گھر بیٹھی ہیں۔ آپ تو فلاحی کام بہت کرتے ہیں، ان کے ساتھ بھی تعاون کریں۔ میں نے حامی بھر لی اور حاجی صاحب سے پوچھا، آپ نے کتنے حج ادا کر لیے ماشاء اللہ، حاجی صاحب نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا، بولے "پورے پانچ"

☆☆☆☆

بدنصیب...

آج وہ بہت خوش تھی وہ آج دلہن کے جوڑے میں تھی خود کو بار بار آئینہ میں دیکھ کر خود کو بہت خوش نصیب سمجھ رہی تھی. ناجانے کیا سوچتے ہوئے اسکے قدم اماں کے کمرے کی طرف چل دئے وہ اچانک سہم گئی یہ تو اس کی اماں کی آواز تھی جو کہ ابا سے کہہ رہی تھی..

ہمارے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچا جو باقی بچیوں کے لئے رکھیں تم نے لڑکے والوں کی ڈیمانڈ پوری کرنے کی خاطر گھر کیوں گروی رکھ دیا. یہ سنتے ہی انابیئہ کے پیروں تلے زمین نکل گئی اور وہ اس وقت خود کو دنیا کی سب سے بدنصیب لڑکی سمجھ رہی تھی...

از قلم.

فری ناز خان

کراچی..

☆☆☆☆

مناہل فاطمہ

فون کی گھنٹی بجی رضیہ نے ھلو کیا ھاں ماں آپ کے لئے سرپرائز ہے۔ پرسوں کی فلائٹ سے آرہا ہوں 02 دن کی چھٹی پہ۔۔۔ رضیہ تو یہ سن کرخوشی سے پھولے نہ سما ہائی ۔۔ میرے لال ! بسم اللہ ؛آج ہی میں تیری خالہ کے گھر جاکر تیری شادی کی بات کرتی ہوں۔۔۔ فون کٹ گیا تو چہارسو افرا تفری کا سماں تھا۔۔۔

دو دن بڑی مشکل سے گزرے ہی تھے کے بیٹے کی آمد کے دنپھر گھنٹی بجی ۔۔۔ کرنل عزیز مخاطب تھے سوری کیپٹن ادنان جنگ کے دوران شہید ہو گئے ڈیڈ باڈی آبائی گاؤں بھیج دی گئی ہے۔۔۔ ادھر شادی کے ارمان ۔۔ اور اُدھر قیامت صغریٰ جو رضیہ اس کے اہل و عیال پہ بیت رہی تھی

☆☆☆☆☆☆

عنوان:مولوی

از قلم:ہاجرہ عمران خان

او مولوی، اے مولوی ادھر آ مولوی

یہ وہ القاب تھے جن سے اسے پکارا جاتا

ایک دوست نے پوچھا" تمہیں برا نہی لگتا جب لوگ

تمہیں یوں پکارتے ہیں؟ تم داڑھی شیو کرا دو"،

مولوی نے کہا" یہ داڑھی، رومال اور اونچی شلوار میرے پیارے نبی (ص) سے نسبت کی وجہ سے ہے اور یہ نسبت مجھے جان سے بڑھ کر عزیز ہے. مجھے دنیا کی پرواہ نہی بلکہ آخرت کی فکر ہے جب میرے نبی (ص) مجھے میرے حلیے کی وجہ سے پہچان جائیں گے ."اسکی آنکھیں جذبات سے چمک رہی تھیں. دوست نے اسے حیرانگی سے دیکھا.

از قلم، ہاجرہ عمران لاہور

☆☆☆

بہو نے سارے گھر کا نظام بخوبی سنبھالا ہوا تھا وہ ہر فن مولا تھی ہر کام وقت پر ہو جاتا تھا سب کی ضرورت منٹوں میں پوری کر دیتی تھی دعوت ہو یا تہوار دستر خوان سجا دیتی تھی سسرالی رشتے بھی خوش اسلوبی سے نبھالیتی تھی کسی کو بھی شکایت کا موقع نہیں دیتی تھی سسرال والے بھی ابہت خوش تھے بس کمی رہ جاتی تھی تو یہ کہ نہ وہ اپنے میکے والوں سے

فون پر بات کر پاتی. نہ ہی اسے آئینہ دیکھنے کی فرصت مل پاتی. بس...... اپنا وجود وہ کسی میلے میں کھو چکی تھی از قلم-

-مائدہ آصف کراچی

☆☆☆☆☆

عنوان ہے اثاثہ "

میرے شوہر کا ٹرانسفر میرے پسندیدہ شہر میں ہو گیا تھا میں بہت خوشی خوشی سارا سامان پیک کر رہی تھی مگر میں محسوس کر رہی تھی کہ میرے شوہر اداس تھے

مگر اگلے دن وہ آفس سے واپس آئے تو ان کے چہرے پر اطمینان تھا میں نے وجہ پوچھی تو خوش ہو کر بتانے لگے

میں نے ٹرانسفر رکوا دیا ہے"

مگر کیوں؟"میں نے چیخ کر پوچھا میرے ارمانوں پر اوس پڑ گئی یہاں کیا رکھا ہے؟"میں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا

"میرے ماں باپ کی قبریں" میرے شوہر کا بے ساختہ جواب آیا

از لبنیٰ غزل کراچی

☆☆☆☆☆

سمجھوتہ۔۔۔۔۔۔۔:'(

ہر روز مار کھاتی ہے ڈھیٹ بن کے اور اپنے زخم دکھانے میرے پاس چلی آتی ہے، اپنی جان کیوں نہیں چھڑا لیتی اُس نشئی سے۔۔۔ غزالہ نے پینو کے نیل و نیل وجود کو دیکھتے ہوئے کہا، اپنا کماتی کھاتی ہے بلکہ ساتھ اُس کا نشہ پانی بھی پُورا کرتی ہے۔۔۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے تجھ پر۔۔۔۔۔

پینو دل گرفتگی سے مسکرائی اور غزالہ کو تکتی ہوئی گویا ہوئی۔۔۔

ٹھیک ہے باجی،،، مارتا ہے میرے وجود پر ہر روز نیا زخم لگاتا ہے پر اُس کا یہ احسان کیا کم ہے کہ کم از کم میرے سر پر چھت تو ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

ریحانہ اعجاز۔۔

کراچی

☆☆☆☆☆

سو لفظی کہانی

بہو تم کان کھول کر سن لو اگر اس بار پھر بیٹی پیدا کی نہ تو تمہارا اس گھر اور میرے بیٹا پر کوئی حق نہیں ہو گا امی آپ یہ کسی باتیں کر رہیں ہیں یہ گھر آمنہ کا بھی ہے اور بیٹیاں تو اللہ کی رحمت ہوتی ہیں اے ہم نے کب کہا وہ تینوں ہمارے لیے زحمت، ہیں ہم نعمت کے بھی طالب ہیں، جوں جوں پیدائش کا وقت قریب آرہا تھا دونوں کی پریشانی بڑھ رہی تھی بچہ پیدا ہوا دونوں نے بچے کو دیکھا اور پر نم آواز میں بولے کاش یہ بھی بیٹی ہی ہوتی

شمائلہ زاہد

☆☆☆☆☆☆

عنوان: سوچ

از قلم: نورین کنول

گلی کے کونے پہ کھڑے زبیر نے دور سے صنف نازک کو آتے دیکھا تو نظروں کے اشارے سے ساتھ کھڑے دوست کو دیکھایا

"چھوڑ یار کیا پتہ کوئی مجبوری ہو بیچاری کی۔"

"مجبوری۔۔۔ابے ان جیسیوں کی کیا مجبوری جو رات کے بارہ بجے باہر گھوم رہی ہیں محترمہ۔" زبیر نے طنزیانہ لہجے میں ہنستے ہوئے کہا۔

صنف نازک کا حجاب میں لپٹا وجود جب انکے نزدیک آ پہنچا تو شناسا سی پر نم آنکھیں دیکھ کر زبیر چونکہ ہی تھا کہ بہن بولی

"زوبی بھیا ابا کو خون کی الٹیاں ہو رہی ہیں گھر چلیں"

☆☆☆☆☆

خوابوں کے جگنو

گھنے بادل، لہلہاتا سبزہ بھیگی سڑک اور عیدی کے پیسوں سے بڑا پاؤچ پکڑے اکیلی لڑکی ٹک شاپ کے پاس گزرتے دو شخص اس کا پاؤچ چھیننے کے لیے پیچھے بھاگے۔ وہ بھاگتی پہاڑی علاقے کے نشیبی محلے کے چھت اور بند رستے تک آ پہنچی۔

پاؤچ چھیننے کے خوف سے اس نے پاؤچ گہرائی میں پھینک دیا اور رونے لگی۔ دونوں اشخاص ہار کے لوٹ گئے۔

تھوڑی دیر بعد ایک شہزادہ اس کا پاؤچ لیے آیا جو وہ گہرائی میں پھینک چکی تھی۔

شہزادے نے پاؤچ اس لڑکی کو دے دیا۔

ایسے اسے پاؤچ اور شہزادہ دونوں مل گئے۔

مقدس خان

☆☆☆☆☆

عنوان؛ مقدر

اماں کہہ رہیں تھیں ہانیا منحوس ہے

مگر ہانیا انکے کہنے سے زیادہ خود یہ محسوس کرنے لگی تھی اسکی زندگی میں رہا ہی کیا تھا سوائے محرومیوں کے منگنی ٹوٹی تو سب کے منہ کُھل گئے اور وہ منگنی ٹوٹنے کا سوگ بھی نا منا سکی مگر ایک تھا جو اسے حاصل کرنا چاہتا تھا اور جمشید کا رشتہ قبول ہوا اور وہ سادگی سے جمشید کے نکاح میں آگئی تو پہلی بار اسے محسوس ہوا کہ محبت سے دامن بھرنا کسے کہتے ہیں وہ خوش تھی بھرپور اور مکمل خوش اسے ناز تھا اپنے مقدر پر اپنے ہمسفر پر۔۔۔

تحریر؛انمول عائشہ صدیقی

☆☆☆☆☆

از قلم,طیبہ عنصر مغل

عنوان دستور نرالے

ایک چھٹی فالتو میں مل رہی ہے انجوائے کریں

کام نمٹ جائے تو اچھا ہے,

اوہ,تو کنسٹریکشن کیا اتوار کو نہیں ہو سکتی,

ہوتی ہے لیکن آج ایک دن مزید مل رہا ہے. تو فائدہ کیوں نہ اٹھالوں, اتوار کو بچوں کو پکنک پہ لے جاؤں گا. مگر آج آپ کو مزدور کہاں سے ملیں گے, یکم مئی ہے آج تو, وہ پریشان ہو کے بولی, تم بحث بہت کرتی ہو, اس نے گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے کہا, تو اس میں غلط کیا ہے آج تو یومِ مزدوراں ہے, یہ پاکستان ہے یہاں آج کے دن مزدور زیادہ ملتے ہیں آخر ہم آفیسرز کی چھٹی ہوتی ہے تو مزدور کو کام ملتا ہے

☆☆☆☆☆☆

سو لفظی کہانی

عنوان، علم

تحریر، نفیسہ رب

میں نے گاڑی سگنل کے پاس روکی تو وہ قریب آ کھڑا ہوا۔۔۔۔۔

پھول لے لو صاحب، اس نے لجاجت سے کہا...

اس عمر میں تم پھول بیچتے ہو پڑھتے نہیں؟ میرے لہجے میں ناگواری تھی

میں صبح اسکول جاتا ہوں، شام میں پھول بیچتا ہوں اور رات میں پڑھتا لکھتا ہوں صاحب

بچے نے کہا میں نے حیرت سے دیکھا اس کی عمر گیارہ سال کی ہو گی۔۔۔

میں نے سارے ہی پھول خرید لئے۔۔میری نظروں میں اس کا مقام بلند ہو گیا اس عمر میں وہ علم کے لئے اپنی سانسیں بیچ رہا تھا

میری نظر میں وہ عظیم تھا۔۔۔۔

☆☆☆☆☆

عنوان:۔ مصلحت

موناشاہ قریشی

کتنے دن ہو گئے ھیں مجال ھے جو بارش کے آثار ہوں-لان میں چہل قدمی کرتے وہ کوفت سے بولی

اللہ کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ھے-آپا نے سکون سے کہا..

ایک تو میں آپ کے اس قول سے تنگ ہوں-وہ جھلائی

باباشادی کیسی گزری آپا نے مالی بابا سے پوچھا.جن کی بیٹی کی شادی تھی.

کرم ھے اللہ کا بارش نہیں ہوئی ورنہ کمرے کی چھت ٹپکتی ھے مہمانوں کے سامنے شرمندگی ہوتی..

ان کے جواب پہ آپا نے جتاتی نظروں سے اسے دیکھا کہ

"اللہ تمہارا میرا نہیں بلکہ سب کا ھے"

☆☆☆☆☆

سو لفظی کہانی

از۔۔۔۔زارا صدف قمر

عنوان۔۔۔۔رحمت خداوندی

آسیہ آج سہہ پہر سے ہی اداس بھیٹی تھی قریب رات آنے کو تھی۔۔۔۔

اچانک گیٹ کی چیر سی آواز پر گھنٹوں کی سوچوں سے خود کو آزاد کیا تھا۔۔۔جاوید آج بھی گھر نہیں لوٹے تھے ۔۔پڑوسن کی چاپلوسی آج کچھ پر اثر سی لگی جاوید دوسری شادی نہیں کر سکتے آسیہ نے خود کو تسلی دی تھی،،،،

صبر ودعا سے مدد لی تھی

آسیہ کی اس قدر دعاوں کی قبولیت میں آج اس کے گھر اک نہیں دو اولاد تھی اور جاوید پر حق بھی صرف آسیہ کا ۔۔۔بے شک۔بدترین اندھیرے کے بعد بارش زور کے برسی تھی۔۔۔۔

8☆☆☆☆

سو لفظی کہانی

عنوان، تبدیلی

تحریر، نفیسہ رب

ٹی وی آن کرتے ہی میں نے دیکھا۔

ایک جلسہ ہو رہا ہے، جس میں پرُجوش تقریریں ہو رہی۔۔ گانے چل رہے ہیں، نوجواں لڑکے اور لڑکیاں ایک ساتھ ڈانس کر رہے ہیں۔۔۔ رزق کا بے جا استعمال کیا جا رہا ہے۔۔ عورتوں کے لباس میں ملک کی تہذیب کا پتا دور دور تک نہ تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ اُس جلسے میں پرُجوش انداز میں س نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ملک میں تبدیلی کے نعرے لگا رہے تھے۔۔۔

میں نے ٹی وی بند کیا۔۔۔ اور میں اسی سوچ میں تھا "واقعی ملک میں تبدیلی آچکی ہے".

☆☆☆☆☆

عنوان: تقدیر

از قلم: جہانگیر منتظر

ایک بزرگ، ایک نوجوان کی گاڑی میں بیٹھا تھا دونوں میں تقدیر پر بحث جاری تھی. نوجوان نے کہا "تقدیر کچھ بھی نہیں ہے جو کچھ بھی ملتا ہے وہ تدبیر سے ملتا ہے "بزرگ نے کہا "تدبیر کرنا انسان کا کام ہے لیکن تدبیر کے بعد وہی ملے گا جو تقدیر میں ہو گا "نوجوان "چاچا میں تقدیر کو نہیں مانتا. میری ہی مثال لیجیے. میرے پاس کپڑے کی بہت بڑی مل ہے جو میں نے اپنی محنت سے بنائی نہ کہ تقدیر نے دی "بزرگ نے کہا "کپڑے کی مل آپکی تقدیر میں تھی اس لیے آپ نے اس کو حاصل کیا "دونوں باتوں میں مصروف تھے کہ نوجوان کے فون کی گھنٹی بجی اس نے اسپیکر آن کیا تو

دوسری طرف سے کسی نے کہا کہ مل میں آگ لگ گئی اور ساری مل خاکستر ہو گئی نوجوان نے بزرگ سے کہا" چاچا یہ کیا ہے "بزرگ نے جواب دیا" تقدیر........."

☆☆☆☆☆☆

عنوان تحفہ

حماد آپ میری بات کیوں نہیں مان رہے میں کب سے آپ سے کہہ رہی ہوں کہ مجھے ایک بے بی چاہیے میں اکیلے سارا دن گھر میں بور ہو جاتی ہوں آپ خود تو آفس چلے جاتے ہیں پیچھے میں تنہا رہ جاتی ہوں رانیہ نے بے چارگی سے کہا تھا ارے ارے مسز میں کہاں سے لا کر دوں بے بی یہ تو اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے بے بی کوئی کھلونا ہے جو میں تمھیں بازار سے لا دوں گا حماد نے رانیہ کی بات کو ہنسی میں اڑایا تھا جس پر وہ منہ پھلا کر بیٹھ گئی تھی وقت کچھ آگے بڑھا اور آج ان کے گھر ایک ننھا مہمان آ گیا تھا انکی فیملی کو مکمل کرنے رانیہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اسے خوش دیکھ کر حماد بھی خوش تھا.

از قلم

ثناء شہزاد

☆☆☆☆☆☆

سو لفظی کہانی

عنوان: پیار

تحریر:نوشین مجیب

ڈھلتی شام میں چھوٹے کمرے سے بڑھیا کے کھانسنے کی آواز آتی ھے

آھوں

آھوں

آھوں...

سلمہ !بشیر میری توروز نیند خراب ھوجاتی ھے کھوں کھوں سے

بشیر : اماں میں جو دوائ لاتا ھوں کیوں نہیں کھاتیں بیزاری سے

سلمہ :پیسے کی بربادی کرتی ہیں پپو باہر آمت بیٹھا کر

بیماری ھے وھاں ماروں گی کسی روز

پپو!دادو...

دادو!بیٹاوہ آپ کوپیار کرتے ہیں اسلیئے غصہ کرتے ہیں

پپو!دادوبابا آپکو بھی غصہ کرتے ہیں وہ آپ سے بھی بہت پیار کرتے ہیں???

دادو: نہیں بیٹا میں ان سے پیار کرتی ہوں آ ھھھھوں..... آ ھھھوں

☆☆☆☆☆☆

100لفظی کہانی

عنوان -: آئیڈیل

از قلم -: بنت حوا

نازیہ بچپن سے ہی صبر و رضا کی پیکر اور والدین کی فرمانبردار تھی. کبھی کسی مرد سے دوستی نہ کی. لیکن اسکے شریک سفر کی صورت میں اسکے دل میں ایک تصوراتی آئیڈیل بستا تھا.

ماں باپ نے اپنی پسند سے اسکی شادی کردی اور وہ فہد کا ہاتھ تھامے پردیس چلی گئی. فہد اسکا آئیڈیل تو نہ تھا لیکن بہت اچھا تھا اور وہ بہت مطمئین بھی تھی.

کافی سالوں کے بعد جب نازیہ وطن لوٹی تو اسکا تصوراتی آئیڈیل حقیقت میں اسکے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا!!!!!.....

اور وہ یہ سوچ رہی تھی کہ کیا یہ خواب ھے یا حقیقت !!!!.......

☆☆☆☆☆☆

مختصر کہانی

عنوان؛ محبت کرنے والے تو

تحریر؛انمول عائشہ صدیقی

پتہ ہے میں نے اس سے اتنی محبت کی اتنی کہ اپنی سانسوں کو بھی ان محبتوں کا امین بنالیا,اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے,بس اسی ایک نام کی مالا جپتی رہی,لیکن ایک دن پتہ چلا اس کا اور میرا رشتہ تو اتنا کچا اتنا بودا تھا کہ اس نے الوداع کہا اور میں نے بھی بدلے میں ہنسی خوشی ہاتھ ہلادیا,مگر اس سے پہلے میں نے اپنی انا کے لاکھ پاؤں پکڑے کہ مجھے بس ایک یہی شخص چاہیئے مگر اس نے کہا کہ اگر وہ تمہارا طلب گار ہوتا تو اسے تمہاری انا کو توڑنے کی ضد نہ ہوتی,تم جو اس کی خاطر اپنی عزتِ نفس تک کو داؤ پہ لگانے کو تیار ہو وہ تو اس آس میں ہے کہ کب تم کوئی ایسا قدم اٹھاؤ اور وہ تمہیں پیروں تلے کچلتا ہوا گزر جائے,محبت کرنے والے انا کو توڑنے کی ضد ہرگز نہیں لگایا کرتے,وہ مان دیتے ہیں مان رکھتے ہیں.....!!

☆☆☆☆☆

نامعلوم محبت....

دروازے پر دستک ہوئی فائز(جو موبائل میں مگن تھا)نے دروازہ کھولا.

اسلام علیکم اینڈ ہیپی نیو ائیر... سفیر نے سلام کیا

وعلیکم اسلام.. سیم ٹو یو کیا حال ہے یار آؤ بیٹھو.وہ دونوں لان میں لگی کرسیوں کی جانب بڑھے..

کیا کر رہے تھے تم فائز..

کچھ نئی یار 2016 کی کچھ یادیں دیکھ رہا تھا لو تم بھی دیکھو فائز نے موبائل سفیر کے سامنے کیا

یار وہ جو ماسٹرز میں پہلے سمیسٹر آمنہ ہمارے ساتھ پڑھتی تھی وہ رات میرے خواب میں آئی تھی اور کہتی ہے آئی لو یو

میرے کچھ کہنے تک میری آنکھ کھل گئی تھی. یار م اس سے تب سے محبت کرنے لگا ہوں سفیر نے کہا.

محبت کی نئی جاتی بلکہ ہو جاتی ہے اور کسی کے خواب میں آجانے سے محبت نئی ہو جاتی

اب تم اس کی طرف رشتہ نا بھیج دینا یادہ نا جب اسد نے اسے چھیڑا تھا تو اس نے اپنے بھائیوں کو بتا دیا تھا اور اس کے بھائیوں نے ہماری خوب ٹھکائی کی تھی. فائز نے سفیر کو سمجھانے کی کوشش کی...

صداقت علی.... کٹھیالہ خورد، منڈی بہاالدین

☆☆☆☆☆

خالی پن

باغیچہ میں پھولوں کو پانی دینے اتنی محو کہ بچپن کی دوست سعمینہ کب آئی پتہ ہی نہیں چلا رضیہ کو. ارے تم میرا ایڈریس کس نے دیا کسی نے نہیں میرے شوہر کی جاب بھی دہلی میں ہیں کل جب تم سبزی خرید رہی تھی میں تمارے پیچھے ادھر تک آ گی تھی. اللہ کی بندی شادی کے بعد کیا ہو گیا وہ چوخیاں وہ تیری چینچلتاں ابھی تک ہم سب سہلیاں یاد کرتے ہیں. چھوڑو ان باتوں کو شادی کے بعد سب بدل جاتا ہیں, کبھی کبھی میں خود سے بہت ڈرتی ہوں اکیلی شوہر دن کے ایک بجے سے رات کے ایک بجے گھر میں اکیلی جب رات کو آے غالیاں سننا زندگی کا ساز بن گیا

از قلم: خدیجہ کشمیری

☆☆☆☆☆

نشیب وفراز

ہادی بیٹاوہ دیوار پے کیا بیٹھا ہے،،دادا حضور نے شفقت سے پوچھا،،

میں نے موبائل پے نظر جمائے،،اک نظر دیوار پے دیکھا،،

کوا ہے دیوار پے بابا،،

دادا ابو تھوڑی دیر بعد،،حماد بیٹا دیوار پے کیا بیٹھا ہے،،،

اس دفعہ میں نے اوپر دیکھے بغیر ہی کہا کوا ہے ابا جی،،،،

تھوڑی دیر ہی گزری ہو گی دادا جی نے پھر سے پوچھا،

حماد علی دیوار پے کیا بیٹھا ہے،،،

اس دفعہ میں اٹھ کے انکے قریب جا کر بولا کوا ہے کوا ہے کوا ہے،،،

دادا ابو مسکرا کے بولے غصے کیوں ہو گے بیٹا،،،

مجھے بھی پتا ہے کوا ہے،،،

تو بار بار مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں ابا؟؟؟؟

بیٹا بیس سال پہلے جب تو بچا تھا،،

اسی جگہ پے میری گود میں بیٹھ کے میری داڑھی کے بال نوچ کے،،

اسی دیوار پے بیٹھے اک پرندے کا نام کوئی پچاس دفعہ پوچھا،، اور میں نے ہر دفعہ تیرا منہ چوم کر بتایا،، کوا ہے بیٹا،،،

مبارک ہو مبارک ہو مبارک ہو

داستان دل اپریل سے کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے

اب آپ داستان دل اپنے گھر، ہوسٹل، آفس، کالج کے ساتھ ساتھ دنیا کے کسی بھی کونے میں حاصل کر سکتے ہیں، تو ابھی اپنا نام ممبر شپ میں فائنل کروائیں

معلومات ممبر شپ:

سالانہ بمعہ ڈاک خرچ	:	1200/-
چھ ماہ بمعہ ڈاک خرچ	:	600/-
تین ماہ	:	300/-

(ممبر شپ 03225494228 اس نمبر پر موبی کیش اکاونٹ میں جمع کرواکہ اپنا ایڈریس اسی نمبر پر واٹس اپ یا مسیج میں سینڈ کریں)

مزید معلومات کے لیے: 03225494228 واٹس اپ / موبائل نمبر

آمنہ رشید

خشک جلد کی حفاظت کے طریقے

سردیوں میں جلد خشک ہو جاتی ہے.. جس سے خاصی سخت ہو جاتی ہے- تو اس سے نجات پانے کے لیے سب سے پہلے تو ایسی غذا کا استمال کرنا ضروری ہو تا ہے- جن میں چکنائی کی مقدار وافر ہو- اس کے ساتھ پانی کا استعمال زیادہ کرنا چاہیئے اپنی غذا میں پھلوں کو شامل کریں کیونکہ پھلوں میں پانی کی مقدار زیادہ ہوتی ہے-

* لیموں اور کیکٹس کلیز استعمال کرنا چاہیں اس سے جلد کی رطوبت میں اضافہ ہوتا ہے - یہ عمل دن میں تقریبا چار سے پانچ دفعہ کرنے سے جلد نکھری نکھری ہو جاتی ہے.-

* رات سونے سے پہلے Orange اساس پر مبنی نورشنگ کریم استعمال کریں - اس سے جلد قدرے نرم ہو جائے گی-

سردیوں میں فلو سے بچنے کے لیے آسان ٹوٹکے - - - -

سردیوں کے شروع ہوتے ہی موسم کے اثرات طبیعت پر پڑتے ہیں اور ہر دوسرا شخص کھانستا چھینکتا نظر آتا ہے۔ یہ وائرل انفکشن تیزی سے پھیلتا ہے اور ہماری تھوڑی سی بد احتیاطی سے اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ آپ اگر فلو کا شکار ہو چکے ہیں یا نہیں بھی ہوئے ہیں تو کچھ اقدام کر کے خود کو اور گھر والوں کو اسکی وجہ سے ہونے والی کھانسی، بخار، درد اور طبیعت کی بیزاری سے بچا سکتے ہیں۔

ا۔ اپنے ہاتھ دھوئیں:

فلو سے بچنے کا سب سے کارآمد اور آسان طریقہ ہے۔ ہم دن میں کئی مرتبہ ہاتھ دھوتے ہیں۔ فلو سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ باہر سے گھر آکر، کسی پبلک بس سے یا گاڑی سے اتر کر، کسی سے ہاتھ ملانے کے بعد ہاتھ ضرور دھوئیں۔ خاص طور پر اس موسم میں اس کا ضرور خیال رکھیں۔

۲۔ زیادہ پانی پئیں:

زیادہ پانی پینا ہر موسم میں ضروری ہے لیکن سردی کے موسم میں زیادہ پانی پینا بہت فائدہ مند ہے۔ سردی کے موسم میں پسینہ نہیں آتا اور پیاس بھی کم لگتی ہے اس لیے ہم اکثر پانی پینا بھول جاتے ہیں اور گھنٹوں پیاسے رہتے ہیں۔ دن

میں آٹھ گلاس پانی سے قوت مدافعت میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس سے ہمارا جسم مختلف بیماریوں سے مقابلے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

۳۔ ورزش:

پانی کی طرح ورزش بھی قوت مدافعت میں اضافہ کرتی ہے۔ ورزش دوران خون تیز کرنے کے ساتھ ساتھ ذہنی دباؤ میں بھی کمی کرتی ہے۔ ساتھ ہی جسم سے ٹوکسن نکالنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ لیکن اگر آپ بیمار ہیں تو آپ کو بہت زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ ایسی صورت میں جسمانی ورزش کے لیے اپنے معالج سے مشورہ کرنا ضروری ہے۔

۴۔ پھل اور سبزیاں استعمال کریں:

اپنی غذا میں پھل اور سبزیوں کی مقدار بڑھا دیں۔ خاص طور پر وٹامن سی والی چیزیں پپیتہ، اسٹرابیری، بروکولی، شملہ مرچ، بند گوبھی وغیرہ۔ اس کے علاوہ وٹامن سی کا سپلیمنٹ بھی لیا جا سکتا ہے۔

۵۔ یخنی کا استعمال:

ٹھنڈ کے اثرات کو ختم کرنے کے لیے عرصہ دراز سے یخنی کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یخنی کا استعمال گلے کی خراش میں آرام پہنچاتا ہے اور ٹھنڈ کے اثر سے بچاتا ہے۔ یہ بچوں اور بڑوں دونوں کے لیے مفید ہے۔

۔ مرغی کے ونگز میں کالی مرچ، لونگ، دار چینی، پیاز، لہسن ادرک، سونف، ثابت دھنیہ، نمک ڈالکر پکائیں۔۔ گرم مشروب اور شہد:

کوئی بھی گرم مشروب گلے کی تکلیف اور کھانسی میں آرام پہنچاتا ہے۔ جبکہ شہد گلے میں خراش کو ختم کرتا ہے۔ شہد میں وائرل انفیکشن سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔

۔ آدھا کپ گرم پانی میں ایک ڈیڑھ چمچ شہد کھانسی میں فوری آرام پہنچاتا ہے۔

۷۔ وٹامن ڈی سپلیمنٹ:

وٹامن ڈی کا ٹیسٹ ضرور کرائیں یہ ایک سادہ سا خون کا ٹیسٹ ہوتا ہے۔ اگر آپ میں وٹامن ڈی کی کمی ہے تو وٹامن ڈی کا سپلیمنٹ لیں یہ نا صرف فلو سے بلکہ دل کی بیماری اور کینسر سے بھی آپ کی حفاظت کرے گا جو وٹامن ڈی کی کمی کی وجہ سے ہو سکتی ہیں

...

اپنی پسند کے رنگ کی chap stick

بنائیں...

ویسلین میں تھوڑا سا ٹکرا لپ سٹک کا ملا کر پگھلا لیں اور کسی لپ سٹک کی خالی بوتل میں بھر لیں

وہ لوگ جنہیں سنتھیٹک کلر یا خوشبو سے الرجی ہے، وہ اپنی جلد سے مطابقت رکھنے والی پراڈکٹ استعمال کر کے یہ بنا سکتی ہیں.

آمنہ رشید

چند روز میں رنگ گورا کرنے کا طریقہ....

کھیرے کا رس نکال لیں پھر اس میں آدھا چمچ عرق غلاب اور آدھا چمچ گلیسرین ملا کر چہرے پر لگائیں اس سے چہرے کا رنگ سفید ہو گا.. روزانہ رات کو سونے سے قبل آہستہ آہستہ مساج کرنے سے چہرہ قدرتی طور پر بلیچ بھی ہو گا.

اور کھیرے کا جوس لگانے سے دھوپ سے خراب ہوا رنگ بھی صاف ہو تا ہے.. یہ ایک نیچرل بیوٹی ٹپ ہے جس کا کوئی نقصان نہیں اور ہر قسم کی جلد کے لئے مفید ہے....

حرا طاہر

سردیوں میں آپ جب بھی اپنا چہرہ دھوئیں تو صابن کا استعمال کم کریں ہو سکے تو فیس واش کا استعمال کریں کیونکہ صابن آپ کی جلد میں نمی کم کر دیتا ہے! اکثر سردی سے بچنے کے لیے دھوپ میں بیٹھ جاتے ہیں اور یہ دھوپ ان کے چہرے پر پڑتی ہے جس سے نقصان پہنچ سکتا ہے اس لیے دھوپ میں کم سے کم بیٹھے اور چہرے پر دھوپ نہ پڑنے دیں #اروشمہ خان

اسکرب

نارنگی اور لیمن کے چھلکوں کا خشک پاؤڈر دو کھانے کے چمچ...

گندم کا آٹا...دو کھانے کے چمچ

شہد... آدھا چمچ

دودھ... حسب ضرورت

استعمال کا طریقہ

ان تمام اجزاُ کو پیالے میں ملا کر پیسٹ بنالیں

روزانہ اس سکرب کو ہاتھوں، پاؤں اور چہرے پر مساج کریں- آدھے گھنٹے بعد دھولیں...

کچھ دونوں میں جلد صاف ستھری اور تازہ ہو جائے گی...

ہاجرہ عمران خان....لاہور

مبارک ہو مبارک ہو مبارک ہو

داستان دل اپریل سے کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے

اب آپ داستان دل اپنے گھر، ہوسٹل، آفس، کالج کے ساتھ ساتھ دنیا کے کسی بھی کونے میں حاصل کر سکتے ہیں، تو ابھی اپنا نام ممبر شپ میں فائنل کروائیں

معلومات ممبر شپ:

سالانہ بمعہ ڈاک خرچ : 1200/-

چھ ماہ بمعہ ڈاک خرچ : 600/-

تین ماہ : 300/-

(ممبر شپ 03225494228 اس نمبر پر موبی کیش اکاونٹ میں جمع کروا کہ اپنا ایڈریس اسی نمبر پر واٹس اپ یا مسیج میں سینڈ کریں)

مزید معلومات کے لیے: 03225494228 واٹس اپ / موبائل نمبر

پھٹی ایڑیاں ٹھیک کرنے کا نسخہ

پرافین ویکس میں سرسوں کا تیل اچھی طرح ملا کر ایڑیوں پر مالش کریں..اور رات بھر لگائے رکھنے کے بعد صبح دھو لیں..یہ عمل 10 سے 15 دن تک جاری رکھیں...

فاطمہ ممین...میرپورخاص

گولڈ فشیل

بیسن..ا ٹیبل سپون

ہلدی... آدھی سے بھی آدھی سپون

مو پھلی یا بادام کا پاؤڈر تھوڑا سا

خشک دودھ...ا ٹیبل سپون

گلسرین...ا ٹیبل سپون

تھوڑا سا زعفران..

زتیون کا تیل تھوڑا یا گلاب کا عرق

ان سب چیزوں کو پانی کے ساتھ مکس کر کے چہرے پر لگائیں...اس سے سکن بہت نرم اور چمکدار ہو جائے گی...

سمیرا حمید....ملتان

بالوں کو سفید ہونے سے بچانے کا طریقہ

سکیاکائی

ماش کی دال

میتھی باریک پیس لیں

پھر اس سفوف سے سر دھویا جائے..یہ بال سفید ہونا بند ہو جائے گے بلکہ بال جھڑیں گے بھی نہیں...

معیزہ خاں... فصیل آباد

گھریلو ٹوٹکے...

لہسن کو direct سے سکن پہ نہیں لگتے... سکن جل جاتی ہے....

* سالن پکتے ہوئے اگر نیچے لگا جائے تو اس میں تھوڑا تھوڑا دودھ ڈال کر بھونیں گے تو جلے ہوئے کی خوشبو سالن میں سے ختم ہو جائے گی... لیکن اگر زیادہ جل جائے تو سالن کو اوپر اوپر سے اتار لیں... اور دوسرے برتن میں نکل لیں کر بھونیں دودھ ڈال کر.....

* اونی کپڑے دھوتے وقت ایک چائے کا چمچہ گلیسرین ڈال کر دھوئیں... کپڑے سکڑیں گے نہیں اور اپنی گُٹھن برقرار رکھیں گے....

* شہد میں ادرک ملا کر چبانے سے گلا ٹھیک ہو جاتا ہے... اور بند آواز کھل جاتی ہے....

* اگر آپ چاہتے ہیں کہ جوتے کی پالش چمکے تو پالش کرنے سے پہلے تھوڑا سا سرکہ ملا دیں جوتے چمک جائیں گے....

آمنہ رشید

ھاتھوں کی صفائی کے لیے

اگر آپ کی جلد سخت ھے تو اپنے ھاتھوں کو جھانواں پتھر سے رگڑیں اور اگر آپ کی انگلیاں سبزی کاٹنے کی وجہ سے داغ دار ھیں تو ان پر لیموں رگڑیں. لیموں کا رس داغ دھبوں کو تحلیل کر دے گا پھر انھیں سادہ پانی سے اچھی طرح دھو کر تولیے سے خوب خشک کر لیں.....

اپنے ھاتھوں کو ھفتہ میں ایک بار کسی اچھی کریم سے مساج کریں...اس سے پھلے ھاتھوں کو پانچ سے تیس منٹ تک زیتون یا بادام کے تیل سے تر رکھیں. یہ طریقہ کار خشک ھاتھوں اور ناخنوں کے لیے ایک عمدہ ٹریٹمنٹ ھے....

ملائکہ خان....راولپنڈی

☆☆☆☆☆☆

داستان دل کتابی شکل میں آ رہا ہے اگر آپ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے رابطہ کریں بہت شکریہ انشاء اللہ داستان دل اپریل سے کتابی سلسلہ شروع ہو رہا ہے-----------------------

03225494228

03481648941

شاعری پیغام

سہیلی ستارہ آمین کومل اور کبری نوید کے نام

بہت پیاری سہیلی ہے

سدا ہنسنے ہنسانے میں

یہ تو مشغول رہتی ہے

یہ زندہ دل نشانی ہے

وفا کی ترجمانی ہے

دلوں پہ راجدھانی ہے

یہ رب کی مہربانی ہے

بہت پیاری سہیلی ہے

زباں محوِ دعا ہے

بارگاہِ اقدس میں

کہ پوری ہو ہر سدا

رہے یہ آباد وشادماں

شاعرہ: آبروِ نبیلہ اقبال

☆☆☆☆☆☆

میری پیاری دوست ہنیہ ضا کے لیے ایک پیغام'

زندگی کی راہوں میں

کچھ مقام آتے ہیں

لوگ روٹھ جاتے ہیں

ساتھ چھوٹ جاتے ہیں

زندگی کے سب ہی پل

بے مراد لگتے ہیں

دن اداس لگتے ہیں

چار سو اندھیرا جب

خوب بڑھنے لگتا ہے

اور دل یہ کرتا ہے

زندگی کے یہ لمحے
اب تمام ہو جائیں
بہت جی لئے ہیں ہم
اب سکوں سے سو جائیں
تب کہیں سے اک تارا
نور کا ابھرتا ہے
مضطرب سے اس دل کو
پھر گماں گزرتا ہے
جس نے زندگی دی ہے
جس نے غم، خوشی دی ہے
اس کے لطف سے بڑھ کے
غم کیا ہم نے پائے ہیں؟؟؟
گردش زمانہ سے
پھر کیوں تنگ آئے ہیں؟

زندگی کی راہوں میں
شکر کی جو منزل کا
راستہ ملے تم کو
اس پہ مطمئن ہو کے
تم قدم بڑھاؤ تو
زندگی کا ہر لمحہ
رب کے نام کر ڈالو

نور بخاری کی طرف سے۔۔۔

ریحانہ اعجاز

آدمی غصے سے بولا "ارے نالائقوں! کبھی تو گھی کے بغیر بھی کھالیا کرو

" ختم شد

از قلم مریم عمران خان

ایک پاگل نے اپنے پاگل ساتھی سے کہا" اگر تم یہ بتاؤ کہ میری جھولی میں کیا ہے تو یہ انڈے تمھارے

،اگر یہ بتاؤ کہ کتنے انڈے ہیں تو بارہ کے بارہ تمھارے اور اگر یہ بھی بتادو کہ کس پرندے کے ہیں

تو وہ مرغی بھی تمہاری ھو جائے گی. "

دوسرا پاگل بولا" نہی بھئ نہی، کوئی آسان سا اشارہ تو دے دو۔"

ختم شد

طیفہ از قلم ملکہ عمران خان

ایک آدمی بہت کنجوس تھا، وہ جب اپنے بچوں کو روٹی دیتا تو گھی کے بند ڈبے پر پھیر کر دیتا.

ایک دفع وہ شہر سے باہر گیا تو گھی کا ڈبہ الماری میں بند کر گیا. واپس آیا تو بچوں سے پوچھا. "تم نے روٹی کیسے کھائی"

بچوں نے کہا" الماری پر رگڑ کر"

لطیفہ از قلم ہاجرہ عمران خان

،بیوی،، آج کھانے میں کیا بناؤں؟؟

شوہر،، کچھ بھی بنالو

بیوی،،، جو تم کہو

شوہر،، چائنیز رائس بنالو

بیوی،، پرسوں ھی تو کھائے تھے

شوہر،، ساگ بنالو

بیوی،،ببلو نہی کھائے گا

شوہر،، آلو کے پراٹھے بنالو

بیوی،،پہلے ھی اتناویٹ پٹ اون کر رہے ھو

شوہر،،پلاؤبنالو، جلدی بن جائے گا

شوہر،، چکن فریز ہے

شوہر،، "کڑی چاول بنالو"

بیوی،،دھی نہی ہے

"شوہر،،پھر کیابناؤ گی؟؟"

بیوی،، "جو تم کہو ڈیر"

ترکی بہ ترکی

ایک امریکی باپ نے نہایت درد بھرے لہجے میں اپنے نوعمر سرکش بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"بیٹا!اپنے اندر احساس ذمہ داری پیدا کرنے کی کوشش کرو میں اور تمہاری مماہمیشہ تو تمہاری رہنمائی کے لئے دنیا میں نہیں بیٹھے رہیں گے زرا سوچو کہ اگر آج میں اچانک مر جاؤں تو تم کہاں ہو گے؟،،

بیٹے نے موسیقی کی دھن پر تھرکتے ہوئے جواب دیا

"اگر آپ اچانک مر جائیں تو فکر کرنے کی ضرورت مجھے نہیں آپکو ہو گی ذراسوچیں، آپ کہاں ھوں گے.

ثناء شہزاد

شادی کیلیئے ایساانسان ڈھونڈنا چاہیئے جو دل کی بات ایسے سمجھ لے جیسے میڈیکل اسٹور والے ڈاکٹر کی رائٹنگ دیکھ کر سمجھ جاتے ہیں۔

انمول عائشہ صدیقی

پاگل خانہ

مینٹل اسپتال کے کمرے میں سب پاگل ڈانس کر رہے تھے.

بس ایک پاگل چُپ تھا ڈاکٹر سمجھا وہ ٹھیک ہو گیا.

ڈاکٹر نے پاگل سے پوچھا تم ڈانس کیوں نہیں کر رہے؟

پاگل بولا: بیوقوف میں "دلہا" ہوں.

ارشد قمر

فیصل آباد

ایک مسجد میں نماز کے بعد ۲ آدمی ایک خان صاحب کے بارے میں بات کر رہے تھے. جو کہ وہیں صحن میں نفلین ادا کر رہے تھے. ایک آدمی نے کہا کہ خان صاحب محلے کے سب سے شریف آدمی ہیں. خود بھی تعلیم یافتہ ہیں اور بچوں کو بھی اچھی تعلیم دلائی ہے. دوسرے نے کہا کے نہ صرف تعلیم بلکے تربیت بھی بہت اچھی کی ہے. محلے کے سب بچوں سے زیادہ شریف اور مہذب بچے ہیں خان صاحب کے.. پہلے آدمی نے کہا خان صاحب اپنی بات کے بہت پکے ہیں اور جو وعدہ کرتے ہیں اسے پورا کرتے ہیں. دوسرے نے کہا کے پنج وقتہ نمازی اور پرہیز گار ہیں. شاید ہی کوئی روزہ اور نماز ان سے چوٹی ہو. صوم و صلواۃ کے انتہائی پابند ہیں.. "حاجی بھی تو ہوں" خان صاحب نماز کے دوران ہی بول پڑے...

ارشد قمر

فیصل آباد

تاثیر مسیحائی کی

آپریشن ٹیبل پر مریض کو دیکھتے ہوئے سنیئر سرجن نے نئے سرجن سے کہا

آپ نے یہ کیا آپریشن کیا ہے

نئے سرجن نے چونک کر جواب دیا

کیا اسکا آپریشن کرنا تھا میں نے تو اسکا پوسٹ مارٹم کر دیا

شمائلہ زاہد کراچی

ایک مینڈک نے قسمت کا حال جاننے والا کمپیوٹر کا بٹن دبایا.. جواب آیا کہ عنقریب تمہاری ملاقات ایک نوجوان اور حسین لڑکی سے ہو گی جو تمہارے بارے میں سب کچھ جاننے کی خواہش مند ہو گی

مینڈک نے خوشی سے بے تاب ہو کر کمپیوٹر میں زو فیڈ کیا. ہماری ملاقات کہاں ہو گی, کس باغ میں, جھیل پر نہر پر یا کس تلاب کے کنارے پر ؟

یا کسی پارٹی میں ؟

کمپیوٹر سے جواب آیا: میڈ کل کالج کی لیبارٹری میں آپریشن ٹیبل پر !

خدیجہ کشمیری

سرجیکل اسٹرائیک

جج. قتل کس نے کیا.

ملزم. میں نے قتل کیا.

جج. لاش کھاں ھے ؟

ملزم. لاش میں نے جلادی

جج. وہ جگہ دکھاؤ جھاں لاش جلائی تھی ??

ملزم. میں نے وہ ساری زمیں کھود دی..

جج. تو کھودی ھو مٹی کدھر ھیں ؟

ملزم.. اس کی میں نے اینٹ بنادی..

جج. تو اینٹ دکھاؤ ??

ملزم.. میں نے اس سے مکان بنالیا..

جج. وہ مکان کدھر ھے ??

ملزم زلزلے میں گر گیا..

جج. تو ملبہ کدھر ہے؟؟

ملزم.. وہ میں نے بیچ دیا.

جج. کس کو بیچا؟؟

ملزم. پڑوسی کو.

جج. پڑوسی کو بلاؤ؟؟

ملزم. وہ مارا گیا..

جج.. کس نے مارا؟؟

ملزم. میں نے مارا

جج. تو لاش کدھر ہے؟؟

ملزم. لاش میں نے جلادی..

جج.. ابے الو کے پٹھے!! تو نے قتل کیا ہے یا سر جیکل اسٹرائیک؟؟ قتل کو قبول بھی کیے جا رہا ہے اور کوئی ثبوت بھی نہیں دے رہا..

ملائکہ خان

تنقید

"تم نے تخلیق کے نام پر ایک سطر نہ لکھی، نہ کوئی شعر پھر تمہیں نامور ادیبوں کی تحریروں پر تنقید کرنے کا کیا حق ہے؟"

ایک ابھرتے ہوئے مصنف نے ناقد پر قدرے برہم ہوتے ہوئے کہا.

"تنقید کرنے کے لئے ادیب یا شاعر ہونا ضروری نہیں" ناقد نے اطمینان سے کہا "انڈا مرغی تخلیق کرتی ہے. میں قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ آپ نے کبھی انڈا نہیں دیا ہو گا. لیکن آپ یقیناً انڈے کے بارے میں مرغی سے زیادہ جانتے ہیں."

سارہ انعم..... چکوال

خوبیاں

مالک مکان خریدار سے میرے مکان کے ایک طرف ربڑ کا کارخانہ ہے... دوسری طرف مچھلی گھر ہے.. سامنے کی طرف چمڑے کا کارخانہ ہے.. پچھلی طرف مرغی خانہ ہے.."

خریدار:-"لیکن اپنے کی خوبی تو بتایئے؟"

مالک مکان:"آپ کو ہمشیہ ہوا کا رُخ کا معلوم ہوتا رہے گا"-

آمنہ رشید... پیر محل

مشہور

"پندرہ برس تک تصنیف و تالیف کرنے کے بعد مجھ پر یہ عقدکھلا کہ مجھ میں تو لکھنے کی صلاحیت ھی نہی ھے. لیکن اب میں مجبور ھوں....... کیوں کہ میں اب مشہور ھو چکا ھوں.

بنت رحمان چکوال

پہلے لوگ پیار میں پاگل ہو جاتے تھے ،، پھر لوگ پیار کے معاملے میں اندھے ہونے لگے ،،، اور اب تو توتلے ہو جاتے ہیں ، ہر وقت میلا شونا ، میلا پالا

حمادظفر ہادی, منڈی بہاؤ الدین

.1آئی فون

لڑکا ، جان میں تمہیں کیا گفٹ کروں محبت میں ، لڑکی ، جان مجھے آئی فون چاہئے ،

لڑکا ، سوری جان میں محبت میں دل دے سکتا ہوں ، گردہ نہیں

،حمادظفر ہادی, منڈی بہاؤ الدین

مبارک ہو

مبارک ہو

مبارک ہو

سالانہ بمعہ ڈاک خرچ :

-/1200

چھ ماہ بمعہ ڈاک خرچ :

-/600

تین ماہ :

-/300

داستان دل اپریل سے کتابی شکل میں شائع ہو رہا ہے

اب آپ داستان دل اپنے گھر، ہوسٹل ، آفس، کالج کے ساتھ ساتھ دنیا کے کسی بھی کونے میں حاصل کر سکتے ہیں، تو ابھی اپنا نام ممبر شپ میں فائنل کروائیں

(ممبر شپ 03225494228 اس نمبر پر موبی کیش اکاونٹ میں جمع کروا کہ اپنا ایڈریس اسی نمبر پر واٹس اپ یا مسیج میں سینڈ کریں)

مزید معلومات کے لیے: 03225494228 واٹس اپ / موبائل نمبر

معلومات ممبر شپ: